حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ کے

تین اہم مواعظ

جلاء القلوب یعنی جام جمشید

رجاء الغیوب یعنی صبح امید

دواء العیوب یعنی شام خورشید

اشاعت حسب ہدایت

نمونۂ سلف صالحین حضرت محمد عشرت علی خان قیصر صاحب دامت برکاتہم

ادارۂ اسلامیات کراچی لاہور

پہلی بار۔ جمادی الثانیہ ۱۴۲۴ھ، اگست ۲۰۰۳ء۔
باہتمام۔ اشرف برادرن سلمہم الرحمان
ناشر: ادارہ اسلامیات کراچی لاہور

پبلشرز بک سیلرز ایکسپورٹرز

☆ ادارہ اسلامیات موہن روڈ، چوک اردو بازار کراچی فون ۷۷۲۲۴۰۱
☆ ادارہ اسلامیات ۱۹۰، انارکلی، لاہور۔ پاکستان فون ۷۵۳۲۵۵
☆ ادارہ اسلامیات دینا ناتھ منشن مال روڈ، لاہور فون ۷۳۲۴۴۱۲

ملنے کے پتے:۔

ادارۃ المعارف	:	ڈاک خانہ دار العلوم کراچی ۱۴
مکتبہ دار العلوم	:	جامعہ دار العلوم کراچی ۱۴
دار الاشاعت	:	ایم اے جناح روڈ کراچی نمبر ا
بیت القرآن	:	اردو بازار کراچی نمبر ا
بیت الکتب	:	نزد اشرف المدارس گلشن اقبال بلاک نمبر ۲ کراچی۔
بیت العلوم	:	۲۶ نابھہ روڈ لاہور
ادارہ تالیفات اشرفیہ	:	بیرون بوہڑ گیٹ ملتان شہر
ادارہ تالیفات اشرفیہ	:	جامع مسجد تھانیوالی ہارون آباد بہاولنگر

ترتیب

تفصیلی فہرست	ص	۴ تا ۱۱
عرضِ ناشر	ص	۱۳
پیشِ لفظ از حضرت محمد عشرت علی قیصر صاحب دامت برکاتہم	ص	۱۵ تا ۱۹
وعظ جلاءُ القلوب = جامِ جمشید	ص	۲۱ تا ۱۲۵
اختتامی سطور از مولانا حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری رحمۃ اللہ علیہ	ص	۱۲۶
وعظ رجاءُ الغیوب = صبحِ امید	ص	۱۲۹ تا ۲۰۶
وعظ دواءُ العیوب = شامِ خورشید	ص	۲۰۷ تا ۲۵۹

ترتیب ۳
فہرست ۴
عرض ناشر و مرتب۔ محمود اشرف عثمانی ۱۳
پیش لفظ۔ حضرت محمد عشرت علی خان قیصر دامت برکاتہم ۱۵

جلاء القلوب معروف بہ جام جمشید ۲۱

دعاء، خطبہ ۲۳
قرآن سے فائدہ حاصل کرنے کی شرط ۲۳
بڑے اور چھوٹے کے درمیان تعلق کی اقسام ۲۳
ضابطہ اور شفقت کے تعلق میں فرق ۲۴
اللہ تعالیٰ کا بندوں سے شفقت کا تعلق ہے ۲۵
اللہ تعالیٰ کی شفقت انتہاء درجہ کی ہے ۲۵
قرآن مجید میں تکرار عین حکمت ہے ۲۶
کامل شفقت کیا ہے؟ ۲۶
نفع شفقت کے تعلق سے ہوتا ہے ۲۷
قرآن مجید میں قصے ذکر کرنے کا مقصد ۲۷
ناولوں کا دیکھنا نقصان دہ ہے ۲۸
ناولوں کو مثنوی پر قیاس نہیں کر سکتے ۲۹
قرآن مجید میں ''فرعون'' کا لفظ اور اس پر اعتراض و جواب ۲۹
آج کل کی طبائع لہو و لعب کی طرف زیادہ مائل ہیں ۳۰
الہ آباد کا ایک واقعہ ۳۱
نفع شرائط کے پائے جانے پر ہوتا ہے ۳۱
قرآن پڑھنے کا اثر کیوں نہیں ہوتا ۳۳
تلاوت قرآن کو بے کار سمجھنا غلط ہے ۳۴
قرآن سے لگاؤ نہ رہنے کا مطلب ۳۴
دین کا ہر جزو قرآن میں داخل ہے ۳۵
قرآن مجید کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک ۳۶
وضاحت بذریعہ واقعہ ۳۷
قرآن سے فال نکالنے کا دھندا ۳۸
قرآن کو چادر میں رکھ کر نیچے سے بچہ گذارنے کی رسم ۳۹
قرآن سے تعویذ گنڈے ۳۹
قرآن کیوں نازل ہوا ۴۰
آیات قرآنی سے تعویذ دینے کا حکم ۴۰
تعویذ دینے میں میرا طرز عمل ۴۱
گناہ کے علم نہ ہونے کا عذر معتبر نہیں ۴۱
ایک خطرناک غلط فہمی ۴۲
غلط فہمی کی وجہ اور اس کا جواب ۴۲
اعمال مکمل طور پر ہماری قدرت میں نہیں ۴۳
حقوق اللہ کا مطلب ۴۴
بعض اعمال کو حق اللہ کہنے کی خاص وجہ ۴۵
لغت اور محاورہ میں فرق ۴۶
دل کی دو خاص صفتیں ۴۸
ہر فن میں اسی فن کے اعتبار سے گفتگو ہوتی ہے ۴۸
اعلیٰ کی موجودگی میں ادنیٰ معدوم ہوتا ہے ۴۹
علم دین کے مقابلے میں باقی علوم معدوم ہیں ۵۰
علوم دنیا کو علم نہ کہو ۵۰
علوم دنیا کو علم کہنے کا نقصان ۵۱
حدیث: ''علم حاصل کرو اگرچہ چین میں ملے'' کا صحیح مطلب ۵۱
ایک اشکال اور اس کا جواب ۵۲

دنیاوی علوم پڑھنے کا حکم ۵۲
عزم کسے کہتے ہیں؟ ۵۳
قرآن سے نفع حاصل کرنے کے لئے دو شرطیں ۵۳
مختصر دستور العمل کا فائدہ ۵۴
دین خود جوہر ہے ۵۵
تحلیل زائد چیزوں میں ہوتی ہے اصل میں نہیں ۵۶
مکرر افعال زائد نہیں ۵۶
مکرر افعال میں بھی حکمت ہے۔ ۵۷
مستحبات بھی زائد ہیں ۵۷
احکام کے مختلف درجات کی حکمت
اور ہماری غلط فہمی ۵۸
مستحباب کی مثال ۵۸
ایک حدیث کے متعلق اشکال و جواب ۶۰
لا إلہ إلا اللہ ایک جامع عنوان ہے ۶۰
لا إلہ إلا اللہ کا خلاصہ ۶۱
اللہ تعالیٰ سے تعلق بہت لذیذ چیز ہے ۶۱
محبوب سے ملنے والی تکلیف میں بھی راحت ہے ۶۲
تعلق مع اللہ نصیب ہونے کا اثر ۶۳
اعرابی کی مثال ذکر کرنے کا مقصد ۶۳
گُر اور اس کے فائدے ۶۴
قرآن سے نفع حاصل کرنے کا گر ۶۴
اعمال میں کوتاہی کی وجہ ۶۵
ہمت کی اہمیت ذہنوں میں پیدا
کرنے کی ضرورت ۶۶
ہمت میں کمی کے نقصانات ۶۶
ضرورتوں کو بڑھانے کی وجہ سے غلط سوچ کا پیدا ہونا ۶۷
خرچ بڑھانے کی ضرورت ہی کیا ہے ۶۷
ناموری کے لئے شادی پر زیادہ خرچ
کرنے کی حقیقت ۶۸
غیر ضروری اخراجات کی حقیقت ۶۸
اخراجات میں کمی کرنے کی سخت ضرورت ہے ۶۹
نئے تعلیم یافتہ پرانی رسموں
سے کیوں منع کرتے ہیں ۷۰
علماء دین کے ذمہ دار ہیں دنیا کے؟ ۷۰
علماء نے اپنے ذمہ دین ہی کا کام کیوں لیا؟ ۷۱
علماء پر ایک غلط اعتراض اور اس کا جواب ۷۲
علماء پر اعتراضات کی وجہ ۷۳
دینی نقصان سے بچانے کے لئے علماء کی تدبیر ۷۳
تحمل پیدا کرنے کا طریقہ ۷۴
مسلمانوں کے پاس بقدر ضرورت
دین موجود نہیں ۷۶
دنیا کے ضروری درجے کی تعلیم خود
شریعت نے دی ہے ۷۶
مکان وقف کرنے سے منع کرنے کی حکمت ۷۷
حضرت حاجی صاحب اور حافظ
ضامن صاحب کا قصہ ۷۷
ایک اشکال اور اس کا جواب ۷۷
کیا دنیاوی ترقی کے لئے سود کو
حلال سمجھنا ضروری ہے ۷۸
حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے ۷۹
مولویوں سے ایسی نوکری نہیں ہوتی ۷۹
ربوا کا ایک غلط مطلب ۸۰

گناہوں سے بچنے کا طریقہ ۸۰
گناہوں کی قسمیں اور انہیں چھوڑنے کا طریقہ ۸۱
یہ ترک گناہ کی تعلیم ہے گناہ کی نہیں ۸۳
دنیا کی لذتوں کی حقیقت ۸۳
دین کی لذت کی حقیقت ۸۴
ہم دین کا چسکا لگانا چاہتے ہیں ۸۴
ملامت کے خوف سے ہی گناہ چھوڑ دو ۸۵
ہمارے گناہوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کا دل دکھتا ہے ۸۵
مرزا قتیل کا قصہ ۸۶
عاشق کی شان یہ ہے کہ ملامت سے نہ ڈرے ۸۶
مسلمانوں کو دنیا دار نہ کہو ۸۷
مولانا جامی کے سبق آموز اشعار ۸۸
ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے شدید محبت ہوتی ہے ۸۹
عاشق کی حالت کیا ہوتی ہے ۸۹
ملامت سے ہمت قوی ہوتی ہے ۹۲
علم سے متعلق کوتاہیاں ۹۳
اردو کی دینی کتب کسی عالم سے پڑھو ۹۳
مزید سہل تدبیر ۹۴
ہر ایک کی کتاب دیکھنا نقصان دہ ہے ۹۴
محقق بننے کا صحیح طریقہ ۹۵
بے علم مسلمانوں کا مناظرہ میں حصہ نقصان دہ ہے ۹۵
باریک مسئلہ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا ۹۶
غیر محقق کے لئے محقق کی اتباع ضروری ہے ۹۷
محقق کے ملنے کی دو صورتیں ۹۸
دوسری صورت ۹۹
محقق کے پاس رہنے سے غلط سوچ دور ہوگی ۱۰۰
محقق کے لئے صاحب کشف ہونا ضروری نہیں ۱۰۰
محقق سے کیا چیز حاصل کرنی ہے؟ ۱۰۱
محقق کے سامنے چوں وچراں نہ کرو ۱۰۱
محقق ملنے کے بعد دوسری طرف نظر نہ اٹھاؤ ۱۰۱
اگر کوئی کتاب دیکھنی ہو تو محقق سے اجازت لو ۱۰۲
محقق سے اپنا عیب مت چھپاؤ ۱۰۲
قزوینی کا سبق آموز قصہ ۱۰۳
اگر مصلح سے بحث ومباحثہ رہا تو فائدہ نہ ہوگا ۱۰۴
محقق مصلح ماں ہے شفقت میں باپ ہے عقل میں ۱۰۴
محقق نہ ملنے کی شکایت اور اس کا جواب ۱۰۵
آداب شیخ ۱۰۶
محقق تلاش کرنے کا طریقہ ۱۰۶
مصروف لوگوں کی اصلاح کا طریقہ ۱۰۷
عورتوں اور بچوں کی اصلاح کا طریقہ ۱۰۸
خلاصہ ۱۰۸
ہمت پیدا کرنے کا طریقہ ۱۰۹
وظیفوں سے ہمت کیوں پیدا نہیں ہوتی؟ ۱۱۰
ذکر کا درجہ ۱۱۰
جہالت کے وظیفے نقصان دہ ہیں ۱۱۱
کمال اتباع شریعت کا نام ہے ۱۱۲
محقق کی صحبت کا خاص فائدہ ۱۰۱
رضا حاصل نہ ہونے کی صورتیں ۱۱۳
محقق قرب ۱۱۳
اعمال کی اصلاح میں صحبت کے اثرات ۱۱۴
صحبت کے ضروری ہونے کی دلیل ۱۱۵

توجہ کے متعلق ایک غلط فہمی ۱۱۵
توجہ کی حقیقت ۱۱۶
ایک شبہ اور اس کا جواب ۱۱۶
آیت میں تکرار کا شبہ اور اس کا جواب ۱۱۷
ایک منطقی شبہ اور اس کا جواب ۱۱۸
صرف قلب سلیم کو فائدہ ہوگا ۱۱۹
سبق آموز حکایت ۱۲۰
غم و پریشانی کب ہوتی ہے ۱۲۱
جس کا مقصود اللہ ہو اسے کوئی غم نہیں ۱۲۱
قلب سلیم بلا تکلف خیر و شر کو پہچان لیتا ہے ۱۲۲
نفس شیطان سے بھی بڑا دشمن ہے ۱۲۴
بیان کا عنوان اور اس کی وجہ تسمیہ ۱۲۵
اختتامی سطور از مولانا حکیم محمد مصطفیٰ بنجوری رحمۃ اللہ علیہ ۱۲۶
معذرت ۱۲۶
رجاء الغیوب معروف بہ **صبح امید ۱۲۹**
خطبہ ماثورہ ۱۳۱
مضمون آیت کی اہمیت ۱۳۱
آخرت کی کامیابی کی امید کب رکھنی چاہئے ۱۳۲
امید کے معنی میں ایک غلطی ۱۳۳
امید کے صحیح طریق کی عقلی دلیل ۱۳۳
جس درجہ کا مقصود ہو ویسی ہی کوشش ہونی چاہئے ۱۳۵
ایک ڈپٹی اور درویش کی حکایت ۱۳۵
طفیلی شاعر کی حکایت ۱۳۷
بعض دیندار حضرات کی ایک غلطی ۱۳۸
لوگ کہتے ہیں کہ شیخ کامل نہیں ملتا ۱۳۹
مصنوعی شیوخ کی ڈانٹ ڈپٹ کا انداز ۱۴۰
مصنوعی شیخ اور واقعی شیخ کو پہچاننے کا طریقہ ۱۴۰
جائز کاموں میں ترتیب بھی ضروری ہے ۱۴۱
شیخ کو تلاش کرنے کی شرعی دلیل ۱۴۳
شیخ کی تلاش کا آسان طریقہ ۱۴۳
خواص کی ایک بیجا شکایت اور اس کا جواب ۱۴۴
طالب کیلئے کیفیات کی طلب خطرناک ہے ۱۴۴
ایک اور غلطی ۱۴۶
آخرت کیلئے کوشش دنیا کی سی نہیں کی جاتی ۱۴۸
امید کے صحیح معنی ۱۴۸
امید کے معنی میں نفس کا دھوکہ ۱۴۹
ایک طلب علم کی بوالہوسی کا قصہ ۱۴۹
زیادہ تدبیر سے آدمی کو تدبیر پر بھروسہ ہو جاتا ہے ۱۵۰
کسی فعل پر نتیجہ مترتب ہونے سے اس فعل کی نسبت اپنی طرف کرنا صحیح نہیں ۱۵۰
ارادہ کے بعد کسی چیز کا ذہن میں آجانا اختیاری نہیں ۱۵۲

کھیت کا تیار ہونا یا پانی کا برسنا ہمارے اختیار میں نہیں ۱۵۱
اعمال کے غیر اختیاری ہونے کی مثال ۱۵۴
اعمال اور نتیجہ کی مثال
امید کے معنی میں غلطی ۱۵۵
عمل پر اجرِ آخرت مترتب نہ
ہونے کی وضاحت ۱۵۶
امید کی صحیح حقیقت ۱۵۷
نوافل کی فضیلت اور ترغیب ۱۵۸
اہلِ علم کی نفل کے بارہ میں غلطی ۱۵۸
کثرتِ نوافل علامتِ محبت ہے ۱۵۹
نوافل میں سب سے افضل
تلاوت قرآن ہے ۱۵۹
حفاظ اور قراء کی فضیلت ۱۶۰
تلاوت قرآن حق تعالی سے
ہمکلامی ہے ۱۶۰
اٹک اٹک کر پڑھنے میں دوگنے
ثواب کا وعدہ ہے ۱۶۱
اسکا جواب کہ بچوں کو طوطے کی
طرح قرآن رٹوانے سے کیا فائدہ؟ ۱۶۱
اہل درد کیلئے دوسرا جواب ۱۶۲
ایک اہلکار نمازی کا قصہ ۱۶۳
سودا شاعر اور ان کی بیوی کا قصہ ۱۶۴
تلاوتِ قرآن کا ثواب ۱۶۵
دنیا کا سکہ اموال ہیں اور آخرت
کا سکہ اعمال ۱۶۶
بعض لوگ قرآن کی تعلیم بالکل
اڑانا چاہتے ہیں ۱۶۷
غلط ترجمے پڑھنا بڑا گناہ ہے ۱۶۹
علم دین کوئی کھیل نہیں ہے ۱۶۹
اس کا جواب کہ سود کیوں حرام ہے ۱۷۰
ایک شخص نے ربوا کو ربودن
سے مشتق کیا ۱۷۱
ایک شخص کی صدقۂ فطر میں
ترمیم کی رائے ۱۷۱
دین کا محافظ اللہ تعالی ہے ۱۷۲
مولوی کس کو کہتے ہیں ۱۷۲
ترجمہ پڑھنے سے بے ترجمہ
قرآن پڑھنا اچھا ہے ۱۷۲
علم دین کیلئے سب سے نکما بچہ دیا جاتا ہے ۱۷۳
بالکل نکمے کو امام اور مؤذن بنایا جاتا ہے ۱۷۴
امامت وکالتِ خداوندی ہے ۱۷۵
بیماری اور مصیبت میں مؤذن
یا امام کی پوچھ ہوتی ہے ۱۷۵
خدا تعالی کے نام اعلی درجہ
کی شئے دینی چاہیے ۱۷۶
غزالی اور رازی اب بھی
پیدا ہوتے ہیں ۱۷۶
مولوی بیوقوف نہیں ہوتے
بلکہ بیوقوف مولوی بن جاتے ہیں ۱۷۶
علم سے حوصلہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ
بڑھ جاتا ہے ۱۷۷
ایک رئیس تارکِ جماعت کی حکایت ۱۷۸

مولویوں کے تنگ خیال ہونے میں کس کا قصور ۱۷۸
طالب علم کے ساتھ کیسا برتاؤ چاہئے ۱۷۹
ہر قوم مذہبی جماعت کی خدمت کرتی ہے ۱۸۲
بھانڈوں کے ہاتھی کا قصہ ۱۸۲
علماء کو چاہئے کہ سوال نہ کریں ۱۸۳
اہل علم کو سوال کرنے سے مرنا بہتر ہے ۱۸۴
خلوص کے ساتھ کام کرنے میں فاقہ کی نوبت نہیں آئے گی ۱۸۴
امراء کو چندہ جمع کرنا چاہئے نہ کہ علماء کو ۱۸۵
بھک منگوں کا نام مولوی ہو گیا ہے ۱۸۵
ہر شخص کا وعظ نہ سننا چاہئے ۱۸۶
پیرزادوں کے ساتھ برتاؤ ۱۸۶
علماء دین کی خدمت کریں اور اہل دنیا علماء کی ۱۸۷
ہدایا لینے میں حضرت والا کا طرز عمل ۱۸۷
جلسوں میں شکریہ کرنے کی بدرسم ۱۸۷
شرکائے جلسہ کو علماء کا شکریہ ادا کرنا چاہئے ۱۸۹
ہدیہ کے عام اصول ۱۸۹
ہدیہ لینے میں بنسبت غرباء کے امراء زیادہ قابل رحم ہیں ۱۹۰
ہدیہ کے متعلق عقلی التزامات ۱۹۰
بلگرام کے ایک بزرگ کا قصہ ۱۹۱
عقل اہل اللہ ہی میں منحصر ہے ۱۹۲
عربی خواں اور انگریزی خواں کا سوال وجواب ۱۹۲
اگر علماء حق تعالیٰ کا کام کریں گے تو کیا حق تعالیٰ ان کو بھول جائیں گے؟ ۱۹۳
تکبر اور استغناء میں فرق ۱۹۴
استغناء کی حقیقت اختیار کرنی چاہئے ۱۹۴
باوجود کوتاہیوں کے علم کا اثر ہوتا ہی ہے ۱۹۵
علماء اپنا کام کریں اور قوم اپنا کام کرے ۱۹۵
تلاوتِ قرآن کی اہمیت اور امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ ۱۹۶
قرآن سے روکنا شیطانی مکر ہے ۱۹۶
قرآن غلط پڑھنے سے گناہ کب ہوتا ہے ۱۹۷
عورتوں میں تلاوتِ قرآن بالکل متروک ہے ۱۹۸
دلہن کا قرنطینہ اور دلہن کی کیا گت بنتی ہے ۱۹۸
تمام عمر گزر گئی مگر تلاوت نصیب نہ ہوئی ۱۹۹
عورتوں کو زیور کا شوق اور اس کی حکایت ۱۹۹

عورتوں سے نماز وتلاوت کرانے کی ایک تدبیر ۲۰۰
نری نماز کا حکم نہیں بلکہ درست
کرنے کا بھی حکم ہے ۲۰۱
آیت تمام کار خیر کو شامل ہے،
مالی ہوں یا بدنی ۲۰۲
اعمالِ آخرت کو تجارت کہنے کی وجہ ۲۰۲
شبہ کہ نیکیوں کے ساتھ گناہ
بھی ہوتے ہیں تو جنت کیسے ملے گی؟ ۲۰۳
نری امید کا کہیں حکم نہیں ہے ۲۰۴
لب لباب وعظ ہذا:۔ ۲۰۵

دواء العیوب معروف بہ شام خورشید ۲۰۷

خطبہ ماثورہ ۲۰۹
مضمون آیت ۲۰۹
دوبارہ زندگی دینے سے
اصلاح کی امید فضول ہے ۲۰۹
ملامت بھی خوف کی چیز ہے ۲۱۱
غیر اختیاری چیز پر گناہ کرنا
بڑی غلطی ہے ۲۱۲
انسان کا زندہ رہنا تعجب کی بات
ہے نہ کہ مرنا ۲۱۳
فعل محتمل الضرر کو اختیار کرنا
ہلاکت میں پڑنا ہے ۲۱۵
عادت کے اختیاری نہ ہونے کی
بدیہی مثال ۲۱۷
محتمل بات پر کسی کام کی بنا غلطی ہے ۲۱۹
عمر تھوڑی ہے مگر نفس اس کو لمبی
دکھلاتا ہے ۲۲۰
نقصان دہ چیز میں احتمال بھی
کافی ہے جیسے چوری سے
پہلے دروازہ بند کرنا ۲۲۲
نفس بڑھاپے کو بھی ممتد بتاتا ہے ۲۲۵
آج کا کام کل پر ٹالنے والے
کو کبھی راحت نہیں ۲۲۶
کفار کو خطاب مسلمانوں کی
عبرت کیلئے ۲۲۶
بعض غیر واقعی باتیں بضرورت مان
لی جاتی ہیں جیسے اکثر قواعد صرف ونحو ۲۲۷
نفس کو عمل پر آمادہ کرنے کا
ایک حیلہ ۲۲۹
امور دنیا تین طرح کے ہیں
ضروی اور آسائش وآرائش ۲۳۱
شریعت بہت وسیع قانون ہے ۲۳۲
جنازہ سامنے اور خوف نہیں ۲۳۵
جنازہ سے دنیا کی اور آخرت کی
عبرت پکڑنی چاہئے ۲۳۶
جنازے سے دینی عبرت ۲۳۶
زندگی سے محبت کی حالت ۲۳۹
قصہ حضرت جنیدؒ ۲۴۰
بڈھوں کا یہ لفظ کہ ہم چراغ صحری
ہیں صرف زبان ہی پر ہے ۲۴۰
موت کی فکر کسی کام سے مانع نہیں ۲۴۱

دنیا سے قطعِ تعلقی اور تحصیلِ معاش متضاد نہیں ۲۴۲
فکرِ موت کے نتائج ۲۴۲
موت کی فکر گناہوں کی تقلیل ہوگی یا ترک ہوگا اور مباحات میں تقلیل ۲۴۳
زیادہ سامان کرنا دھوم دھڑ کے کرنا بے فکری کی دلیل ہے ۲۴۴
ترکِ گناہ اور تقلیلِ مباح کی عادت چاہئے ۲۴۴
گناہوں کو بتدریج چھوڑنے کی مثال ۲۴۵
گناہ چھوڑنے کا طریقہ ۲۴۶
غیبت اور شیخی کے چھوڑنے میں کون سی تکلیف ہے ۲۴۷
ہر شخص کو سرہانے نہ بٹھانا چاہئے ۲۴۷
حفظ مراتب رہنے سے انتظام میں خلل نہیں پڑتا؟ ۲۴۸
شیخی عورتوں کی سرشت میں داخل ہے ۲۴۸
عورتوں کی شیخی مٹانے کا ایک علاج ۲۴۹
ایک حکایت ۲۵۰
دین دار تعلیم یافتہ عورتوں میں بھی شیخی کا مرض ہے ۲۵۱
شادی بیاہ کی رسوم کی بنا تفاخر پر ہے ۲۵۲
شیطان کے شیرہ کا قصہ ۲۵۲
عورتوں کو رسوم نہ کرنا آسان ہے ۲۵۳
شادی وغیرہ میں پردہ ہی ندارد ہو جاتا ہے ۲۵۴
بہشتی کا گھر میں منہ پر کپڑا ڈال کر آنا ۲۵۴
تقریبات میں ظاہری مفاسد بھی ہیں اور باطنی بھی ۲۵۴
دین سے تعلق گہرا ہونا چاہئے ۲۵۵
دنیا کے کاموں میں اختصار ہونا چاہئے ۲۵۶
خلاصۂ وعظ ۲۵۷
مراقبۂ موت ۲۵۷
اشعار ۲۵۸
التماس از جامع (حکیم محمد مصطفیٰ صاحبؒ) ۲۵۹

طریقِ عشق کا گُر

طریقِ عشق جو ہیں سب کا خلاصہ اے دل
بس یہ ہے دوست سے غافل نہ کسی آن رہے

اس کا اِک گُر تجھے تلقین کیے دیتا ہوں
ذکر اور فکر رہے، دُھن رہے اور دھیان رہے

(خواجہ مجذوبؒ)

از: محمود اشرف عثمانی

عرضِ مرتب

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم سیدنا محمد و آلہ وصحبہ اجمعین ۔ امابعد:۔

اس ناچیز اور ادارہ اسلامیات کے لئے بڑی سعادت کی بات ہے کہ حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز کے ''تین اہم مواعظ'' کی طباعت واشاعت میں ہمیں حصہ لینے کا شرف حاصل ہو رہا ہے۔ اس سعادت اور خوش نصیبی کی کئی وجوہات ہیں:۔

پہلی وجہ یہ کہ یہ حضرت تھانوی قدس سرہ کے وعظ ہیں، جنہیں بجا طور پر ''حکیم الامت مجدد الملت'' کے لقب سے یاد کیا جاتا ہے ان کے مواعظ کی علمی اور دینی حیثیت علماء کے درمیان، اور دلوں پر ان کی تاثیر اہل دل اور اہل تصوف کے نزدیک مسلّم ہے۔ ۱۳۲۰ھ سے اب تک ۱۴۲۴ھ کی صدی کے دوران شاید ہی کسی عالم کے مواعظ نے وہ علمی اور اصلاحی انقلاب برپا کیا ہو جو حضرت تھانویؒ کے مواعظ سے پیدا ہوا، اور شاید ہی اس دور میں کسی کے مواعظ اس طرح تاریخ اور وقت کے تعین کے ساتھ ضبط کر کے شائع کئے گئے ہوں جس طرح حضرت تھانویؒ کے مواعظ کی اشاعت ہوئی ہے۔ بلا مبالغہ لاکھوں کی تعداد میں یہ شائع ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ لہٰذا ان مواعظ کی اشاعت میں ادنیٰ حصہ لینا بھی ہم ایسوں کے لئے بڑی سعادت ہے۔

دوسری وجہ یہ کہ تین اہم مواعظ کا جو مجموعہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے اس مجموعہ کی اشاعت وطباعت کی تمنا خود حضرت تھانوی قدس سرہ نے ۱۳۳۴ھ میں ظاہر فرمائی تھی، مگر نوے سال بعد تک اس مجموعہ کی اشاعت مقدر نہ ہو سکی۔ الحمد للہ تعالیٰ کہ اب حضرت قدس سرہ کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی سعادت میں احقر کو بھی شریک ہونے کا موقعہ ملا۔ فللّٰہ الحمد۔

تیسری وجہ یہ کہ احقر کے مربی و مرشد و محسن حضرت نواب محمد عشرت علی قیصر صاحب

مدظلہم و دامت برکاتہم العالیہ جو اس مجموعہ کی اشاعت کے اصل محرّک ہیں ان کی خواہش تھی کہ یہ مجموعہ جلد اشاعت پذیر ہو۔ حضرت والا مدظلہم کی اس خواہش کو عملی جامہ پہنانے کے لئے خدام کی کمی نہ تھی مگر الحمد للہ کہ حضرت دامت برکاتہم نے احقر کی درخواست کو قبول کر کے نہ صرف یہ کہ مسودہ احقر کو عنایت فرمایا بلکہ اس پر پیش لفظ بھی تحریر فرما کر احقر کو مزید سعادتوں سے بہرہ ور فرمایا۔

حضرت مدظلہم کے حکم سے اس ناچیز نے ان تینوں مواعظ پر مختصر حاشیہ تحریر کیا ہے، جس میں مشکل یا نامانوس الفاظ کے معنی اور مفہوم تحریر کر دیئے ہیں اور مضمون کے درمیان مناسب عنوانات بھی لگا دیئے ہیں، اللہ کرے یہ حاشیہ اور عنوانات درست ہوں اور مفید ثابت ہوں، اس کام میں مولانا اعجاز احمد صمدانی سلمہ نے بھی احقر کی مدد کی جس کے لئے احقر ان کا شکر گذار ہے۔

اس مجموعہ کی اشاعت وطباعت بلاشبہ حضرت اقدس محمد عشرت علی خان قیصر مدظلہم العالی کی توجہ فرمائی کا ایک مظہر ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس وقت کم از کم پاکستان میں حضرت مدظلہم کے بابرکت وجود مسعود کی کوئی دوسری نظیر احقر کے علم میں نہیں اور پاکستان میں اس وقت وہ ان چند گنی چنی شخصیات میں سے ہیں جنہیں براہ راست حضرت تھانوی قدس سرہ سے بیعت ہونے اور ان سے بلاواسطہ استفادہ کا شرف حاصل ہے، وہ حضرت تھانویؒ کے انتقال کے بعد حضرت تھانوی قدس سرہ کے خلفاء کی آنکھوں کا تارا رہے، ان سے ظاہرا وباطنا استفادہ کرتے رہے اور خلفاء میں سے کئی حضرات سے انہیں اجازت بیعت وخلافت کا شرف بھی حاصل ہے، اللہ تعالیٰ انہیں صحت وعافیت کے ساتھ ہمارے سروں پر قائم ودائم رکھیں۔ ان کے فیوض وبرکات سے ہمیں منور فرمائیں اور ہمیں ان کے اور ان کے مشائخ کرام اور شیخ المشائخ حضرت تھانوی قدس سرہ کے نقش قدم پر چلتے ہوئے اس کمال دین، تفقہ فی الدین، اور اعتدال مطلوب سے نوازے جو حضرت تھانویؒ کے سلسلے کی نمایاں خصوصیت ہے۔ آمین۔ وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین۔

احقر محمود اشرف غفر اللہ لہ

۲۱ / ربیع الثانی ۱۴۲۴ھ۔

۲۲ / جون ۲۰۰۳ء۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

پیشِ لفظ

از

حضرت اقدس محمد عشرت علی خان صاحب دامت برکاتہم

مجازِ بیعت

حضرت مولانا فقیر محمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت تھانویؒ)
وحضرت مولانا مسیح اللہ شروانی رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت تھانویؒ)

حکیم الامت، مجدد ملت، محی السنّت، جامع شریعت و طریقت، امام المصلحین، زبدۃ العارفین، جامع المجدّ دین، حضرت مولانا مقتدانا شاہ محمد اشرف علی صاحب تھانوی فاروقی حنفی چشتی صابری امدادی قدس سرہ، نور اللہ مرقدہ مدت ہوئی رحلت فرما گئے، لیکن بحمد للہ ان کا فیض آج بھی جاری ہے اور ان شاء اللہ صدیوں تک جاری رہیگا۔ حضرت والاؒ سے استفاضہ روحانی کا مؤثر ذریعہ بالخصوص اصلاح نفس کے باب میں ''مواعظ وملفوظات'' کا مطالعہ اور عمل کرنا ہے۔

حضرتؒ نے اپنے ایک سہ روزہ سفر میں تین وعظ تین مختلف مقامات واوقات میں ارشاد فرمائے ہیں۔ اس سلسلہ کے آخری وعظ ''شام خورشید'' کے اختتام پر فرمایا کہ:۔

''کاش یہ تینوں مواعظ ایک ساتھ ہی طبع ہوں''۔

حوالہ (ص ۱۱۸، جام جمشید، ناشر ادارہ اشرف التحقیق، دار العلوم اسلامیہ۔ لاہور)

لیکن حضرت کی یہ تمنا ہنوز پوری نہ ہوسکی۔ حضرت حکیم الامتؒ نے یہ سفر نواب جمشید علی خاں صاحب مرحوم کی درخواست پر کیا تھا (حوالہ مندرجہ بالا) نواب صاحب مرحوم بندہ کے پھوپھا تھے۔ ان سے نسبی تعلق اور حضرت والاؒ سے غلامی کی نسبت کے ناطے بندہ کے قلب پر وارد ہوا کہ ان مواعظ کو یکجا طبع کروانے کی سعادت حاصل کروں۔ حضرت مولانا مفتی محمود اشرف صاحب دامت برکاتہم سے ذکر کیا، انہوں نے اس کار خیر کو نہایت حسن وخوبی سے انجام دیا، اللہ تعالیٰ مولانا موصوف کو جزاء خیر عطا فرمائیں اور حضرت والا کے طریق کی اشاعت وترویج میں حریص بنائیں۔ آمین۔

ان مواعظ ثلاثہ کا سبب ایک خاص واقعہ ہے جو ''الافاضات الیومیہ'' میں درج ہے۔ وہ بعینہ نقل کیا جاتا ہے۔

''ایک مرتبہ نواب جمشید علی خان صاحب نے دوسو روپیہ زکوۃ کا مدرسہ میں بھیجا اور چونکہ بے تکلف اور مخلص آدمی ہیں منی آرڈر کے کوپن میں سادگی سے یہ بھی لکھدیا کہ مجھے بیحد اشتیاق ہے آپ کو اپنا مہمان بنانے کا۔ میں نے منی آرڈر یہ لکھ کر واپس کردیا کہ آپ یہ رقم دے کر مجھ پر زور ڈالنا چاہتے ہیں کہ میں ضرور باغپت آؤں۔ خواہ مجھے کوئی عذر ہی کیوں نہ ہو۔ اس سے میری آزادی میں فرق آتا ہے اس لئے آپ اپنے روپے رکھئے، اور اب آنے جانے کے متعلق گفتگو کیجئے۔ بس حقیقت روشن ہوگئی، جمشید تو وہ تھے اور جام جمشید میرے پاس تھا، جس میں سارے حالات نظر آجاتے تھے، پھر ان کا معذرت کا خط آیا۔ ماشاء اللہ ان کی تہذیب اور سمجھ دیکھئے، انہوں نے لکھا کہ:۔

''حقیقت میں مجھ سے غلطی ہوئی کہ میں نے منی آرڈر کے ساتھ ہی تشریف آوری کی درخواست بھی کردی، میں اب بلانے کی تحریک سے رجوع کرتا ہوں اور اب اس سے بالکل قطع نظر کرکے مکرر منی آرڈر بھیجتا ہوں، امید ہے کہ اب براہ کرم قبول فرمالیجئے گا''۔

میں نے پھر منی آرڈر لے لیا اور لکھا کہ:۔

''پہلے تو آپ کو مجھ سے ملنے کا اشتیاق تھا اور اب آپ کی اس تہذیب کو دیکھ کر میں

خود آپ سے ملنے کا مشتاق ہو گیا ہوں۔ لہذا جب آپ چاہیں اس کے متعلق مجھ سے خط و کتابت کریں''۔

میں نے کہا کہ جب ان کی دل شکنی کی ہے تو اب دلجوئی بھی کرنا چاہئے، ہر شخص کو اس کے درجہ پر رکھنا ضروری ہے''۔ (الافاضات الیومیہ ص ۲۴۲ جلد نہم طبع تالیفات اشرفیہ ملتان)۔

جب حضرت والاؒ کے سفر کا نظم طے ہو گیا تو پہلے باغپت تشریف لے گئے اور پہلا وعظ ''جلاء القلوب ملقب بہ جام جمشید'' نواب صاحب کی کوٹھی پر ۲؍ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ مطابق ۶؍فروری ۱۹۱۶ء بروز یکشنبہ ہوا۔ دوسرا وعظ ''رجاء الغیوب ملقب بہ صبح امید'' ۳؍ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ مطابق ۷؍فروری ۱۹۱۶ء وقت صبح بروز دوشنبہ مقام کاٹھہ نزد باغپت درمکان زنانہ شیخ محمد حسن صاحب مرحوم ہوا۔ تیسرا وعظ ''دواء العیوب ملقب بہ شام خورشید'' ۴؍ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ مطابق ۸؍فروری ۱۹۱۶ سہ شنبہ بوقت شام برمکان حاجی وجیہ الدین صاحب مرحوم شہر میرٹھ صدر میں ہوا۔

حضرت والاؒ کے خواص خدام میں سے سید مقبول حسین وصل بلگرامیؒ نے ایک مجلس خاص اور مجلس عام کے جو ملفوظات جمع کئے تھے اس مجموعہ کا نام حضرت والاؒ نے ''بزم جمشید'' خود تجویز فرمایا تھا اور لقب ''خمخانہ باطن'' رکھا گیا۔

حضرت والاؒ کو نواب صاحب مرحوم اور ان کے اہل وعیال سے جو خاص تعلق تھا وہ بعینہ نقل کیا جاتا ہے۔

خود حضرت اقدس مدظلہم العالی فرماتے ہیں کہ:۔

''اعمال میں تو کچھ کمی ہے مگر محبت و عقیدت میں کمی نہیں اور ان کے یہاں کی مستورات تو اپنے وقت کی رابعہ بصریہ ہیں۔ بالخصوص ان کی اہلیہ تو سراپا خلوص و طاعت ہیں، ان کے حالات تو دیکھنے سے معلوم ہوتے ہیں۔ میں نے اپنے گھر کے ذریعے سے جس قدر حالات سنے ہیں وہ اس دور میں آپ اپنی مثال ہیں۔ باوجود تنعم کے مزاج میں جس قدر انکسار، عجز، وبردباری ہے وہ اس زمانے میں مشکل ہے۔ محبت وعقیدت میں فنا ہیں۔

نواب صاحب کی والدہ نے مکہ معظّمہ میں حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے شرف بیعت حاصل کیا تھا۔ یہ سب برکتیں اور یہ سب اثر اس گرامی توسل کا ہے جو مکہ معظّمہ سے حاصل ہوکر باغپت میں آیا تھا اور خدا نے چاہا تو یہ سلسلہ ہمیشہ روز افزوں ترقی کیساتھ قائم رہے گا''۔

(اللہ تعالیٰ یہ دعا نواب صاحب مرحوم کے خاندان کے حق میں قبول فرمائیں۔آمین)

پھوپھا صاحب مرحوم کی حضرت والا سے محبت کا اس سے بڑھ کر کیا ثبوت ہوگا کہ شیخ خود اپنے مرید کی محبت کی شہادت دے۔ علاوہ ان ''مواعظ ثلاثہ'' اور ''بزم جمشید'' کے ملفوظات کے حضرت والا کے ملفوظات و مواعظ اور مجالس میں بھی نواب صاحب مرحوم کا اکثر و بیشتر ذکر آیا ہے۔

حضرت والا کی حیات مبارکہ میں نواب صاحب مرحوم کی محبت کے مظاہرے ریکارڈ میں موجود ہیں، لیکن ایک واقعہ جو بندہ نے ایک معتبر راوی سے سنا ہے نقل کرتا ہوں۔

جب حضرتؒ کا وصال ہوگیا تو چھوٹی پیرانی صاحبہ رحمۃ اللہ علیہا نے حضرت والا کے تبرکات تقسیم کئے۔ حضرتؒ کی ٹوپیاں، رومال، شلوکے، عمامے وغیرہ خلفاء اور خدام حضرات نے اپنی پسند کے مطابق وصول کئے۔ نواب صاحب مرحوم سے جب دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ حضرت والا کی پرانی استعمال شدہ جرابیں (اُونی موزے) پیرانی صاحبہؒ عنایت کردیں۔ نواب صاحبؒ نے گھر لے جاکر فوراً ٹوپی بنوائی جس کو پہن کر تہجد کی نماز پڑھتے تھے۔

ع خدا رحمت کند ایں عاشقاں پاک طینت را

میرے دوست محترم ڈاکٹر محمد منشا صاحب زید مجدھم شکریہ کے مستحق ہیں کہ سب سے پہلے انہوں نے مواعظ ثلاثہ کی طباعت کے لئے بندہ کو متوجہ کیا۔ اس سلسلہ کا دوسرا وعظ ''رجاء الغیوب ملقب بہ صبح امید'' دستیاب نہیں ہورہا تھا، ڈاکٹر صاحب موصوف نے بڑی کوشش و کاوش کے بعد اس کی نشان دہی کی جس کے نتیجے میں محترم محمد کلیم صاحب زید مجدھم (خلیفہ حضرت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحی صاحب نوراللہ مرقدہ) نے مطلوبہ وعظ دارالعلوم کراچی کے کتب خانہ میں تلاش کرکے اس کی فوٹو کاپی مجھے دی جو میں نے مفتی محمد رضوان صاحب زید مجدھم (مہتمم ادارہ غفران راولپنڈی) کو ارسال کردی، دریں اثنا ہمارے مخدوم زادہ محترم حسن عباس صاحب زید مجدھم نے ''مواعظ ثلاثہ''

کو یکجا ایک جلد میں حضرت عارفیؒ رحمۃ اللہ علیہ کی المار ی سے تلاش کر کے مفتی محمود اشرف صاحب دامت برکاتہم کے حوالہ کر دیا۔ الحمدللہ مفتی صاحب مدظلہ نے طباعت کے مراحل کو بحسن وخوبی تکمیل کو پہنچایا۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر مولانا یہ ذمہ داری نہ لیتے تو شاید ان مواعظ ثلاثہ کی طباعت حضرت والاؒ کی حسب منشأ یکجا طور پر معرض وجود میں نہ آتی، باوجود علالت وتکالیف اور دار العلوم کے فرائض منصبی کی ادائیگی کی مشغولیت کے یہ کام پایۂ تکمیل کو پہنچایا۔ برادر گرامی قدر حضرت محمد کلیم احسن صاحب (مجاز بیعت عارف باللہ ڈاکٹر عبدالحی صاحبؒ) کا بھی مرہون منت ہوں، ماشاء اللہ موصوف کو اللہ تعالیٰ نے ذوقِ تھانوی سے نوازا ہے، حضرت عارف باللہ عارفی کی زیر تربیت اس نوعیت کی خدمتِ دین انجام دی ہے، ان کے نہایت مفید اور ضروری مشوروں اور تعاون سے مدد ملی۔ اللہ تعالیٰ ان تمام حضرات کو جنہوں نے باوجود اپنے ضروری مشاغل کے تعاون فرمایا ہے اجر عظیم عطا فرمائے، سب کے لئے اس کے مطالعہ کو اصلاح اعمال کا ذریعہ بنائے اور حضرت والا رحمۃ اللہ کو اپنے قرب کے درجات رافعہ سے نوازے۔ آمین۔

ادنیٰ ترین غلام آستان اشرفی
محمد عشرت علی خان قیصر عفی عنہ
۲۱ر صفر ۱۴۲۴ھ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حاصلِ تصوّف

وہ ذراسی بات جو حاصل ہے تصوف کا، یہ ہے کہ جس طاعت میں سُستی محسوس ہو، سُستی کا مقابلہ کر کے اس طاعت کو کرے، اور جس گناہ کا تقاضا ہو، تقاضے کا مقابلہ کر کے اس گناہ سے بچے۔ جس کو یہ بات حاصل ہوگئی اس کو پھر کچھ بھی ضرورت نہیں، کیونکہ یہی بات تعلق مع اللہ پیدا کرنے والی ہے اور یہی بات اس کی محافظ ہے اور یہی اس کو بڑھانے والی ہے۔

(ملفوظ حضرت تھانوی قدس سرّہٗ)

باغپت ضلع میرٹھ میں کئے گئے تین اہم مواعظ میں سے ایک اہم وعظ

جلاءُ القلوب

المعروف بہ

جامِ جمشید

ازحکیم الأمت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

☆

ناشر

ادارہ اسلامیات کراچی ۔ لاہور

این	متی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کب ہوا کتنی دیر ہوا	کس طرح ہوا	کیا مضمون تھا	کس نے لکھا	تعداد سامعین	متفرقات
باغپت ضلع میرٹھ کوٹھی نواب جمشید علی خان صاحب	۲ رربیع الثانی ۱۳۳۴ھ بروز یکشنبہ۔ ۶ رفروری ۱۹۱۶ء	شروع ۸ بجے ۲۸ منٹ صبح۔ ختم ۱۲ بجے کل وقت ۳ گھنٹہ ۳۲ منٹ	کھڑے ہوکر	انتفاع بالقرآن کے لئے قابلیت قلب ضروری ہے	احقر محمد مصطفیٰ میرٹھی	تخمینا ۲۰۰۔ اور بالا خانہ پر مستورات	مجمع میں ایک عیسائی بھی تھا اس نے بعد وعظ کہا کہ ایسے مولوی اور ایسا لیکچر ہونا چاہئے

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

دعاء وخطبہ۔ امابعد فاعوذ باللہ من الشیطان الرجیم، بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔ إن فی ذلک لذکری لمن کان له قلب او القی السمع وهو الشهید[۱]۔

قرآن سے فائدہ حاصل کرنے کی شرط

یہ آیت سورۂ قاف کی ہے، اس میں اللہ تعالی نے قرآن مجید سے یعنی دین[۲] سے منتفع[۳] ہونے کی ایک شرط ارشاد فرمائی ہے، اور یہ بڑی رحمت ہے حق تعالی کی، کہ اول تو بندوں کے نفع کے لئے ایک بے مثل کتاب نازل فرمائی جس سے زیادہ کوئی کتاب نافع نہیں ہوسکتی، دوسرے صرف کتاب کے اتار دینے ہی پر اکتفاء نہیں فرمایا، بلکہ اس سے انتفاع[۴] کا طریقہ اور شرط بھی بیان فرمادی، یہ بیحد شفقت ہے۔

بڑے اور چھوٹے کے درمیان تعلق کی اقسام

اس کی تفصیل یہ ہے کہ کسی بڑے کو چھوٹے سے جو تعلق ہوتا ہے وہ دو قسم کا ہوتا ہے، ایک ضابطہ کا، دوسرے شفقت کا، اور دونوں کے آثار الگ الگ ہوتے ہیں، ضابطہ کا تعلق تو یہ ہے جیسے حاکم کو رعایا کے ساتھ ہوتا ہے، کہ ایک حکم دیا اور اس کا اعلان کردیا، بے فکر ہوگئے، اب اگر کوئی اس حکم کو نہ مانے گا تو حاکم کی بلا سے، اس کے ساتھ ضابطہ کی کاروائی کی جائے گی، اور جیل خانہ بھیج دیا جائے گا، اور شفقت کا تعلق یہ ہے جیسے باپ کو بیٹے کے ساتھ ہوتا ہے، کہ کوئی بات اس کو بتاتا ہے

---

[۱]:۔ ترجمہ:۔ بے شک اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس دل ہو یا وہ متوجہ ہوکر کان لگا دیتا ہو۔ (سورۂ قٓ، ۳۷)۔ [۲]:۔ قرآن کو دین کہنے کی وجہ آگے آتی ہے۔ [۳]:۔ فائدہ اٹھانے کی۔ [۴]:۔ فائدہ حاصل کرنا۔

تو صرف ایک دفعہ بتانے پر اکتفاء نہیں کرتا، بلکہ اس کو بار بار سمجھاتا ہے، ایک دفعہ یہ کہہ کر نہیں چھوڑ دیتا کہ اس کے خلاف کرو گے تو سزا پاؤ گے جیسے حاکم کرتا تھا۔

ضابطہ اور شفقت کے تعلق میں فرق

بلکہ یہاں دو قسم کے تفاوت[1] ہیں، ایک تو وہی کہ ایک دفعہ کہنے پر اکتفاء نہیں کرتا بلکہ اس کے پیچھے پڑ جاتا ہے، ایک ہی مضمون کو پچاس پچاس دفعہ کہتا ہے، ایک ہی لفظ سے یا عنوان بدل بدل کر، دوسرے اگر اس پر عمل کرانے کے لئے کسی اہتمام کی یا تدبیر خاص کی ضرورت ہوتی ہے تو اس سے بھی دریغ نہیں کرتا، مثلاً حکومت کی طرف سے اعلان ہوا کہ جو کوئی چوری کرے گا اس کو سزا ہو گی، حاکم تو اس ایک اعلان ہی پر اکتفاء کرے گا، اور کہہ دے گا کہ ہمارا فرض ادا ہو گیا، اور باپ اسی لفظ کو بیٹوں سے دو دفعہ، چار دفعہ، دس دفعہ کہے گا اور سمجھائے گا، اور کسی تعداد پر بھی کفایت نہ کرے گا، بلکہ جب تک اس کو کسی قسم کا اندیشہ اور خدشہ بھی رہے گا کہ یہ چوری کریں گے اس وقت تک برابر سمجھاتا رہے گا، اور اگر یہ معلوم ہو گا کہ یہ چوری کے عادی ہیں، تو اس سے بچانے کے لئے خاص اہتمام اور تدبیر کرے گا، مثلاً اوّل چوری کے اسباب کی تشخیص کرے گا کہ ان کو یہ عادت کیوں پڑی، اگر اس عادت کا سبب حبِ مال ثابت ہو گا تو اس کا علاج کرے گا، مثلاً ان کو سمجھائے گا کہ مال اچھی چیز نہیں، کیونکہ زیادہ تر مال کھانے پینے کے لئے اور زبان کی لذّت کے لئے کمایا جاتا ہے، مگر زبان کی لذّت کیا چیز ہے؟ ذرا دیر کے لئے مزہ لے لیا، اور اس پر جو کلفت مرتب ہوتی ہے وہ ذرا دیر کی نہیں، بلکہ ممتد[2] ہے، مثلاً چھ مہینے کی سزا ہے، تو کیا عقل کی بات ہے کہ ایک لمحہ کے مزے کے لئے چھ مہینے کی کلفت[3] کی پرواہ نہ کی جائے! اس طرح قسم قسم کی تدبیر سے حبِ مال چھڑائے گا تاکہ بچے چوری نہ کریں۔

دوسری مثال سنئے، آپ نے دیکھا ہو گا کہ بعض دفعہ کوئی موسم خراب ہوتا ہے، اور اس میں بعض چیزوں کا کھانا مضر ہوتا ہے، جیسے امرود، کھیرا وغیرہ، تو حاکم تو بڑی سے بڑی شفقت یہ کرتا ہے کہ اعلان کرا دیتا ہے کہ آج کل موسم خراب ہے، فلاں چیز مت کھانا، اور ماں باپ بچے کے لئے صرف یہ نہیں کرتے کہ ان چیزوں کا نقصان بتا دیں، اور ایک دفعہ کہہ کر چھوڑ دیں بلکہ طرح طرح کی تدبیروں سے ان کو روکتے ہیں، ان کو گھر سے باہر نہیں نکلنے دیتے، اور پیسہ ہاتھ میں نہیں دیتے، اگر کسی

---

[1]- فرق۔ [2]- لمبی۔ [3]- تکلیف۔

طرح کوئی پھل گھر آ بھی گیا تو اس پر کوئی بدمزہ چیز لگا دیتے ہیں، جیسے ایلوا، یا مرچ وغیرہ تا کہ بچے اس سے طبعی نفرت ہو جائے، بلکہ اس کی نگرانی رکھتے ہیں کہ وہ چیز گھر میں آنے ہی نہ پائے، بچہ ہاتھ میں ہی نہ لے، اور اس کی صورت ہی نہ دیکھے، یہاں تک کہ خود بھی اس کا کھانا چھوڑ دیتے ہیں، چاہے خود کو نقصان نہ کرتی ہو، اس طرح کی سینکڑوں مثالیں ہیں، جن سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ ضابطہ کے معاملہ میں اور شفقت کے معاملہ میں بڑا فرق ہے۔

اللہ تعالیٰ کا بندوں سے شفقت کا تعلق ہے

اب سمجھو کہ خدائے تعالیٰ کو بندوں کے ساتھ شفقت کا تعلق ہے، صرف ضابطہ کا تعلق نہیں، اس کا یہ نتیجہ ہے کہ اگر خدا تعالیٰ سے بندوں کو تعلق نہ بھی ہو، تب بھی یہ نہیں ہوتا کہ خدا تعالیٰ کو بندوں سے تعلق نہ رہے، اس کی موٹی مثال وہی ماں باپ کی شفقت اولاد کے ساتھ ہے، کہ آپ دیکھتے ہیں کہ اولاد کیسی ہی نالائق ہو اور ماں باپ سے قطع تعلق بھی کرے، لیکن ماں باپ سے یہ نہیں ہوسکتا کہ ان سے تعلق نہ رکھیں، یہ شفقت ماں باپ میں کہاں سے آئی ہے، یہ حق تعالیٰ کی طرف ہے کہ ان کی یہ شفقت ایک ذرا سا عکس اور پرتو ہے حق تعالیٰ کی شفقت کا، اب آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ جب عکس کی یہ حالت ہے تو اصل کی شان کیا کچھ ہوگی، جب ماں باپ اتنے شفیق ہیں تو حق تعالیٰ کتنے شفیق ہونگے۔

؎ چہ باشد آن نگار خود کہ بندد ایں نگارہا۔[1]

اللہ تعالیٰ کی شفقت انتہاء درجہ کی ہے

دیکھئے حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

أفنضرب عنكم الذكر صفحا إن كنتم قوما مسرفين.

''یعنی کیا ہم تم کو سمجھانا چھوڑ دیں اس وجہ سے کہ تم راہ پر نہیں آتے'' (سورۃ الزخرف، ۵)

کیا انتہاء ہے شفقت کی، اس شفقت کو پیش نظر رکھ کر قرآن کو دیکھئے تو اسلوبِ قرآن یہ ملے گا کہ جہاں کوئی امر فرمایا ہے، وہاں اس پر عمل کرنے کے طریقے بھی بتائے ہیں، یہ اسلوب قرآن کے طالب کو وجد میں لے آتا ہے، اسی اسلوب کے اندر یہ بھی داخل ہے کہ بعض اوامر کو بار بار مکرر کیا ہے، یہ ایسا ہی ہے جیسا میں نے ابھی مثال دی کہ باپ اولاد کو کسی بات کی ایک دفعہ تعلیم کر کے نہیں

---

[1]:۔ وہ کتنا خوبصورت ہوگا جس نے یہ ساری خوبیاں بنائیں۔

چھوڑ دیتا، بلکہ بار بار کہتا ہے اور مختلف عنوانوں سے سمجھاتا ہے کیونکہ اس کو ضابطہ[۱] کا معاملہ نہیں کرنا ہے، بلکہ شفقت کا معاملہ کرنا ہے ایک دفعہ کہہ کر اس کا دل نہیں مانتا، وہ اس بات کو اولاد کے دل کے اندر اتارنا چاہتا ہے، یہی حالت ہے اسلوبِ قرآنی کی کہ بہت سے اوامر[۲] کو طرح طرح کے عنوانوں سے اور بار بار ارشاد فرمایا ہے، یہ انتہاء درجہ کی شفقت ہے۔

قرآن مجید میں تکرار عین حکمت ہے

مگر اس کی قدر وہ کرسکتا ہے جو اپنے آپ کو بندہ اور خدا کو خدا جانتا ہو، خدا وہ ہے جو کسی کا کسی طرح محتاج نہیں، اور بندہ وہ ہے جو ہر وقت اور ہر حالت میں سراپا[۳] احتیاج ہے، اگر خدائے تعالیٰ بندہ کے ساتھ بالکل استغناء[۴] کا برتاؤ بھی کریں، تب بھی ان کے شایانِ شان ہے، کیونکہ وہ غنی[۵] ہیں، مگر ایسا نہیں کیا، اول تو تکلیف مالا یطاق[۶] نہیں دی، دوسرے اوامر کے ساتھ سہولت[۷] کے طریقے بھی بتادیئے، اور ایک دفعہ کہہ کر نہیں چھوڑا بلکہ بار بار دہرایا، اس سے حیرت ہوتی ہے ایک مصنف کی حالت پر، اس نے ایک کتاب لکھی ہے، جس میں قرآن کے مکرّرات پر اعتراض کیا ہے، وہ لکھتا ہے کہ ''کسی مصنف کے لئے کتاب میں ایک بات کو دہرانا عیب میں داخل ہے''، افسوس ہے اس کی وہی مثل ہے کہ گدھے کو دیا نمک، اس نے کہا میری آنکھیں پھوڑ دیں، بیوقوف نے یہ قدر کی شفقت کی، یہ شخص شاید باپ نہیں بنا کسی بیٹے کا کہ اس کو معلوم ہوتا کہ بیٹے کے سامنے کسی بات کو دہرانا عیب میں داخل ہے یا شفقت میں، اگر یہ باپ نہ بنا تھا تو دوسروں کو دیکھ کر قیاس تو کرسکتا تھا کہ بیٹے کو ایک ہی دفعہ نصیحت کیا کرتے ہیں یا دو، چار، دس، پانچ سو پچاس دفعہ، اگر باپ پر بھی بیٹا یہی اعتراض کرے کہ مجھ سے ایک بات کو بار بار کیوں کہتے ہو، تو اس وقت باپ کو کوئی برا کہے گا یا بیٹے کو، سمجھ لیجئے کہ حق تعالیٰ کے کلام میں تکرار ہونا عیب نہیں، بلکہ اس مصنف کی سمجھ میں عیب ہے، اور قرآن میں تکرار عین شفقت ہے، اس واسطے خود فرمایا ہے ولقد صرفنا فی هذا القرآن ليذكروا (بنی اسرائیل ۴۱) ''یعنی ہم نے قرآن میں طرح طرح سے بیان کیا ہے تاکہ لوگ نصیحت پکڑیں''۔ تاکہ وہ سمجھیں، اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ کو ضابطہ کا برتاؤ نہیں ہے بلکہ دل میں اتار دینا منظور ہے۔

کامل شفقت کیا ہے؟

۱:۔ قانون۔ ۲:۔ احکام۔ ۳:۔ سر سے لے کر پاؤں تک۔ ۴:۔ بے پروائی۔ ۵:۔ بے نیاز۔ ۶:۔ ایسی چیز کا حکم دینا جس کی طاقت نہ ہو۔ ۷:۔ آسانی۔

غرض میں نے کہا تھا کہ شفقت کے دو اثر ہونگے، ایک تو یہ اثر ہوگا کہ ایک بات کو بار بار کہا جائے گا، دوسرا اثر یہ ہوگا کہ اس پر عمل کرنے کے لئے دستور العمل بھی بتائیں گے، دیکھئے ایک تو یہ صورت ہے کہ بچہ کے ہاتھ میں قلم دیدیا اور کہہ دیا کہ لکھو، اور ایک یہ ہے کہ قلم ہاتھ میں دے کر طریقۂ تحریر بھی بتایا جائے، اور ایک ایک حرف اپنے سامنے اس کے ہاتھ سے بنوا کر ہاتھ پکا کرایا جائے، شفیق استاد کا یہی کام ہے، صرف قلم بچہ کے ہاتھ میں دیدینا دل خوش کرنے کی ترکیب ہے، اور بس، جیسے بعض وقت اسکولوں میں انعام صرف قلم دیدیا جاتا ہے، گو اس سے بھی مقصود یہی ہوتا ہے کہ انعام ایسا دیا جائے جو تعلیم سے اور لکھنے پڑھنے سے تناسب[۱] رکھتا ہو، قلم ایسی ہی چیز ہے کہ طالب علم کے لکھنے کے کام میں آئے گا، اور اس سے اس کو شوق علم کا بڑھیگا، تو اس معنے کر یہ بھی شفقت ہے، لیکن یہ شفقت ناتمام ہے، جس کو دل خوش کرنا ہی کہہ سکتے ہیں، شفقت کامل وہی ہے کہ قلم ہاتھ میں دے کر سامنے بٹھا کر لکھنا سکھایا جائے، یہ شفقت ضابطہ والوں کے یہاں نہیں ہوسکتی۔

نفع شفقت کے تعلق سے ہوتا ہے

دیکھئے اگر ایک افسر کسی محرر کو کچھ لکھنے کا حکم دیتا ہے، تو بحیثیت افسر ہونے کے طریقۂ تحریر بتلانا اس کے ذمہ نہیں، اس کو ضابطہ کا تعلق کہتے ہیں، اور شفیق استاد طریقۂ تحریر بھی بتلاتا ہے، اس کو شفقت کا تعلق کہتے ہیں، نفع شفقت ہی کے تعلق سے ہوتا ہے ضابطہ کے تعلق سے نہیں ہوتا، دیکھئے کسی کو بائیسکل دیدیجئے اور اس کو طریقہ اس پر سواری کا نہ بتلایئے، تو اس سے اس کو کچھ نفع نہیں پہنچ سکتا، بلکہ بجائے اس کو نفع پہنچنے کے کہ اس پر وہ سواری کرتا وہ بائیسکل اس کے سر پر لد جائے گی، اور جو دینے والا شفیق ہوگا، مثلاً باپ، بیٹے کو سائیکل دے تو سواری کی تعلیم بھی کرے گا، یہ شفقت کا برتاؤ عام تعلقات میں نہیں ہوتا، بلکہ خاص تعلقات میں ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ خاص تعلق ہے۔ اس وجہ سے ایسا برتاؤ کیا۔ اس خاص تعلق کے ساتھ یہ نہیں ہوسکتا تھا کہ ایک چیز مفید ہم کو دیں اور اس کا طریقۂ استعمال نہ بتادیں، چنانچہ اس آیت میں اس طریقہ ہی کا بیان ہے۔

قرآن مجید میں قصے ذکر کرنے کا مقصد

اس سے پہلی آیت میں کچھ امتوں کے ہلاک کرنے کی خبر دی، پھر اس قصہ سے انتفاع کا طریقہ بھی خود ہی بتلا دیا، حالانکہ اہل عقل سمجھ سکتے ہیں کہ قصہ سنانے سے مقصود داستان گوئی نہیں ہوتی، خصوصاً قرآن جیسی مذہبی کتاب میں، بلکہ مقصود ان واقعات سے عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے،

---

[۱]: مناسبت

بنا بریں[1] کوئی ضرورت طریقۂ انتفاع[2] کے تعلیم کی نہ تھی، مگر غایت شفقت کی وجہ سے طریقہ کو بھی خود ہی بیان فرما دیا اس واسطے کہ ایسی سلیم طبیعتیں کم ہیں جو قصوں سے پورا نفع اٹھا سکیں، غباوت[3] اور کجی طبیعتوں میں غالب ہے، اگر صرف قصوں کے بیان پر اکتفا کیا جاتا تو پورا نفع نہ ہوتا، بلکہ کج فہم طبیعتیں شاید یہ کہتیں کہ مذہبی کتاب میں قصوں کا کیا کام؟ چنانچہ آجکل بہت طبیعتیں ایسی ہیں جن میں یہ کجی موجود ہے، اور ایسے لوگ یہی اعتراض کرتے ہیں، لیکن سلیم طبیعتیں بھی موجود ہیں جو قصوں سے نفع اٹھاتی ہیں، لیکن ایسا نفع وہ بھی نہیں اٹھا سکتی تھیں جیسا کہ اب طریقۂ انتفاع کے بیان کے بعد اٹھا سکتی ہیں، چنانچہ آگے معلوم ہوگا، یہ طریقہ ابلغ[4] ہے نفع میں، اس کا فرق دوسرے طریقہ سے یعنی صرف قصہ سنا دینے میں اور طریقۂ انتفاع بتلانے میں جو فرق ہے اس کو آج کل کے مذاق کے موافق اس طرح آسانی سے سمجھ سکتی ہیں کہ ایک طریقہ قصہ گوئی کا پرانا تھا جس میں بہت دلچسپ حکایتیں بیان کی جاتی تھیں اور ایک طریقہ آج کل ہے جس کو ناول کہتے ہیں، اس میں اور اس میں فرق یہی ہے کہ پہلے طریق میں صرف حکایتیں بیان کی جاتی تھیں اور اس نئے طریق میں صرف حکایتیں نہیں ہوتیں بلکہ حکایتوں کو اس پیرایہ سے بیان کیا جاتا ہے کہ جس سے ان کاموں کا جو حکایتوں میں درج ہیں طریقہ بھی معلوم ہوتا ہے، اس واسطے یہ طریقہ زیادہ مؤثر ہے۔

ناولوں کا دیکھنا نقصان دہ ہے

کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں ناولوں کی تعریف کرتا ہوں یا دیکھنے کی اجازت دیتا ہوں بلکہ صرف اثر دکھلانا مقصود ہے ورنہ ناولوں کو دیکھنا نہایت مضر ہے، جس کا راز یہ ہے کہ اس کے مصنف اکثر وہ لوگ ہیں جن میں دین نہیں، اور جن کے اخلاق خراب ہیں، مصنف کی اخلاقی اور اس کی قلبی حالت کا اثر کلام میں ضرور ہوتا ہے اور خصوص جبکہ اس میں مضامین بھی زیادہ تر مفسد اخلاق ہی ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ پیرایہ کلام کا بھی ایسا ہوتا ہے جو مؤثر ہے، تو ظاہر ہے کہ اس سے فسادِ اخلاق اور بے دینی ہی کا اثر زیادہ ہوگا، چنانچہ مشاہدہ ہے کہ پرانی کتابیں قصوں کی جیسے ''بہار دانش'' وغیرہ کس قدر فحش ہیں، لیکن ان کے پڑھنے سے نہ اس قدر بے دینی پیدا ہوتی ہے نہ فساد اخلاق، جتنا کہ ناولوں سے ہوتا ہے، غرض ناول بہ نسبت پرانے قصوں کے زیادہ مؤثر ہیں، اس وجہ سے کہ ان میں طریقۂ عمل بھی بتلایا جاتا ہے۔

---

[1]:۔اس بناء پر۔ [2]:۔فائدہ اٹھانے کا طریقہ۔ [3]:۔بے وقوفی اور ٹیڑھاپن۔ [4]:۔زیادہ مفید

ناولوں کو مثنوی پر قیاس نہیں کر سکتے

یہاں ایک مضمون اور ذہن میں آ گیا، وہ یہ ہے کہ مولانا کی مثنوی میں بھی بہت سے فحش قصے ہیں، ایسے کہ اگر یہ کتاب مولانا کی نہ ہوتی تو ہم تو اس کو ہاتھ بھی نہ لگاتے، وجہ اس کی یہ ہے کہ مولانا نے جہاں کہیں ایسے قصے لکھے ہیں وہاں بغیر ان کے کام نکل ہی نہیں سکتا تھا، تو اب اس کی مثال ایسی ہوگئی جیسے اناج کی کاشت کہ اناج کیسی پاکیزہ چیز ہے، لیکن اس کی کاشت میں میلے[۱] کا کھاد دینا پڑتا ہے، اگر اس پر اناج کی پیداوار موقوف نہ ہوتی تو اس کا ڈالنا لطیف طبیعتیں کبھی گوارا نہ کرتیں، یہ لوگ چونکہ اہل تحقیق اور عارف ہیں، یہ فحش سے بھی وہ پاکیزہ نتیجے نکالتے ہیں کہ دوسرا کوئی نہیں نکال سکتا، ان کے فحش کلام سے بھی انوار پیدا ہوتے ہیں، اور جنکے دلوں میں گندگی بھری ہوئی ہے اور دین اور عرفان سے ان کو مس[۲] نہیں، ان کے پاکیزہ کلام سے بھی گندگی اور ظلمات ہی پیدا ہوتے ہیں، لہذا ناولوں کو مثنوی پر قیاس نہیں کر سکتے، دیکھئے ایک ہی بات ہوتی ہے کسی کے کلام میں کچھ اثر رکھتی ہے اور کسی کے کلام میں کچھ، اگر کوئی کسی کافر کا نام لے تو زبان خراب کرنا کہا جائیگا، لیکن قرآن میں بعض کفار کا نام آیا ہے جیسے فرعون، قارون، ہامان وغیرہ، تلاوت میں جب ان کا نام آتا ہے تو بجائے زبان خراب ہونے کے فی حرف دس نیکیاں ملتی ہیں جیسا کہ سب کو معلوم ہے۔

عجیب بات ہے کہ اسی لفظ سے ایک جگہ زبان خراب ہوتی ہے اور ایک جگہ نیکیاں ملتی ہیں، قرآن میں فرعون کا لفظ زبان سے کہا اور پچاس نیکیاں مل گئیں، یہ بات لفظِ ''فرعون'' میں اسی وجہ سے تو پیدا ہوگئی کہ حق تعالیٰ کے کلام میں آیا ہے، اس سے معلوم ہوا کہ ایک ہی لفظ ایک متکلم کی وجہ سے ایک اثر رکھتا ہے اور دوسرے متکلم کی وجہ سے دوسرا اثر رکھتا ہے، بس میرا مدعا ثابت ہوگیا کہ ناولوں کو مثنوی پر نہیں قیاس کر سکتے۔

قرآن مجید میں ''فرعون'' کا لفظ اور اس پر اعتراض و جواب

اب میں ایک بات اور کہتا ہوں کہ اس وقت اس فرعون والی مثال کو ذکر نہ کرنا چاہئے تھا کیونکہ سرود بمستان یاد دہانیدن[۳] ہے، خواہ مخواہ لوگوں کو وحشت ہوگی، اور طرح طرح کے سوالات پیدا کریں گے، آج کل طبیعتوں میں کجی زیادہ ہے، ذرا سی بات منہ سے نکالتے ڈر معلوم ہوتا ہے، اس واسطے میں اہل علم کو مشورہ دیا کرتا ہوں کہ پیچیدہ اور دقیق باتیں نہ بیان کیا کریں، اور بے ضرورت

۱:۔ گوبر۔ ۲:۔ چھونا۔ ۳:۔ مست لوگوں کا نشہ بڑھا دینے والی بات ہے۔

ایسے مضامین سے بچا کریں، کیونکہ آج کل ذراسی بات میں فتنہ کھڑا ہو جاتا ہے، اور پھر اس پر مباحثے، مناظرے اور رسالہ بازی شروع ہو جاتی ہے، اس وقت فرعون والی مثال زبان پر نہ آتی تو اچھا تھا، نہ معلوم کیا کیا سوال اس پر پیدا ہوں؟ لیکن کیا کیا جائے! ایسے سوال پیدا ہو چکے ہیں، یہ سوال لفظ فرعون کا دہلی سے میرے پاس آچکا ہے، لکھا تھا کہ فرعون جیسا گندہ نام پڑھنے سے بھی کیا نیکیاں ملیں گی؟، دیکھئے کس قدر طبیعت کی کجی ہے یہ سوال اس وقت سے پہلے کسی نے نہیں کیا تھا حالانکہ کم فہم بلکہ مخالفین ومعاندین بھی ہر زمانہ میں رہے ہیں، مگر یہ سوال کسی کے ذہن میں نہیں آیا، میں نے جواب میں لکھا کہ ''حیثیات مختلف ہونے سے احکام مختلف ہو جاتے ہیں اور آثارِ مختلفہ مترتب ہوتے ہیں، لفظ فرعون پر اس حیثیت سے کہ حق تعالیٰ کے کلام میں آیا ہے نیکیاں ملتی ہیں، ویسے یہ ایسا منحوس نام ہے کہ زبان پر لانا بھی باعثِ نحوست ہے''، یہ چند باتیں کام کی درمیان میں آگئیں۔

آج کل کی طبائع لہو ولعب کی طرف زیادہ مائل ہیں

ذکر یہ تھا کہ طریقِ عمل کی تعلیم کو بھی کلام کے مؤثر ہونے میں بڑا دخل ہوتا ہے، اگر طبیعت سلیم[1] ہو تو اثر جلدی ہوتا ہے اور قوی ہوتا ہے اور سلیم نہ ہو تو اثر کم ہوتا ہے اور دیر میں ہوتا ہے، لیکن ہر صورت میں اگر طریقہ بلیغ ہو تو اثر ضرور ہوتا ہے، اور متکلم کی شفقت پر ضرور دلالت کرتا ہے، مگر طبائع[2] کی حالت آج کل یہ ہے کہ بلیغ طریقہ پر بھی اعتراض کیا جاتا ہے، چنانچہ قرآن کے مکررات پر اعتراض کیا ہی گیا ہے، پہلے کسی وقت میں تو طبائع کی یہ حالت تھی جس کو شیخ سعدیؒ نے بیان کیا ہے۔

نگویند از سر بازیچہ حرفے کزاں پندے نگیرد صاحب ہوش۔[3]

سلیم طبائع کھیل کی باتوں میں سے اور نکمی باتوں میں سے بھی کام کی باتیں نکال لیتی تھیں اور اب حالت یہ ہے جس کو دوسرے شعر میں بیان کیا ہے۔

اگر صد باب حکمت پیش نادان بخوانی آیدش بازیچہ در گوش۔[4]

کہ کام کی باتوں میں سے بھی نکمی باتیں نکال لی جاتی ہیں، اور اچھی بات پر بھی اعتراض کر دیا جاتا ہے، آج کل زیادہ مذاق غیر سلیم ہی ہیں، جن سے یہ امید کم ہے کہ صرف قصہ کو سن کر نتیجہ نکال لیں گے

---

[1]:۔ سلامتی والی، اچھی طبیعت۔ [2]:۔ طبیعتوں۔ [3]:۔ ترجمہ:۔ کھیل کی باتوں سے بھی کوئی حرف زبان پر نہیں لاتے کہ کہیں کوئی عقلمند اس سے کام کی بات نہ نکال لے۔ [4]:۔ اگر دانائی کے سو باب بے وقوف کے سامنے سناؤ، تو بھی اس کے کان فضول بات ہی پہنچے گی۔

لہٰذا مقتضائے شفقت یہی تھا کہ قصوں کو بیان کر کے نتیجہ کو بھی بیان کیا جائے، اور طریقہ ان سے فائدہ اٹھانے کا بھی بیان کیا جائے، دیکھئے طبائع کی یہ حالت ہے کہ علماء وعظوں میں قرآن وحدیث کے مضامین بہت شرح وبسط[۱] کے ساتھ بیان کرتے ہیں اور مالہ وما علیہ[۲] سب سے بحث کرتے ہیں، لیکن سننے والے صرف لہجہ اور خوش آوازی سننے کو آتے ہیں اور اسی کو معیار، وعظ کے اچھے اور برے ہونے کا بنا رکھا ہے، بات یہی ہے کہ طبائع لہو ولعب[۳] کی طرف زیادہ راغب ہیں، جس چیز میں مزہ آتا ہے اسی کی طرف مائل ہوتی ہیں، چاہے اس میں کام کی بات ایک بھی نہ ہو، اور جس چیز میں مزہ نہ آئے اس کی طرف مطلق التفات[۴] نہیں ہوتا، چاہے اس میں ہر ہر لفظ کام کا ہو۔

الہ آباد کا ایک واقعہ

مجھے الہ آباد میں بیان کرنے کا اتفاق ہوا، تو بعد وعظ کے لوگوں نے کہا کہ وعظ میں اتنی کسر ہے کہ خوش آوازی نہیں، میں نے کہا ہاں بھائی ٹھیک کہتے ہو، میں گویا نہیں ہوں، اور نہ میرے خاندان میں کوئی گویا ہوا ہے، یہ حالت ہے اِنا للہ واِنا اِلیہ راجعون، جب یہ حالت ہے کہ آواز کو اچھے اور برے بیان کا معیار سمجھا جاتا ہے، اور فرعون کے لفظ پر نیکیاں ملنے پر اشکال کیا جاتا ہے، اور تکرار کو عیب کہا جاتا ہے، غرض طبیعتوں میں کجی ہی کجی ہے، تو کیا امید کی جاسکتی ہے کہ کسی بات کے بتانے سے بلا طریقۂ انتفاع کی تعلیم کے کارآمد نتائج نکال لئے جائیں گے، اس واسطے قرآن میں قصوں کے ذکر کے بعد ان سے انتفاع کا طریقہ بھی تعلیم فرمایا ہے، چنانچہ فرماتے ہیں: إن فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب او القی السمع وھو شھید[۵]۔ عربی زبان جاننے والے سمجھ لیں گے کہ ''فی ذلک'' کا اشارہ مذکورہ قصہ کی طرف ہے۔

نفع شرائط کے پائے جانے پر ہوتا ہے

لیکن میں کہتا ہوں کہ یہ اشارہ من حیث القصہ نہیں ہے، بلکہ بحیثیت اس قصہ کے جزو قرآن ہونے کے ہے، جس کا حاصل یہ ہوا کہ اس جزو قرآن سے نفع کس کو حاصل ہوگا؟ جس پر ''من کان لہ قلب'' صادق ہو، اور ظاہر ہے کہ قرآن بتمامہ[۶] بندوں کے نفع ہی کے لئے اتارا گیا ہے تو کسی جزو

۱:۔ تفصیل۔ ۲:۔ اس سے متعلقہ تمام باتیں۔ ۳:۔ کھیل کود۔ ۴:۔ توجہ۔ ۵:۔ بے شک اس قرآن میں اس شخص کے لئے بڑی نصیحت ہے۔ جس کے پاس دل ہو یا وہ متوجہ ہو کر کان ہی لگا دیتا ہو۔ (سورۂ ق، ۳۷)۔

۶:۔ پورا کا پورا۔

کی تخصیص[1] کوئی معنی نہیں رکھتی، تو یہاں گو "ذلک" کا مشار الیہ ایک جزو ہے، لیکن مراد کل قرآن ہوا، تو حاصل یہ ہوا کہ قرآن سے انتفاع کا طریقہ یہ ہے جو بیان ہوگا، نہ کہ صرف اس قصہ سے انتفاع[2] کا طریق جو اس سے اوپر مذکور ہے، تو سارے ہی قرآن کی یہ حالت ہوئی کہ اس سے انتفاع شرائط مدلولہ آیت پر موقوف[3] ہے، یہ مضمون مجھے اس وقت ضروری معلوم ہوا، کیونکہ دیکھا جاتا ہے کہ قرآن تو بہت لوگ پڑھتے ہیں، بلکہ اگر یہ بھی کہا جائے تو بیجا نہ ہوگا کہ گذشتہ زمانہ سے زیادہ آج کل تلاوتِ قرآن کی جاتی ہے، بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ مخالفینِ اسلام بھی قرآن پڑھتے ہیں، لیکن یہ دعویٰ سے کیا جاتا ہے کہ انتفاع بالقرآن پہلے سے بہت کم، بلکہ قریب قریب مفقود ہے، اس کی وجہ یہی ہے کہ شرائط انتفاع مجتمع نہیں، بس اس آیت میں انہیں شرائط کا بیان ہے، "إن فی ذلک لذکری لمن کان له قلب او القی السمع وهو شهید"، اور ان شرائط کا بیان قرآن میں اور بھی بہت جگہ ہے اور ان کو جابجا مختلف عنوانات سے تعبیر فرمایا ہے، کہیں فرمایا ہے "ذکری للمؤمنین"[4] اور کہیں "عبرة لاولی الابصار"[5] اور کہیں فرمایا "لِمَن اَرَادَ اَنْ یَذَّکَّرَ"[6]، اور کہیں "إن فی ذلک لعبرة لمن یخشی"[7]، نزولِ قرآن تو گو نفع عام کے لئے ہے مگر نفع ہوتا ہے شرائط کے ساتھ، اس کو اس مثال سے سمجھ لو، ایک طبیب نے دو شخصوں کے لئے مسہل[8] تجویز کیا، اور دونوں کو طریقہ مسہل لینے کا اور شرائط مسہل کے مفید ہونے کے بتائے، ان میں سے ایک نے تو مسہل کو ان شرائط کے ساتھ استعمال کیا، اس کو خاطر خواہ نفع ہوا، اور دوسرے نے بغیر شرائط کے استعمال کیا، ظاہر ہے کہ اس کو نفع نہ ہوگا، بلکہ عجب نہیں کہ نقصان پہنچ جائے، یہاں کیا بات ہے! ظاہر ہے کہ طبیب نے تو دونوں کے لئے نفع کے واسطے مسہل تجویز کیا تھا، لیکن ایک کو طبیب کی تجویز نافع ہوئی اور دوسرے کو نافع نہ ہوئی، وجہ کیا ہے! یہی کہ نفع مشروط بالشرائط[9] تھا إذا فات الشرط فات المشروط[10]، شرائط نہیں پائی گئیں نفع بھی نہیں ہوا، یہ نہیں کہا جاسکتا کہ طبیب کی تجویز مفید نہیں تھی، وہ تو مفید تھی چنانچہ دوسرے کو نفع ہوا اور اس کو جو نفع نہیں ہوا تو بوجہ شرائط موجود نہ ہونے کے نہ ہوا، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ اثر کے لئے صرف شیء نافع کا وجود کافی نہیں، بلکہ وجود مع

---

[1]: خصوصیت۔ [2]: نفع اٹھانے۔ [3]: اس سے نفع اٹھانے کی شرط وہ ہے جو آیت میں بیان کی گئی ہے۔ [4]: یہ مؤمنین کے لئے نصیحت ہے (سورۂ اعراف، ۲) [5]: دیکھنے والوں کے لئے عبرت کا سامان ہے۔ [6]: جو نصیحت حاصل کرنا چاہے۔ [7]: اس میں عبرت ہے اس شخص کے لئے جو خدا سے ڈرتا ہو۔ [8]: پیٹ صاف کرنے کی دوا۔ [9]: فائدہ کے لئے شرطوں کا پایا جانا ضروری ہے۔ [10]: جب شرط ہی نہ پوری ہوئی تو کام بھی نہ ہوا۔

الشــرائط[۱] ہونا چاہئے، ادنی سے اعلیٰ تک ہر کام میں یہی بات ہے کہ اثر کے لئے کچھ شرائط ہوتی ہیں کہ بدون ان کے اثر مترتب نہیں ہوتا۔

قرآن پڑھنے کا اثر کیوں نہیں ہوتا

اب لوگ قرآن پڑھتے ہیں مگر اثر نہیں ہوتا یا کم ہوتا ہے، پھر خیالات پیدا ہوتے ہیں کہ اثر نہیں ہوا، نہ معلوم کیا بات ہے!؟۔ صاحبو! قرآن میں کمی نہیں، ہم میں کمی ہے، بھلا یہ ممکن ہے کہ قرآن سی چیز سے اثر نہ ہو۔ حق تعالیٰ فرماتے ہیں:۔

لو انزلنا هذا القرآن علی جبل لرایته خاشعا متصدعا من خشیة الله۔ (الحشر،۲۱)

''یعنی اگر اس قرآن کو پہاڑ پر اتارتے تو وہ پاش پاش اور ریزہ ریزہ ہو جاتا، خدا کے خوف سے''۔

تعجب ہے کہ پہاڑ جیسی سخت چیز قرآن سے متاثر ہو، اور ریزہ ریزہ ہو جائے، اور انسان جیسی نرم چیز متاثر نہ ہو، گو دونوں جگہ اثر حسبِ اقتضائے حکمت مختلف[۲] ہو، مثلاً انسان چونکہ مکلّف ہے، اس لئے اس میں تصدع[۳] غالباً اس لئے خلاف حکمت ہے کہ پھر مکلّف بہ یعنی قرآن کا نزول عبث[۴] ٹھہرتا ہے کہ عامل ہی مفقود[۵] ہو جائے گا، اس لئے اس میں اثر صرف خشوع کافی ہوگا، اور احیاناً تصدع و زہوقِ روح[۶] ہو جانا اس لئے خلاف حکمت نہیں کہ اس سے مکلّف بہ کا عبث ہونا لازم نہیں آتا، کیونکہ دوسرے مکلفین[۷] تو موجود ہیں، غرض انسان میں خشوع تو عام ہے، مگر یہ بھی نہیں، جس کی وجہ دوسری جگہ خود ہی فرماتے ہیں:۔

افلا یتدبرون القرآن ام علی قلوب اقفالها۔ (سورۃ محمد،۲۴)

''یعنی قرآن کو کیوں غور سے نہیں دیکھتے بلکہ دلوں پر قفل لگے ہوئے ہیں''۔

یہی بات ہے کہ قرآن کی آیتوں میں تدبر نہیں کیا جاتا اور دلوں پر قفل[۸] لگے ہوئے ہیں، جن لوگوں نے تدبّر[۹] سے قرآن کو دیکھا، خواہ موافقین نے یا مخالفین نے تو اثر ہوئے بغیر نہیں رہا، کیسے کیسے پتھر موم ہوگئے، کیسے کیسے معاندوں[۱۰] نے گردن جھکادی، اس سے تاریخ بھری پڑی ہے، کسی

۱:۔ شرائط کے ساتھ پایا جانا۔ ۲:۔ اگرچہ حکمت کی وجہ سے اثر علیحدہ علیحدہ ہو۔ ۳:۔ ریزہ ریزہ۔ ۴:۔ بے کار۔ ۵:۔ عمل کرنے والا ہی ختم ہو جائے گا۔ ۶:۔ کبھی کبھار دل پھٹ کر روح نکل جانا (یعنی کبھی کبھار قرآن سننے سے دل پھٹ جاتا اور موت واقع ہو جاتی ہے)۔ ۷:۔ دوسرے انسان۔ ۸:۔ تالے۔ ۹:۔ غور وفکر ۱۰:۔ مخالفین۔

زمانہ میں قرآن میں یہ اثر تھا کہ معاندین اس کے سامنے پانی ہوتے تھے،، اس واسطے اس کے سننے سے بچتے تھے کہ ہمارے اوپر اثر نہ ہو جائے، اور اب لوگوں کو جو اس پر ایمان کے مدعی ہیں، اور جو اس کو پڑھتے ہیں، شکایت ہے کہ اثر نہیں ہوتا، اس کی وجہ یہی ہے کہ قرآن کو پڑھتے ہیں، مگر تدبّر کے ساتھ نہیں پڑھتے، صرف الفاظ پڑھ لیتے ہیں۔

تلاوت قرآن کو بے کار سمجھنا غلط ہے

اور یہ بھی ان کا ذکر ہے جو الفاظ کو پڑھ لیتے ہیں، ورنہ اب تو دماغوں میں یہ خبط بھی پیدا ہو گیا ہے کہ قرآن کے الفاظ کو پڑھنے سے کیا فائدہ، جتنا وقت اس میں صرف کیا جائے اتنے وقت میں کوئی ڈگری کیوں نہ حاصل کی جائے، اور تدبر و عمل کو جو ہم شرط نفع کی کہہ رہے ہیں، یہاں نفع سے خاص نفع یعنی اثر مراد ہے، اور مطلق نفع کی نفی نہیں، مثلاً ہر حرف پر دس نیکیاں ملنا حدیث میں آیا ہے، اس میں یہ شرط نہیں، اور یہ لوگ حسنات[1] ہی کو لاشیء محض[2] سمجھتے ہیں، پس ہمارا مقصود اور ہے، ان کا اور۔ خلاصہ یہ کہ بہت سے مسلمان تو قرآن پڑھتے ہی نہیں، اور جو پڑھتے بھی ہیں تو تدبّر کے ساتھ نہیں پڑھتے، جس پر بروئے آیتِ مذکورہ نفع حاصل ہونا موقوف ہے، تو پھر شکایت عدمِ نفع کی کیسی؟، مسلمانوں کو تو قرآن سے لگاؤ ہی نہیں رہا، اور اس کے ساتھ یہ جہل مرکّب[3] ہے کہ قرآن سے نفع نہیں ہوتا، قرآن سے نفع کیسے ہو، جب تم اس سے لگاؤ بھی نہیں رکھتے۔

قرآن سے لگاؤ نہ رہنے کا مطلب

اس سے تعجب ہوگا کہ مسلمانوں کو قرآن سے لگاؤ نہیں رہا، کیونکہ قرآن کیسے کیسے عمدہ چھپے ہوئے گھروں میں ہیں، تلاوت بھی کی جاتی ہے، پھر یہ کیسے کہا جائے کہ قرآن سے لگاؤ نہیں رہا، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن سے مراد میری صرف لکھا ہوا قرآن نہیں ہے، جس کی تلاوت کی جاتی ہے، بلکہ میری مراد قرآن سے وہ چیز ہے جس کے واسطے قرآن اترا ہے، جس کے لئے ایک جامع لفظ دین ہے، جس کے بہت سے اجزاء ہیں، جیسے عقائد، اعمال، معاشرات، معاملات، اخلاق، یہ سب وہ اجزاء ہیں جن کے مجموعہ کو دین کہتے ہیں، تصوّف بھی انہیں اجزاء میں داخل ہے، کیونکہ تصوّف کی تعریف گیروا کپڑے پہن لینا، تعویذ، گنڈے کرنا یا کشف و کرامات نہیں ہے، بلکہ تصوف کی تعریف ہے:۔ ''تعمیر الظاهر و الباطن''[4] اس تعریف کی بناء پر اس کا دین ہونا ظاہر ہے۔

---

[1]:۔ نیکیوں۔ [2]:۔ یعنی بالکل کچھ نہیں سمجھتے۔ [3]:۔ دگنی جہالت۔ [4]:۔ ظاہری و باطنی اعمال کی اصلاح

دین کا ہر جز وقرآن میں داخل ہے

غرض دین ایک جامع لفظ ہے، اس کے جس جز کو لیجئے وہ قرآن ہی میں داخل ہے، حقیقت سب کی واحد ہے اور صورتیں مختلف، کسی لباس میں نام اس کا ''قرآن'' ہے، اور کسی لباس میں نام اس کا ''حدیث'' ہے، اور کسی لباس میں ''فقہ'' ہے ؎

عبارا تنا شتیٰ وحسنک واحد وکل إلی ذالک الجمال یشیر [۱]

کہیں وہ روشنی چاند کی سی دیتا ہے اور کہیں آفتاب کی سی، لیکن چاند کی روشنی بھی حقیقت میں آفتاب ہی کی روشنی ہے، اس کی ایک موٹی مثال یہ ہے کہ ایک عاشق کسی محبوب کا دلدادہ ہے، اس کے سامنے وہ محبوب ایک لباس میں آتا ہے تو اگر اس کو سچی محبت ہو تو اس کو پہچان لیتا ہے، اور دوسرے لباس میں آتا ہے تب بھی اس کو پہچان لیتا ہے، اور تیسرے لباس میں آتا ہے تب بھی پہچان لیتا ہے، اور کہتا ہے۔

؎ بہر رنگے کہ خواہی جامہ می پوش من از رفتار پایت می شناسم [۲]

جنہوں نے حقیقت قرآن کی سمجھ لی، وہ حدیث میں بھی قرآن ہی پاتے ہیں، اور فقہ میں بھی قرآن ہی پاتے ہیں، جو کام کرتے ہیں وہ قرآن کے موافق، اور جو فتویٰ دیتے ہیں وہ قرآن کے موافق، اور جو فیصلہ کرتے ہیں وہ قرآن کے موافق کہلائے گا، مثلاً یہ واقعہ ہوا کہ کسی نے زنا کیا اور وہ محصن ہے، اور اس پر باقاعدہ زنا کا ثبوت ہو گیا، تو اس میں کسی عالم نے حدیث کے موافق فیصلہ کیا اور رجم کر دیا، تو اگرچہ رجم کا حکم قرآن میں نہیں ہے لیکن اس فیصلہ کو بھی قرآن ہی کا فیصلہ کہیں گے، اس واسطے کہ خود قرآن میں حدیث کو واجب الاطاعت قرار دیا ہے، تو حدیث کی تعمیل قرآن کی تعمیل ہوئی، غرض قرآن میں دین کے کل اجزاء موجود ہیں، لیکن بعض تصریحاً اور بعض ضمناً اور بعض التزاماً، جیسے یہی رجم کا حکم کہ یہ حدیث سے ثابت ہے، اور حدیث کی حُجیت [۳] قرآن سے ثابت ہے، تو بواسطہ رجم کا حکم قرآن ہی میں موجود ہوا، زائد [۴] سے زائد یہ کہ اس کو بلاواسطہ نہ کہا جائے گا، بواسطہ کہا جائے گا، تو اس طرح سے کل دین قرآن ہی ہوا، گو اس کے اجزاء میں تفاوت ہو گا کہ اس کے

---

[۱]: ہماری تعبیریں مختلف ہیں مگر آپ کا حسن ایک ہے۔ اور سب عبارتوں کا رخ ایک ہی حسن کی جانب ہے۔ [۲]: جس رنگ کا چاہے لباس پہن کر آجاؤ میں تمہارے پاؤں کی رفتار سے تمہیں پہچان لوں گا۔ [۳]: حدیث کا شرعی دلیل ہونا۔ [۴]: زیادہ سے زیادہ۔

بعض اجزاء ایسے ظاہر ہیں کہ ہر شخص سمجھ سکتا ہے، اور بعض اجزاء ایسے ہیں کہ ان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں بیان فرمایا، اور بعض اجزاء ایسے ہیں جن کو حدیث سے بھی ہر شخص نہیں سمجھ سکتا ، ان کو مجتہدین اور علماء نے سمجھا، تو سب اجزاء دین کے بلا واسطہ یا بواسطہ داخل قرآن ہیں، اس واسطے میں نے شروع میں (تقریبا اس مقام سے چار پانچ صفحے قبل[1] جہاں یہ عبارت ہے کہ من حیث القصہ نہیں ہے بلکہ بحیثیت قصہ کے جزو قرآن ہونے کے) یہ کہا تھا کہ اس آیت میں قرآن سے یعنی دین سے منتفع[2] ہونے کی شرائط حق تعالیٰ نے بیان فرمائی ہیں، مطلب یہ ہے کہ **ذلک** کا مشار الیہ گو خاص توجیہ کی بناء پر ظاہراً قرآن ہے، مگر درحقیقت تمام دین ہے، ایک متفق علیہ حدیث میں اس اطلاق کی تائید بھی ہے کہ ایک مقدمہ میں حضور اقدس ﷺ سے درخوست کی گئی:۔

”اقض بيننا بكتاب الله“[3] اور آپ نے ارشاد فرمایا:۔ **”لأقضين بينكما بكتاب الله“**[4]، اس کے بعد جو فیصلہ فرمایا گیا ہے:۔ **”اما غنمك وجاريتك فرد عليك، واما ابنك فعليه جلد تام وتغريب عام، واما انت يا انيس! فاغد إلى امراة هذا، فان اعترفت فارجمها“**[5]۔ الحدیث.

اور ظاہر ہے کہ یہ سب تفصیل قرآن مجید میں کہاں ہے، پس لامحالہ یہاں کتاب اللہ سے دین ہی مراد ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ مسلمانوں کا سلوک

حاصل یہ ہے کہ دین سے منتفع ہونے کے لئے یہ شرائط ہیں جو اس آیت میں بیان کی گئی ہیں، یہ تمہید ہوئی اب میں ان شرائط کو بیان کرتا ہوں، حق تعالیٰ نے ہم کو قرآن جیسی نعمت دی، لیکن مسلمانوں نے اس سے مختلف قسم کے کام لئے ، بعض لوگوں نے تو اس کو جلد بندھوا کر عمدہ جزودان میں لپیٹ کر طاق پر رکھدیا ، جس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ وہ طاقِ نسیان پر پہنچ جاتا ہے، جس کام کے لئے قرآن اترا تھا اس کا تو کیا ذکر کبھی کھول کر بھی دیکھنے کی نوبت نہیں آتی ، ہاں بس اونچے طاق پر عزت

---

[1]:۔ دیکھیں ص (۱۰) [2]:۔ نفع اٹھانے کی۔ [3]:۔ آپ اللہ کی کتاب سے ہمارے درمیان فیصلہ فرما دیجئے۔ [4]:۔ میں ضرور کتاب اللہ ہی سے فیصلہ کروں گا۔ [5]:۔ تمہاری بکریاں اور باندیاں تمہیں واپس کی جاتی ہیں۔ تمہارے بیٹے کو سو کوڑے اور ایک سال کی جلاوطنی کی سزادی جاتی ہے۔ اور اے انیس تم اس کی بیوی کے پاس جاؤ اگر وہ زنا کا اعتراف کرلے تو اسے رجم کردو۔ (حدیث)۔

کے ساتھ رکھا ہوا ہے اور اس کو قرآن کا بڑا احترام سمجھتے ہیں۔

وضاحت بذریعہ واقعہ

صاحبو! یہ احترام ایسا ہے جیسے کسی نے مہمان کا احترام کیا تھا، قصہ اس کا یہ ہے کہ ایک رئیس تھے انہوں نے اپنے بیٹے کو جہاں اور وصیتیں کی تھیں وہاں ایک یہ بھی وصیت کی تھی کہ بیٹا مہمان کا بڑا احترام کرنا، اس کو اونچی جگہ بٹھلانا، اور اس کے سامنے بھاری کپڑا پہن کر آنا، اور اس سے نرم اور میٹھی باتیں کرنا، اور اس کو قیمتی کھانا کھلانا، بیٹے عقل کے پورے[۱] تھے، باپ کی وصیتوں کو لفظ بہ لفظ یاد کیا، مطلب خاک بھی نہ سمجھے، لیکن الفاظ خوب رٹے، اتفاق سے باوا جان کے ایک خاص ملنے والے کمبختی کے مارے آگئے، ان کو دیکھتے ہی آپ گھر میں گھس گئے، اور وہاں سے نوکروں کو حکم بھیج دیا کہ ان کو لے جاکر مچان[۲] پر بٹھادو، چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا، مہمان صاحب ہر چند بگڑے لیکن نوکروں نے ایک نہ سنی، اور زبردستی مچان پر بٹھا دیا کہ ہمارے میاں کا یہی حکم ہے، تھوڑی دیر کے بعد گھر میں سے میاں اس ہیئت سے تشریف لائے کہ لنگی کی جگہ تو ایک بہت موٹی شطرنجی لپیٹے ہوئے، اور کرتہ کی جگہ ایک بہت بھاری قالین اوڑھے ہوئے، غرض آپ بغلول سے بن کر بیٹھ گئے، بیچارے مہمان نے وہیں مچان سے تعزیت کرنی شروع کی، آپ ہر بات کے جواب میں کبھی گڑ کہہ دیتے کبھی روئی، اب مہمان بہت پریشان کہ یا اللہ یہ کیا معاملہ ہے؟ پھر اس نے میاں صاحبزادے کی خوشامد کی کہ بھائی مجھے تم یہاں سے اتار دو، خیر اتارے گئے، تھوڑی دیر کے بعد کھانا لایا گیا، وہ انہوں نے کچھ کھایا، ایک بوٹی کو توڑنے لگے تو وہ بالکل گلی نہیں تھی، کہنے لگے یہ کیسا گوشت ہے، تو صاحبزادے فرماتے ہیں: واہ صاحب کھانے کی اچھی قدر کی، میں نے تو آپ کی خاطر پچاس روپے کا اپنا کتا ذبح کر دیا اور آپ کا منہ ہی سیدھا نہیں ہوتا۔

جب بہت پریشانی اور حیرت بڑھی تو مہمان نے پوچھا کہ آخر یہ تمہاری کیا حرکتیں ہیں؟ کہا میں نے ابا جان کی وصیت پر عمل کیا ہے، ابا جان کہہ مرے تھے کہ مہمان کا بہت احترام کرنا، اس کو اونچی جگہ بٹھلانا، اور اس کے سامنے بھاری کپڑے پہن کر آنا، اور اس سے نرم اور میٹھی باتیں کرنا، اور قیمتی کھانا کھلانا، میرے یہاں کوئی اونچی جگہ اس مچان سے زیادہ نہ تھی، اس واسطے اس پر جناب کو بٹھلایا گیا، میں جو آپ کو دیکھ کر جلدی سے گھر میں چلا گیا تھا یہ اس واسطے تھا کہ بھاری کپڑے پہن

---

[۱]: یعنی عقل سے کورے تھے۔ [۲]: وہ تختہ یا لکڑی جو دیوار میں اسباب وغیرہ رکھنے کے لئے اونچی جگہ لگائی جاتی ہے۔ (فیروز اللغات ص ۱۲۰۸)۔

لوں، اس وقت اس شطرنجی اور قالین سے زیادہ بھاری کوئی کپڑا میرے گھر میں نہ تھا اس واسطے ان کو پہن لیا، اور ابا جان نے کہا تھا کہ مہمان سے میٹھی اور نرم باتیں کرنا، تو روئی سے زیادہ نرم اور گڑ سے سے زیادہ میٹھی کوئی چیز نہیں، اس واسطے میں انہیں دونوں کا نام زبان سے لیتا رہا، اور قیمتی کھانا اس کے سوا کوئی میری سمجھ میں نہ آیا کہ اپنا پچاس روپیہ کا کتا ذبح کر کے آپ کو کھلا دوں، کیونکہ اس سے زیادہ قیمتی کھانا میرے پاس نہ تھا، مہمان بولا: میاں صاحبزادے جیتے رہو، باپ کی وصیت کو خوب سمجھا اور اس پر خوب عمل کیا، اور لاحول پڑھ کر چلتے ہوئے۔ صاحبو! یہ حکایت تو ایک احمق کی ہے جس پر ہم سب ہنستے ہیں، لیکن اپنی حالت بھی اس سے کچھ کم نہیں ہے، وہ کتاب جو مسلمانوں کے لئے دین کا معیار ہے اور جس کا ادب واحترام کرنا ہر مسلمان کے لئے فرض ہے، اس کا احترام ہم نے وہی کیا ہے جو اس احمق صاحبزادے نے مہمان کا کیا، اس نے مہمان کو اونچے پر بٹھلا دیا، ہم نے اس کتاب کو اونچے طاق پر رکھدیا اور سمجھ لیا کہ کتاب کا احترام ہو گیا، میں یہ نہیں کہتا کہ یہ احترام نہیں ہے قرآن کو اونچی جگہ ہی پر رکھو، لیکن اونچی جگہ رکھ کر فارغ تو نہ ہو جاؤ، اس کا حق کچھ اور بھی ہے، وہ ادا کرو وہ حق یہ ہے کہ اس کی تلاوت کرو، اس کے مطالب کو سمجھو اس کے احکام پر عمل کرو، نہ یہ کہ بس اٹھا کر ادب سے طاق پر رکھدو۔

قرآن سے فال نکالنے کا دھندا

اور بعض نے قرآن سے بس محض یہ کام لیا کہ فال نکال لی، یا بچہ کا نام نکال لیا، اور یہ کام میانجی اور پیر جی لوگ کیا کرتے ہیں، محلّہ میں کہیں بچہ پیدا ہوا تو وہاں سے فرمائش آتی ہے کہ قرآن میں اس بچہ کا نام نکال دیجیے، انہوں نے قرآن کھولا اگر پہلا حرف الف نکلا تو کہہ دیا کہ اللہ بخش نام نکلا، اس طرح میم نکلی تو معین الدین، خ نکلی تو خدا بخش، لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ بڑا متبرک ہے کیونکہ قرآن سے نکلا ہے، حالانکہ یہ محض پیٹ کا دھندا ہے اور کچھ بھی نہیں، صاحبو! یہ کیا جہالت ہے، اور لیجئے بعض لوگوں نے قرآن سے یہ کام لیا کہ جب کہیں موت ہوئی تو تیجے میں قرآن خوانی کرادی، اور الٹا سیدھا ثواب بخش دیا، اس کو تو بہت ہی بڑا کام سمجھا جاتا ہے، اس کے متعلق کچھ کہا جاتا ہے تو لڑائیاں ہوتی ہیں، فتوے لگتے ہیں، رسالہ بازیاں ہوتی ہیں، اس کے متعلق بھی میں اس وقت صرف یہی کہتا ہوں کہ اس پر حصر[1] کیوں کرتے ہو؟ اس کو کر کے یہ کیوں سمجھ لیتے ہو کہ بس ہم نے قرآن کا حق

---

[1]: ۔ اکتفاء، بس

ادا کر دیا الٹا سیدھا، اس واسطے کہا کہ گو ایصال ثواب کرنے سے ثواب پہنچتا ہے، اس سے انکار نہیں مگر اس کے واسطے کچھ شرائط بھی تو ہیں، وہ شرائط متعارف قرآن خوانی میں نہیں پائی جاتیں، اس واسطے اس میں کلام ہوسکتا ہے کہ اس طرح قرآن خوانی کرانے سے ثواب پہنچتا بھی ہے یا نہیں، خبروں کی تفصیل کا یہ موقع نہیں، یہ بحث دوسری جگہ موجود ہے۔

قرآن کو چادر میں رکھ کر نیچے سے بچہ گذارنے کی رسم

اور سنئے بعض نے قرآن سے یہ کام لیا کہ چادر میں رکھ کر دو آدمیوں نے دونوں طرف سے پکڑ کر بچہ کو اس کے نیچے سے نکال دیا، اور کہتے ہیں کہ اس سے حفاظت ہوتی ہے اور بچہ بلاؤں سے محفوظ رہتا ہے، جی ہاں تمہاری اس ہوا ہی کے لئے تو قرآن نازل ہوا تھا، مجھے اس سے انکار نہیں کہ قرآن کی ہوا میں بھی برکت ہے، مگر سوال یہ ہے کہ کیا قرآن بس اس واسطے نازل ہوا تھا؟ یہ تو ایسا ہے جیسے دوشالہ[۱] اسے غرض تو یہ ہے کہ اس کو اوڑھا جائے مگر کسی گنوار نے کیا کیا کہ باوجود اس کے کہ جنگل سے لکڑی ایندھن لا کر جلا سکتا تھا مگر اس نے دوشالہ جلا کر اس اوپر کھچڑی پکائی، تو اس طرح اس بیوقوف نے دوشالہ کو برباد کیا ہاں یہ منفعت ضرور ہوئی کہ کھچڑی پک گئی، مگر کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ اس نے اچھا کیا!، اس پر یہی اعتراض تو ہے کہ اس نے دوشالہ سے یہ کام لے کر اس کے اصلی منافع تلف کر دئے، کیونکہ کھچڑی پکانا تو لکڑی ایندھن سے بھی ہوسکتا تھا اس کو عقلا حق تلفی کہیں گے کیونکہ جس کام کے لئے دوشالہ موضوع[۲] تھا اس سے وہ کام نہیں لیا گیا، بس اس طرح قرآن سے ایسے کام لینا جیسے ابھی بیان کئے گئے ہیں، قرآن کی حق تلفی ہے، وہ کام تو اور چیزوں سے بھی نکل سکتے ہیں، قرآن سے ایسے کام لینا ایسا ہی ہے جیسے ایندھن ہوتے ہوئے دوشالہ کو جلا کر کھچڑی پکانا۔

قرآن سے تعویذ گنڈے

اور بعض نے قرآن شریف سے یہ کام لیا کہ تعویذ گنڈے شروع کر دئے، اور یہ تو ایسا بڑا کام سمجھا جاتا ہے کہ آجکل بزرگی اور ولایت کا معیار یہی ہے، کہا جاتا ہے کہ فلاں بڑے بزرگ ہیں، ان کے تعویذ حکمی اثر رکھتے ہیں، میں اس کے متعلق بھی یہی کہتا ہوں کہ قرآن سے کبھی کبھی یہ کام بھی لیا جائے تو مضائقہ نہیں مگر اس پر حصر کیوں کیا جاتا ہے یہ کیوں سمجھ لیا گیا ہے کہ بس قرآن اترا اسی واسطے

---

[۱]:۔ چادر۔ [۲]:۔ چادر بنائی گئی تھی۔

قرآن کیوں نازل ہوا

خود قرآن سے پوچھو کہ وہ اپنے نزول کی غایت[1] کیا بیان کرتا ہے، قرآن میں ہے، کتاب انزلناہ إلیک مبارک لیدبروا اٰیٰته ولیتذکروا اولوا الالباب[2]، یعنی حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے ارشاد ہے کہ ''قرآن ایک کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اتارا ہے اور وہ برکت والی ہے، اور غرض اس کے اتارنے سے یہ ہے کہ لوگ اس کی آیتوں کو تدبّر سے پڑھیں، اور اہل عقل اس سے نصیحت حاصل کریں''۔ لیجئے جو کام ہم لوگ آج کل قرآن سے لیتے ہیں ان کا کہیں بھی ذکر نہیں، نہ فال نکالنے کا، نہ نام نکالنے کا، نہ بچہ کو ہوا دینے کا، نہ تعویذ لکھنے کا، مگر افسوس ہم نے یہ حشر کیا ہے قرآن کا کہ اس سے وہ کام تو لیتے ہیں جس کے واسطے وہ نہیں اتارا گیا، اور وہ کام نہیں لیتے جس کے لئے وہ اتارا گیا ہے، اور یہ میں پہلے ہی کہہ آیا ہوں کہ قرآن سے مراد میری خاص یہی کتاب نہیں ہے جس کی تلاوت کی جاتی ہے، بلکہ مجموعہ دین مراد ہے، جس میں فقہ اور حدیث سب داخل ہے، جس کی مختصر تعبیر دین ہے، تو حاصل یہ ہوا کہ دین کی ہر بات کو ہم نے ایسے طریق سے استعمال کیا ہے کہ وہ طریق ہی اس کے استعمال کا نہیں ہے، اس واسطے ہم کو اس سے کچھ نفع نہیں ہوتا، بس اس وقت وہی طریق اور نفع کی شرط بیان کرنا مقصود ہے، اور اس کا بیان اس آیت میں ہے جو تلاوت کی گئی، کوئی اس شرط کے ساتھ استعمال کرے گا اس کو تو نفع ہوگا، اور جو اس شرط کے ساتھ استعمال نہ کرے گا اس کو نفع نہ ہوگا۔

آیات قرآنی سے تعویذ دینے کا حکم

میرے بیان سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھ لیں کہ میں تعویذ یا عملیات کو منع کرتا ہوں، اگر ان کے واسطے بھی آیات قرآنی کو کبھی کام میں لایا جائے تو مضائقہ نہیں، مگر لوگوں کی حالت مختلف ہے، ایک تو وہ شخص ہے کہ قرآن پڑھتا ہے اور اس کے موافق عمل بھی کرتا ہے، تمام احکام کو بجالانے کی کوشش کرتا ہے، اور کبھی عند الحاجۃ[3] رُقیہ[4] کے طور پر بھی آیات سے کام لے لیتا ہے، اس میں مضائقہ نہیں، اور ایک وہ شخص ہے کہ قرآن سے سوائے تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کے کوئی کام ہی نہیں لیتا، نہ عقائد ٹھیک ہیں نہ اعمال ٹھیک ہیں نہ صورت شریعت کے موافق ہے نہ سیرت، اس کو یہی کہا جائے گا کہ

---

[1]: ۔مقصد [2]: ۔ یہ قرآن ایک بابرکت کتاب ہے جس کو ہم نے آپ پر اس لئے نازل کیا کہ لوگ اس کی آیتوں میں غور کریں اور عقل والے اس سے نصیحت حاصل کریں۔ (سورہ ص، ۲۹) [3]: ۔ضرورت کے وقت۔ [4]: ۔تعویذ۔

تجھے ہرگز حق نہیں قرآن کو اس کام میں لانے کا تو قرآن کا حق تلف کرتا ہے۔

اس کو اس مثال سے سمجھئے کہ دوشالہ موضوع تو ہے اوڑھنے ہی کے لئے، لیکن جو شخص ہمیشہ تو اس کو اوڑھتا ہی ہے لیکن کبھی ضرورت پڑی تو اس نے اس کو پردہ کی جگہ بھی ٹانک دیا، تو اس پر کوئی اعتراض نہیں کیا جائے گا، اور ایک شخص ہے کہ دوشالہ کو ہمیشہ شطرنجی[۱] ہی کی جگہ بچھاتا ہے، یا ہمیشہ سائبان ہی کا کام اس سے لیتا ہے تو اس کو ضرور بیوقوف کہا جائے گا، غرض قرآن کو اگر کبھی کبھی تعویذ کے لئے یا برکت کے لئے بھی کام میں لایا جائے تو مضائقہ نہیں، مگر صرف اس کو مقصود قرآن کا نہ سمجھیں۔

تعویذ دینے میں میرا طرز عمل

مجھ سے اگر کوئی تعویذ مانگتا ہے تو میں دیکھ لیتا ہوں کہ اس شخص کو تعویذ دینے سے اس خیال فاسد کی تائید تو نہ ہوگی کہ قرآن کا مقصود محض یہی ہے، اگر قرائن سے معلوم ہوا کہ تائید ہوگی، تو اس شخص کو میں تعویذ نہیں دیتا، اور اگر معلوم ہو کہ وہ آدمی سمجھدار ہے، اور یہ اثر اس پر نہ ہوگا تب دے دیتا ہوں۔

میں یہ کہہ رہا تھا کہ قرآن کے ساتھ جو برتاؤ ہم کو کرنا چاہئے تھا وہ ہم نہیں کرتے، اس واسطے جو نفع تھا قرآن کا وہ ہم کو حاصل نہیں ہوتا، یہی بیان اس آیت میں ہے کہ قرآن سے انتفاع کے لئے ایک خاص طریق ہے، اور یہ میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ یہ محض حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس طریق کو خود بیان فرمادیا، ورنہ یہ بات تو ہمارے پوچھنے کی تھی، قرآن کا اتارنا حق تعالیٰ کا کام تھا اور اس سے انتفاع کا طریقہ ہم کو پوچھنا چاہئے تھا۔

گناہ کے علم نہ ہونے کا عذر معتبر نہیں

مگر پوچھتے تو کیا؟ بتانے پر بھی سن لیں تو غنیمت ہے، چنانچہ یہی واقع ہورہا ہے، دیکھا جاتا ہے کہ بعض لوگ وعظ کو صرف اس خوف سے نہیں سنتے کہ اس کے موافق عمل کرنا پڑے گا، کیوں خواہ مخواہ اپنے سر بلا لی، کوئی پوچھے کہ کیا اس صورت میں یہ عذر آپ کا چل جائے گا کہ ہم نے وعظ نہیں سنا تھا؟ ہمیں گناہوں کا گناہ ہونا معلوم ہی نہیں ہوا تھا اس واسطے گناہ کرتے رہے؟، کیوں صاحب!

---

[۱]۔ دری، فرش

آپ ایک قتل کر دیں تو کیا عدالت میں یہ کہہ کر چھوٹ جائیں گے کہ میں نے قتل کی ممانعت کا قانون نہیں سنا تھا؟ یا یہ عذر کریں کہ لوگ مجھ کو ممانعت سناتے رہے مگر میں نے سنی نہیں تھی؟ بلکہ یہ تو دوہرا جرم ہوگا کہ سننے سے بھی انکار کیا، اس طرح وعظ سننے کے خوف سے اوامر[1] حق تعالیٰ کے ساقط نہیں ہو جائیں گے، یہ محض حیلہ ہے نفس کا، اور سستی وغفلت ہے، اور دین سے بُعد[2] ہے۔

ایک خطرناک غلط فہمی

ذمہ تو آپ کے یہ تھا کہ طریقہ انتفاع کا خود پوچھتے، مگر اس کی امید کسی طرح نہ تھی اس واسطے حق تعالیٰ نے اس کو خود ہی بیان فرمادیا، اگر آپ بیان کرنے پر سن ہی لیں تو غنیمت ہے، عجیب بات ہے کہ دین کے بارے میں جو کچھ بتلایا جاتا ہے بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کے احسان مند ہوں، الٹا اس کے سننے کا احسان رکھتے ہیں، اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ دین خدا تعالیٰ کے فائدہ کا کام ہے، اس کو پورا کرنا یا اس کے متعلق کچھ کہنا سننا یہ سب ہماری طرف سے تبرع ہے، اور اس غلطی میں صرف عوام ہی مبتلا نہیں بلکہ خواص بھی مبتلا ہیں، عوام تو خیر عوام ہی ہیں زیادہ تعجب خواص سے ہے کہ اگر کوئی کام کرتے ہیں یا کسی بات کا ان کو علم ہوتا ہے تو یہ نہیں سمجھتے کہ حق تعالیٰ نے ہم کو توفیق اس عمل کی دی یا ہم کو علم دیا، ٹٹول کر دیکھ لیں کہ عمل یا علم کے بعد طبیعتوں میں ایک قسم کا ناز پیدا ہوتا ہے کہ ہم نے ایک کام کیا اور اپنا کام نہیں بلکہ حق تعالیٰ کا کام کیا یا علم کی وجہ سے حق تعالیٰ کے مقرب ہو گئے۔

غلط فہمی کی وجہ اور اس کا جواب

خواص میں اس غلطی کا منشاء ایک دھوکہ ہے، وہ یہ ہے کہ بعض نصوص میں اس قسم کے الفاظ ہیں، جزاء بما كانوا يعملون[3] اور اورثتموها بما كنتم تعملون[4]، جن میں عمل کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے اور اس پر جزاء کو مترتب کیا گیا ہے تو اس سے ان کو یہ غلط فہمی ہوئی کہ اس حالت میں اگر ہم بھی عمل کو اپنی طرف منسوب سمجھیں اور اپنے کو جزاء کا مستحق سمجھیں تو کیا بے جا ہے،

میں اہل علم کو مخاطب کر کے کہتا ہوں کہ عمل کی نسبت کسی درجہ میں آپ کی طرف ضرور ہو سکتی ہے، لیکن اس کے اسباب کا مہیا ہونا یا موانع کا رفع ہونا آپ کے اختیار سے ہوا یا کسی اور کے اختیار

---

[1]:۔احکام۔ [2]:۔دوری۔ [3]:۔یہ ان کو ان کے اعمال کا صلہ ملا ہے۔ (السجدة، ۱۷) [4]:۔یہ وہ جنت ہے جس کے تم مالک بنا دیئے گئے اپنے اعمال کے عوض میں۔ (الزخرف، ۷۲)

سے، یہ کوئی نہیں کہہ سکتا کہ یہ آپ کے اختیار سے ہوا، مثلاً نماز پڑھی یہ عمل آپ نے کیا آپ کو مصلّی کہہ سکتے ہیں، لیکن نماز ہاتھ پیر سے پڑھی جاتی ہے، ہاتھ پیر میں قوت کہاں سے آئی؟ کیا وہ بھی آپ ہی نے پیدا کی یا کوئی مانع پیش نہ آیا، کیا کسی مانع کا پیش نہ آنا بھی آپ ہی کی قوت سے ہوا؟، ہرگز نہیں، یہ سب دوسرے کے عطایا ہیں، پھر جب نماز ہاتھ پیر پر موقوف ہے اور ان کا کام دینا مانع نہ ہونے پر موقوف ہے، اور یہ سب دوسرے کے کام ہیں آپ کے اختیار میں نہیں، تو نتیجہ تو وہی نکلا کہ عمل آپ کے اختیار میں نہیں، اب جو نسبت عمل کی آپ کی طرف کی جائے تو وہ محض آپ کے دل خوش کرنے اور ہمت بندھانے کے لئے ہے اور غایت درجہ کی شفقت اور کرم ہے اس کی قدر اور اس پر شکر کرنا چاہئے نہ کہ دعویٰ اور فخر کیا جائے، دیکھئے بعض طبیب کسی جاہل آدمی سے جس سے خاص تعلق ہو یا کسی ایسے بچے سے جس سے تعلق ہو از روئے ترحم[1] کہدیتا ہے کہ یہ دوا پی لو، اور اس میں وہ حیلہ وحجت کرتا ہے، تو طبیب کہتا ہے کہ میرا کام سمجھ کر کرلو اور اپنے اوپر رحم نہ کرو، بلکہ میرے اوپر رحم کرو، تو کیا اس کہنے سے دوا کا پینا سچ مچ طبیب کا کام ہوگیا! جو کوئی ایسا سمجھے وہ دیوانہ ہے یا نہیں؟ اسی طرح اگر عمل کی نسبت آپ کی طرف کی گئی تو کیا وہ سچ مچ آپ ہی کا عمل ہوگیا؟ یہ صرف حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ اپنا احسان نہیں جتلانا چاہتے، اس واسطے عمل کو آپ کی طرف منسوب کردیا۔

اعمال مکمل طور پر ہماری قدرت میں نہیں

قیامت میں یہی ہوگا کہ اعمال کی جزا کہہ کر درجات دیئے جائیں گے ونودوا ان تلکم الجنة اورثتموها بما كنتم تعملون، یعنی ''ندا دی جائے گی کہ یہ جنت تم کو تمہارے اعمال کے بدلے دی جاتی ہے''، (سورۃ الزخرف آیت ۷۲)، اور حقیقت وہی ہے جو میں نے بیان کی کہ یہ سب کرم وفضل ہے کیونکہ ہمارے اعمال موقوف ہیں آلات پر اور آلات ہمارے اختیار میں نہیں، تو قاعدہ سے ہمارے اعمال بھی من کل الوجوہ[2] ہماری قدرت میں نہ ہوں گے، یہ بالکل ایسا ہے جیسے اپنے کسی غلام کو ایک چیز دینی ہے، مگر اپنا نام کرنا نہیں ہے اس واسطے پہلے اس کو ایک اشرفی دیدی، پھر کہدیا یہ چیز ہم سے ایک اشرفی کے بدلے خریدلو، اس نے خریدلی تو سچ بتائے کہ ضابطہ شرعیہ واقعیہ سے یہ چیز اس کی ہوئی یا دینے والے کی ہوئی، خریدا تو اس نے بیشک ہے لیکن وہ اشرفی جس سے اس نے خریدا ہے وہ کہاں سے آئی تھی، وہ تو اسی نے دی تھی تو درحقیقت یہ سب کچھ اسی کی عطا ہوئی اور وہ بھی تمہارے

---

[1]۔ شفقت کے طور پر [2]۔ مکمل طور پر۔

ہی نفع کے لئے، چنانچہ ذرا اوپر کی تقریر سے ظاہر ہے جہاں اس غلطی کا بیان کیا گیا ہے کہ بجائے اس کے کہ خدا تعالیٰ کے احسان مند ہوں، الٹا اپنا احسان رکھتے ہیں، مگر ر سوچو سیدھی سی بات ہے کہ عبادت اور عمل بالقرآن کس کے نفع کا کام ہے خدا کا یا تمہارا۔ بتایا ہوا تو بیشک خدا کا ہے مگر اس سے نفع تمہارا ہے، بلکہ اگر خدا تعالیٰ نے کسی کام کا حکم دیا تو ہمارے ذمہ بحیثیت بندہ ہونے کے اس کا امتثال[۱] بہر حال واجب ہے، خواہ ہمارا کچھ نفع ہو یا نہ ہو بلکہ نقصان ہو تب بھی واجب ہے، چہ جائے کہ اس پر اجر کا بھی وعدہ ہے، جب یہ ہے تو اس کے طریقہ کا پوچھنا بھی ضابطہ سے ہمارے ہی ذمہ واجب ہونا چاہئے تھا، لیکن ہماری لاپروائی سے یہ امید کہاں کی جاسکتی تھی کہ طریقے پوچھیں گے، لہٰذا از راہ کرم بلا ہمارے پوچھنے کے خود ہی طریقے بھی بتا دیئے اس کرم کی بہت قدر کرنا چاہئے۔

حقوق اللہ کا مطلب

میری اس تقریر سے اس کی حقیقت بھی سمجھ میں آ گئی ہوگی کہ بعض اعمال کو جو حقوق اللہ کہا گیا ہے اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ خدا کے ذاتی نفع کے کام ہیں، جن کو وہ اپنی کسی ضرورت سے تم سے لینا چاہتے ہیں، بلکہ اس کی حقیقت وہی ہے جو طبیب اور مریض کی مثال میں بیان کر چکا ہوں کہ بعض وقت طبیب کسی مریض سے خاص تعلق کی وجہ سے کہتا ہے کہ میرا کام سمجھ کر دوا پی لو، اسی طرح بعض اعمال کو حقوق اللہ کہہ دیا گیا ہے تا کہ ہم خدا ہی کا کام سمجھ کر ان کو کر لیں اور اس کی جزاء کے مستحق ہو جائیں، اب لوگ سمجھتے ہیں کہ ہم خدا کا کام کر رہے ہیں، بعض رات کو اٹھتے ہیں بارہ تسبیح کا ذکر کرتے ہیں، پھر دل میں ناز کرتے ہیں کہ ہم ذاکر ہیں، اور اپنی بزرگی کے خود ہی معتقد ہو جاتے ہیں، گویا خدا تعالیٰ پر احسان رکھتے ہیں۔

ارے بیوقوفو! تم خدا کا کام کرتے ہو یا اپنا اور اس میں بزرگی کی کیا بات ہے، اول تو یہ خدا کا کام نہیں تمہارا ہے، اگر ہو بھی تو تم نے کیا کیا؟ خدا ہی نے تو توفیق دی، اور اسباب مہیا کئے تب تم کام کر سکے، تو اس کی حقیقت وہی ہوئی یا نہیں، جو میں نے ابھی کہا کہ ایک شخص کسی کو کچھ دیتا ہے مگر دینے والا ایسا کریم ہے کہ اپنا نام کرنا اور احسان جتلانا نہیں چاہتا، اس واسطے پہلے اس کو ایک اشرفی دے دیتا ہے پھر کہتا ہے کہ اس اشرفی کی یہ چیز ہم سے خرید لو، کون عقلمند خریدار ہے جو اس خریداری کا احسان الٹا اس دینے والے پر رکھے، در حقیقت تو سب اس کا احسان و کرم ہے ایسے دینے والے پر تو

---

[۱]: پورا کرنا۔

قربان ہونا چاہئے۔

سچ یہ ہے کہ ہمارے دماغ بگڑ گئے ہیں، دین تو خود ہمارا کام تھا، نماز پڑھتے روزہ رکھتے تمام ارکان دین بجالاتے اوراحسان مانتے کیونکہ ہم کوان کا فائدہ ملنے والا ہے لیکن خیالات الٹے ہوگئے ہیں، نماز پڑھتے ہیں اوراس پر ناز کرتے ہیں اس کے معنے یہ ہوئے کہ یہ دوسرے کا کام ہے، جب ایسا مذاق خراب ہوا ہے تو عجب نہیں کہ دین کو بیکار اوراپنے ذمہ بار سمجھنے لگیں، پھر نتیجہ یہ ہوا کہ ان تمام ثمرات سے جواس پر موعود۱ ہیں، محروم رہیں اسی محرومی سے بچانے کے لئے بعض اعمال کو حق اللہ کہہ دیا گیا ہے کہ اپنا کام سمجھ کر نہیں کرتے تو خدا ہی کا کام سمجھ کر کرلو، گو یہ خلاف حقیقت ہے۔

بعض اعمال کو حق اللہ کہنے کی خاص وجہ

لیکن اس عنوان میں بھی ایک کام کی بات ہے، وہ یہ کہ قاعدہ ہے کہ جب کوئی کام کرتا ہے اوراس میں لگتا ہے تو کام خود فہم کو درست کرلیتا ہے، دیکھئے بچہ کو پڑھنے بٹھاتے ہیں تواس پر کس قدر گرانی ہوتی ہے اوروہ کسی طرح پڑھنے کے لئے آمادہ نہیں ہوتا، اگر مربی۲ یہ کہہ کراس کو چھوڑ دے کہ یہ کام تیرا ہی تو تھا تیرا دل نہیں لگتا تو جا بھاڑ میں، تواس کا نتیجہ یہ ہو کہ وہ ہمیشہ جاہل ہی رہے اس کو کوئی سمجھ دار اوراس کا بہی خواہ پسند نہیں کرتا، بلکہ بچہ کو خوشامد درآمد سے، زجر وتنبیہ۳ سے، لالچ سے، پیسے دے دے کر راہ پر لگاتے ہیں، پھر یہ ہوتا ہے کہ جب وہ الٹا سیدھا جس طرح بھی ہو پڑھنے میں لگ جاتا ہے تواس کی سمجھ خود درست ہوجاتی ہے، اسی معنی کر۴ کہا جاتا ہے کہ کام خود بخود فہم کو درست کرلیتا ہے بس اسی فائدہ کے لئے یہ کہا گیا کہ اگر تم دین کو اپنا کام نہیں سمجھتے اوراس سے تمہیں وحشت ہے تو اس کو خدا ہی کا کام سمجھ کر کرلو، جب کام میں لگ جاؤ گے تو کام تمہارے فہم کو خود درست کرلے گا، یہ وجہ ہے بعض اعمال کو حق اللہ کہنے کی۔

بہرحال کام میں لگانا چاہتے ہیں اوراس کے ثمرات دینا چاہتے ہیں، اس کی قدر کرنا چاہئے کہ باوجود بے نیازی کے کام بتانے کے ساتھ اس کا طریقہ بھی بتاتے ہیں، اگر کام ان ہی کے بتائے ہوئے طریقہ سے کیا جائے گا تو نفع یقینی اور بہت جلد ہوگا، اگر قرآن سے تعلیم ان طریقوں کے مطابق لی جائے جو قرآن نے بتائے ہیں تو ناممکن ہے کہ نفع نہ ہو، وہ طریقے کیا ہیں اس کو فرماتے ہیں اِن فی ذلک لذکری یعنی ”اس بیان میں (اس سے اوپر امم سابقہ۵ کے کفار کے اہلاک۶ کا ذکر ہے)

۱:۔جن کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ۲:۔تربیت کرنے والا۔ ۳:۔ڈانٹ ڈپٹ کر۔ ۴:۔اس معنی کے اعتبار سے (جاری ہے)

نصیحت ہے''، مگر کس کو جس میں دو باتیں ہوں، اور دو کا ذکر علی سبیل منع خلو۱ ہے، یعنی دونوں سے خالی نہ ہو خواہ دونوں جمع ہو جائیں، چنانچہ یہاں ہر واحد بھی کافی ہے اور دونوں کا اجتماع بھی ممکن ہے، اس پر دلائل مستقلہ۲ قائم ہیں (اس کا بیان بقدر ضرورت ختم وعظ کے قریب جہاں سے القی السمع کا بیان شروع ہوا، مذکور ہے۱۲)۔

لغت اور محاورہ میں فرق

وہ دو باتیں کیا ہیں ''لمن کان له قلب''، یعنی جس کے پاس قلب ہو ''او القی السمع وھو شھید''، یعنی کان کو متوجہ ہو کر لگا دے، ان دونوں لفظوں کا ترجمہ ذرا سا ہے، اور لفظ بھی چھوٹے چھوٹے ہیں، اس اختصار سے تعجب ہوگا کہ ذرا ذرا سی چیزیں ہیں اور ذرا سی بات ہے جس پر تمام دین کا نفع مبنی ہے۔

اس تعجب کا رفع۳ میں کئے دیتا ہوں، وہ یہ کہ سمجھ لیجئے کہ قرآن منطق کی اصطلاح میں نازل نہیں ہوا بلکہ سامعین کے محاورات میں نازل ہوا ہے، یہ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورہ میں ہے کہ یہ دل گردہ والے کا کام ہے، اس کے اگر لغوی معنی لئے جائیں تو کلام بلاغت سے بہت ہی گرا ہوا ہو جاتا ہے، بلکہ مفہوم ہی غلط ہو جاتا ہے، کیونکہ اس صورت میں تو یہ معنی ہو جائیں گے کہ جس کے جسم میں دل اور گردہ ہو وہ یہ کام کر سکتا ہے، سو دل اور گردہ تو ہر انسان کے جسم میں موجود ہیں تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہر انسان یہ کام کر سکتا ہے حالانکہ یہ جملہ بولا جاتا ہے ایسے موقع پر کہ اس کام کو ہر انسان نہ کر سکے، بات یہ ہے کہ لغت اور محاورہ میں فرق ہوتا ہے، وہ یہ کہ محاورہ میں لغوی معنی پر ایک زیادتی ہوتی ہے کہ وہ ہی مراد ہوتی ہے، مثلاً یہاں دل سے مراد لغوی دل نہیں بلکہ وہ دل مراد ہے جس میں صفات دل ہوں، اور دل کی صفت ہے ہمت، اور گردہ کی صفت ہے قوت، تو اس لفظ کے یہ معنی ہوئے کہ یہ کام وہ کر سکتا ہے جس میں ہمت اور قوت ہو، دیکھئے اب یہ لفظ کیسا بلیغ ہو گیا اور اس موقع پر کیسا چسپاں ہو گیا جسمیں یہ بولا جاتا ہے۔

(بقیہ صفحہ گذشتہ) ۵:۔ گذشتہ امتیں۔ ٦:۔ ہلاک ہونے۔

۱:۔ منع الخلو ایک منطقی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ بیک وقت دونوں چیزیں نہ اٹھ سکیں خواہ بیک وقت جمع ہو سکتی ہوں یا نہ۔ ۲:۔ مستقل دلائل۔ ۳:۔ دور

دوسری مثال یہ ہے کہ ایک حاکم کہتا ہے کہ ہمیں ایک آدمی کی ضرورت ہے اس کے لغوی معنی تو یہ ہیں کہ ایک ایسا شخص تلاش کیا جائے جس پر آدمی کا اطلاق ہو، یعنی حضرت آدمؑ کی اولاد ہو، اب کسی نے اس پر یہ عمل کیا کہ ایک ایسے انسان کو جونہایت درجہ بیمار اور اپاہج[1] ہے ڈولی میں ڈال کر لے آیا اور حاکم کے سامنے پیش کر دیا کہ لیجئے حضور آدمی حاضر ہے، حالانکہ اس میں کسی کام کے کرنے کی قوت تو در کنار حواس بھی پورے موجود نہیں، بس ایک مضغۂ گوشت[2] ہے، ہاں سانس چل رہا ہے، اب آپ ہی فرمایئے کہ کیا اس کے حکم پر عمل ہوگیا؟ لغۃً تو ہوگیا، کیونکہ آدمی کا اطلاق اس پر صادق آتا ہے، آخر وہ بھی اولاد آدم تو ہے ہی، اور از روئے منطق بھی وہ آدمی ہے، کیونکہ حیوان ناطق ہے اور ناطق کے معنی بولنے والا نہیں جیسا کہ عرف میں سمجھا جاتا ہے، بلکہ اس کے معنی ہیں ''مدرک کلیات وجزئیات''[3] جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں، یہ سب کچھ ہے لیکن اس حاکم کے سامنے ایسے مریض کا پیش کرنا امتثال امر[4] نہیں سمجھا جاتا، وجہ کیا ہے کہ جو اغراض آدمی کے متعلق ہیں جنکے واسطے حاکم آدمی مانگتا ہے وہ اس سے حاصل نہیں ہیں، حتی کہ اگر کمزور آدمی کو بھی پیش کیا جائے تو اس کو بھی وہ منظور نہیں کرے گا، کیونکہ وہ تو ایسے آدمی کو چاہتا ہے جو خدمت گزاری اچھی طرح کر سکے، اور یہ کام بہت ہٹے کٹے اور توانا وتندرست آدمی کا ہے، حاصل یہ ہے کہ جس کام کیلئے آدمی چاہیئے، اگر اس سے وہ کام نہیں ہوسکتا تو اس سے آدمیت ہی کی نفی کی جاتی ہے، اس معنی کر یہ کہا گیا ہے۔

آنرا کہ عقل وہمت وتدبیر ورائے نیست　　خوش گفت پردہ دار کہ کس درسرائے نیست[5]

دیکھئے کس کی نفی کی گئی ہے، حالانکہ وہاں آدمی موجود ہے، وجہ یہی ہے کہ وہ محض لغوی آدمی ہیں، ایسے آدمی نہیں جن سے وہ غرض پوری ہو جو آدمی سے پوری ہوتی ہے، یعنی لغوی آدمی ہیں اصطلاحی آدمی نہیں ہیں۔

امراء کے یہاں تو یہ محاورہ بہت مستعمل ہے کہا جاتا ہے کہ آپ فلاں تجارت شروع کیجئے یا فلاں محکمہ کھولئے، تو کہتے ہیں میں مجبور ہوں میرے پاس کوئی آدمی نہیں، یعنی اس کام کا آدمی نہیں، یوں لغوی آدمی تو بہت سے موجود ہیں، خلاصہ یہ کہ محاورات میں محض لغت پر نظر نہیں ہوتی بلکہ حصول اغراض پر نظر ہوتی ہے۔

---

[1]:۔معذور۔[2]:۔گوشت کا ٹکڑا۔ [3]:۔کلیات وجزئیات کا جاننے والا۔[4]:۔حکم کا پورا ہونا۔ [5]:۔جس کے پاس نہ عقل ہو، نہ ہمت اور نہ تدبیر۔اس کے بارے میں راز داں کا کہنا درست ہے کہ سرائے میں کوئی نہیں ہے۔

دل کی دو خاص صفتیں

اب سمجھ میں آ گیا کہ ''لمن کان له قلب'' کے کیا معنی ہیں، یہ معنی نہیں ہے کہ جس کے جسم میں دل بمعنی مضغۂ گوشت ہو، بلکہ وہ دل ہو جس سے وہ اغراض حاصل ہوں، لیکن جس کیلئے دل ہوتا ہے وہ اغراض کیا ہیں، ادراک یعنی برے بھلے کو سمجھنا، اور ارادہ جس سے نافع کو اختیار اور مضر کو ترک کر سکے، ان ہی کو شرعی اصطلاح میں علم اور عزم کہتے ہیں، تو دو صفتیں ہوئیں قلب کی، علم اور عزم، میں نے یہ دونوں لفظ (یعنی علم اور عزم) پہلے نہیں استعمال کئے بلکہ بجائے ان کے دوسرے الفاظ یعنی ادراک و ارادہ، اس واسطے کہ آجکل ایسی بد مذاقی پھیل رہی ہے کہ اپنے علوم یعنی علوم دینیہ کی اصطلاحوں سے بھی اجنبیت ہو گئی، اس واسطے میں نے اول عام محاورات سے تفہیم[1] کر کے اس کے بعد ان لفظوں کا استعمال کیا، غرض دو صفت ہیں قلب کی علم اور عزم، جب یہ دونوں صفتیں موجود ہوں گی تب کہا جائے گا کہ اس پر لمن کان له قلب صادق ہے۔

ہر فن میں اسی فن کے اعتبار سے گفتگو ہوتی ہے

اب ایک دوسری بات سنیئے وہ یہ کہ یہ عام قاعدہ ہے کہ جس فن میں گفتگو ہوتی ہے تمام فن میں اسی فن کی اصطلاحیں بولی جایا کرتی ہیں، جیسے اقلیدس میں اصول موضوعہ ہیں کہ اول ان کو بیان کر دیا جاتا ہے، اس کے بعد تمام اقلیدس میں جہاں اصول موضوعہ[2] کا لفظ آتا ہے انہیں اصول میں سے کوئی مراد ہوتا ہے، کسی دوسرے فن کے اصول مراد نہیں ہوتے یا علم حساب کی اصطلاح میں چند الفاظ مقرر ہیں، جیسے جمع، تفریق، ضرب ان کے خاص خاص معنی ہیں، علم حساب میں جہاں جہاں وہ لفظ بولے جائیں گے وہی معنی مقرر مراد ہوں گے، کہیں جمع سے مراد مجمع کرنا یا تفریق سے مراد مجمع کو منتشر کرنا یا ضرب سے مراد مارنا نہیں ہوگا، غرض ہر فن کی اصطلاحات جدا ہیں۔

دین بھی ایک فن ہے اس کے متعلق بھی کچھ اصطلاحات ہیں، ان ہی میں سے ایک لفظ علم بھی ہے دین میں اس سے مراد مطلق جاننا نہیں بلکہ مراد علم دین ہوتا ہے کسی اور چیز کا جاننا مراد نہیں ہوتا اس غلطی میں بہت سے ہمارے بھائی پڑے ہوئے ہیں کہ قرآن یا حدیث اور دین کی کتابوں میں علم کی فضیلت دیکھتے ہیں اور اس سے مراد کیا لیتے ہیں، کوئی زراعت و فلاحت لیتا ہے، کوئی تجارت لیتا ہے، کوئی صنعت و حرفت لیتا ہے یوں تو بڑی گنجائش نکلے گی وہ کام بھی اس میں داخل ہو جائینگے جن کو تمام

---

[1]: ۔سمجھ کر۔ [2]: ۔مقررہ اصول۔

دنیا برا کہتی ہے جیسے چوری، حرام کاری، ڈاکہ زنی وغیرہ کہ ان کا جاننا بھی تو علم ہی کی ایک فرد ہے، تو دین کیا ہوا؟ مجموعہ ہوا حسن اور قبیح کا، اور مجموعہ حسن اور قبیح کا قبیح ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ پلاؤ، قورمہ میں نجاست ملادی جائے تو اس مجموعہ کو کوئی اچھا نہ کہے گا، یہ کوئی مذہب والا بھی نہیں کہہ سکتا کہ بری باتوں کا جاننا بھی مذہبی علم ہے لامحالہ یہ کہنا پڑے گا کہ جس فن میں گفتگو ہو اس میں اسی فن کا جاننا علم کہلائیگا، یہاں دین کا بیان ہو رہا ہے تو یہاں علم سے مراد علمِ دین ہوگا، میں نے جو کہا تھا کہ دو صفت ہیں قلب کی جن پر دین سے منتفع ہونا موقوف ہے، اور وہ دو صفت علم اور عزم ہیں، تو اس سے مراد یقیناً علم دین ہی ہے۔

اعلیٰ کی موجودگی میں ادنیٰ معدوم ہوتا ہے

اور اگر میں ترقی کروں تو کہہ سکتا ہوں کہ علم کا مصداق صرف ایک علم دین ہی ہے دوسرے علوم اس کے سامنے علوم نہیں اس سے تعجب نہ کیجئے، دیکھئے کفن دوزی[۱] بھی ایک کام ہے اور زراعت وفلاحت بھی ایک کام ہے، کیا کفن دوزی کے علم کو زراعت وفلاحت کے علم کے سامنے علم کہیں گے؟ اگر ایسا ہے تو چمار اور کاشتکار برابر ہوں گے!۔ آفتاب کے سامنے تاروں کو کوئی منور نہیں کہتا، حالانکہ تارون میں بھی روشنی یقیناً ہے، پھر ان کو آفتاب کے سامنے منور کیوں نہیں کہا جاتا حتیٰ کہ وہ آفتاب کے سامنے نظر بھی نہیں آتے، دن کو تارے کہیں چلے تھوڑا ہی جاتے ہیں بلکہ آفتاب کے سامنے ان کی روشنی ماند ہو جاتی ہے، حتیٰ کہ جس سے پوچھئے دن کے وقت یہی کہے گا کہ تارے اس وقت نہیں ہیں، وجہ کیا ہے کہ ان کی روشنی اس وقت آفتاب کے مقابلے میں ماند ہوگئی ہے، تو تاروں کی صفت خاص یعنی روشنی ماند ہو جانے کی وجہ سے ان کی ذات پر بھی معدوم ہونے کا اطلاق کیا گیا اس کی بنا اسی قاعدہ پر تو ہے کہ اعلیٰ کے سامنے ادنیٰ کو اور شریف، کے سامنے خسیس کو موجود ہی نہیں کہا جاتا۔

اب بہت آسانی سے سمجھ میں آجائیگا کہ علم اعلیٰ واشرف کے سامنے علم ادنیٰ واخس کو اگر معدوم[۲] بھی کہہ دیا جائے تو کچھ بے جا نہیں، اب ہم کہتے ہیں کہ تمام علوم میں اشرف علم دین ہی ہے، اور دیگر تمام علوم اخس اور ارذل[۳] ہیں، رہی یہ بات کہ یہ فیصلہ کیونکر[۴] ہو کہ یہ ہمارا دعویٰ صحیح ہے یا غلط اور علوم میں شریف اور خسیس کون ہے اس کیلئے کوئی معیار ہونا چاہئے، سو اس معیار کی تعیین بہت سہل ہے، وہ معیار یہ ہے کہ علم کا شرف معلوم کے شرف پر موقوف ہے، اور معلوم اس کو کہتے ہیں جس کے

۱:۔ کفن چوری کرنا ۲:۔ ناپید، غیر موجود۔ ۳:۔ بہت ہلکے درجہ کے ہیں۔ ۴:۔ کس طرح ہو۔

حالات اس علم میں بیان کئے جاتے ہیں، اور ہر علم کا معلوم جدا ہوتا ہے جس علم کا معلوم جس درجہ میں ہے اسی درجہ میں علم بھی ہوتا ہے، مثلاً علم فلاحت کا معلوم زراعت یعنی کھیتی کرنا ہے، اور کنّاسی کا معلوم پاخانہ ہے، جو نسبت دونوں معلوموں میں ہے یعنی کھیتی اور پاخانہ میں وہی نسبت ان کے علموں میں بھی ہوگی، ظاہر ہے کہ پاخانہ نجس چیز اور ارذل چیز[۱] ہے اور زراعت[۲] صاف ستھری اور ذی شرف چیز ہے، لہذا علم کنّاسی[۳] ارذل ہوگا اور علم فلاحت اشرف[۴]، اور علم کناسی علم فلاحت کے سامنے علم کہلانے کا بھی مستحق نہ ہوگا، یہ قاعدہ تمام علوم کے لئے عام ہے، تفصیل کی ضرورت نہیں۔

علم دین کے مقابلے میں باقی علوم معدوم ہیں

اب دیکھئے علم دین کا معلوم کیا ہے، سب جانتے ہیں کہ وہ حق تعالیٰ کی ذات وصفات اور احکام ہیں۔ تمام علم دین کا خلاصہ یہی ہے، اور دیگر تمام علوم کا معلوم دنیا کو کہو یا ماسوی اللہ[۵] کو کہو، تو جو نسبت دنیا یا ماسوی کو خدا تعالیٰ کے ساتھ وہی نسبت علوم دنیویہ کو ہوگی علم دین کے ساتھ، اور اس نسبت کے متعلق بجز اس کے کیا کہا جاسکتا ہے کہ ع چہ نسبت خاک را با عالم پاک[۶] حق تعالیٰ کی ذات وصفات کو تو کسی چیز کے ساتھ کچھ بھی نسبت نہیں دی جاسکتی۔ وہ باقی اور سب فانی، وہ زندہ اور سب مردہ۔ وہ غنی اور سب محتاج، وہ موجود اور سب چیزیں معدوم۔ کل شیء ھالک إلا وجھه[۷] غرض دونوں چیزوں میں کوئی نسبت قائم ہو ہی نہیں سکتی، تو دونوں کے علوم میں بھی کوئی نسبت نہیں قرار دی جاسکتی، سوائے اس کے کہ علم دین پر موجود کا اطلاق کیا جائے اور دیگر علوم پر معدوم کا۔ اب میرا دعویٰ بہت قریب الی الفہم[۸] ہوگیا ہوگا کہ علم دین کے سامنے دیگر علوم علم کہلانے کے مستحق نہیں۔

علوم دنیا کو علم نہ کہو

مقابلہ تو کیا کیا جائے، جو لوگ علم کی فضیلتوں کے ضمن میں علوم دنیا کو ٹھونستے ہیں مجھے اس پر سخت حیرت ہوتی ہے۔ خدارا مسلمانو! اس اصطلاح کو بدلو، علوم دنیا کو علم مت کہو، فن کہو۔ پیشہ کہو، حرفت کہو، مگر علم مت کہو، بلکہ جہاں کہیں قرآن وحدیث میں علم کا لفظ آوے، اس سے مراد یہ علوم دنیا ہرگز نہ لو۔

۱:۔ ناپاک اور رذیل۔ ۲:۔ کاشتکاری۔ ۳:۔ گندگی صاف کرنے کا علم۔ ۴:۔ کھیتی باڑی کا علم اونچے درجہ کا۔
۵:۔ اللہ تعالیٰ کے سوا تمام مخلوق۔ ۶:۔ مٹی کو پاک جہاں سے کیا نسبت؟۔ ۷:۔ اس کی ذات کے سوا سب چیزیں ختم ہونے والی ہیں۔ ۸:۔ سمجھنے کے اعتبار سے بہت قریب۔

علوم دنیا کو علم کہنے کا نقصان

اس میں ایک باریک بات اور بھی ہے، وہ یہ کہ جب ان دنیوی چیزوں کے علم کو بھی علم کہا جاتا ہے تو جو لوگ ان علوم کے جاننے والے ہیں ان کو علماء اور فضلاء اور حکماء اور عقلاء اور اہل تحقیق اور جانے کیا کیا بھی کہا جاتا ہے، اور جب علماء کے فضائل بیان ہوتے ہیں تو ان لوگوں کو بھی ان کا مستحق سمجھا جاتا ہے، بلکہ بعض لوگ صرف انہیں علوم کو علوم فاضلہ مطلوبہ سمجھنے لگتے ہیں، کیونکہ علم کے مصادیق[1] ان کے ذہن میں یہی ہیں، پھر شرعی نصوص سے ان کی فضیلت ثابت کی جاتی ہے، اور ان علوم کے نہ جاننے والوں کو جاہل، پست ہمت، تاریک دماغ وغیرہ کہا جاتا ہے۔ حالانکہ جہاں شریعت میں عمل کی فضیلت آئی ہے وہاں ان علوم کی فضیلت مراد نہیں، جیسا ابھی بیان ہوا۔ یہ خرابی اس اصطلاح ہی کی ہے، اس کو بدلو۔

حدیث: ''علم حاصل کرو اگر چین میں ملے'' کا صحیح مطلب

چنانچہ ایک لیکچر میں دنیوی علوم کی فضیلت کو بیان کیا گیا، اور عجیب طرح استدلال کیا گیا۔ وہ جو عوام کی زبان پر ایک مشہور حدیث ہے، اطلبوا العلم ولو کان بالصین. یعنی ''علم کو طلب کرو اگرچہ چین میں ملے''۔ اس میں آج کل کے عام تعلیم یافتہ لوگ علوم مروجہ کو صرف داخل ہی کیا کرتے ہیں۔ لیکن اس لیکچرار نے تو اور بھی کمال کیا کہ اس نے اس حدیث میں صرف ان ہی علوم کو مراد لیا، اور دلیل یہ بیان کی کہ یہ حدیث جس وقت ارشاد ہوئی، اس وقت چین میں ظاہر ہے کہ علوم دین تو پہنچے ہی نہیں تھے صرف علوم دنیویہ ہی تھے، تو لامحالہ اس جملہ میں علم سے مراد صرف یہی دنیویہ علوم ہوں گے۔

بظاہر یہ ایسا استدلال ہے کہ آجکل کے تعلیم یافتہ تو اس پر عش عش کرنے لگیں گے، اور اپنے نزدیک سمجھ لیں گے کہ بس اس کا کوئی جواب ہو ہی نہیں سکتا، لیکن سنئے! عربی زبان کے محاورات میں ''لـــو'' کا لفظ ایسے موقع پر بولا جاتا ہے جہاں ہمارے محاورہ میں بالفرض کا لفظ بولا جاتا ہے، مثلاً آیت میں لن یتقبل من احدھم ملأ الأرض ذھبا ولو افتدی بہ[2]۔ یہ آیت کفار کے بارہ میں ہے۔ مطلب یہ کہ ''کافر سے اس کے جرم کے فدیہ میں تمام زمین بھر کر سونا بھی قبول نہیں کیا جائے گا

---

[1]: مصداق کی جمع۔ [2]: آل عمران، ۹۱

اگر چہ وہ دینا چاہے''۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قیامت میں ایسا ہوگا کہ کافر زمین بھر کر سونا دے گا مگر قبول نہ کیا جائے گا، بلکہ یہی مطلب ہے کہ ایسا نہ ہوگا اور اگر بالفرض ایسا ہوتا بھی، تب بھی قبول نہ کیا جاتا، اور کافر کو دوزخ ہی میں ڈالا جاتا۔ بنابریں ولو کان بالصین والی حدیث میں جو لفظ علم واقع ہے اس سے یقیناً علوم دنیویہ مراد نہیں ہو سکتے، وہ تو اس وقت وہاں موجود تھے، بلکہ ایسا علم مراد ہوگا جو اس وقت وہاں نہ تھا اور اس کا ہونا بعید بھی تھا۔

سو حاصل حدیث کا یہ ہوا کہ علم دین جس کی توقع چین میں ہونا بہت بعید ہے، اگر بالفرض کسی وقت وہاں سے ملے تو وہاں جا کر حاصل کرنا، اب بتلایئے اس حدیث میں علم سے مراد علم دنیوی ہوا یا علم دین۔ غرض یہ خلط اصطلاح [1] ہے کہ علم سے مراد ہم جو چاہیں لے لیں اور نصوص شرعیہ میں جو فضیلت علم کی آئی ہے وہ اپنے اصطلاحی معنوں کے لئے ثابت کریں۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

شاید کوئی ذہین آدمی یہ کہہ دے کہ مشہور جملہ ہے لا مشاحة فی الاصطلاح، [2] کہ ہر شخص کو اختیار ہے کہ ایک اصطلاح مقرر کر لے ہم اپنی اصطلاح میں ان علوم کو بھی علم ہی کہتے ہیں، اواس پر کیوں نکیر کی جاتی ہے میں کہتا ہوں کہ یہ اختیار آپ کو بیشک حاصل ہے اور کوئی آپ کو منع نہیں کر سکتا کہ آدمی کا نام بندر رکھ دیجئے یا خنزیر رکھ دیجئے، لیکن آپ کو اپنی اصطلاح کا دوسرے علوم یا فنون میں جاری کرنے کا تو اختیار نہیں ہے، وہاں تو اسی علم یا فن کی اصطلاح لی جائے گی، اور یہ اوپر ثابت ہو چکا ہے کہ شریعت میں تصرف کرنے کا کوئی حق نہیں۔ لہذا آپ کو وہ فضائل جو شریعت نے علم کے واسطے بیان فرمائے ہیں، علوم دینیہ ہی کے واسطے ماننے پڑیں گے، دوسرے علوم کے لئے نہیں۔

دنیاوی علوم پڑھنے کا حکم

البتہ ان علوم دنیویہ کے متعلق شریعت کا حکم یہ ہے کہ نہ یہ منع ہیں اور نہ کچھ فضیلت کی چیزیں، ہاں ان کے لئے بھی شریعت کے احکام ہیں، اور قیود ہیں، جو اپنے موقع پر مذکور ہیں، نہ انگریزی پڑھنے کو منع کیا جاتا ہے، نہ زراعت کو، نہ تجارت کو، ہاں ان کو منتہائے مقصود اور جزو شریعت بنانے سے منع کیا جاتا ہے، دیکھئے پڑوسی کے بھی حقوق ہوتے ہیں جن کو سب دنیا مانتی ہے شریعت نے بھی

---

[1]: اصطلاح میں گڑ بڑ کر دی ہے۔ [2]: اصطلاح میں جھگڑا نہیں کیا جا سکتا۔

پڑوسی کے بہت حقوق مقرر کئے ہیں، لیکن اس بات کو کوئی عقلمند جائز نہیں رکھتا اور نہ شریعت یہ تعلیم دیتی ہے کہ اس کو باپ بنالو یا اس کو میراث دو۔ ہاں یہ حکم ضرور ہے کہ اس کا ہر بات میں جائز لحاظ کرو اور قدر کرو، اس کو احتیاج ہو تو اس کی امداد کرو، لیکن اسی حد میں رکھو جو پڑوس کے لئے مناسب ہے، ذوی القربی[۱] پر مقدم نہ کرو۔ اسی طرح تمام ان چیزوں کو جو مفید ہیں سیکھنے کی اجازت ہے، بشرطیکہ حدود کے اندر رہوں لیکن ان کو کوئی امر شرعی یا باعث فضیلت اور جزو دین مت کہو، ورنہ یہ ایسا ہی ہوگا جیسے پڑوسی کو باپ بنانا۔

عزم کسے کہتے ہیں؟

اب میں اصل مضمون کی طرف عود[۲] کرتا ہوں۔ میں نے کہا تھا کہ قلب کے لئے دو صفت ہیں۔ اگر ان دونوں کے ساتھ متصف ہو کر قلب موجود ہو تو لمن کان له قلب کا مصداق ہوگا ان میں سے ایک صفت تو علم ہے، جس کا علم دین کے ساتھ خاص ہونا اوراوپر ثابت ہو چکا ہے اور دوسری صفت عزم ہے، اور جیسے کہ علم کے معنی میں لوگ غلطی کرتے ہیں، جس کو رفع کر دیا گیا ہے، ویسے ہی عزم کے معنی میں بھی لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہیں کہ ارادۂ ضعیفہ[۳] کو بھی عزم سمجھتے ہیں، خواہ وہ ادنی مانع سے بھی زائل[۴] ہو جائے، اس لئے اس غلطی کو بھی میں رفع کرتا ہوں۔ بیان اس کا یہ ہے کہ عزم کہتے ہیں ارادۂ قویہ کو یعنی ایسا پختہ ارادہ ہو کہ چاہے کیسا ہی عارض پیش آ جائے، بشرطیکہ اختیار باقی رہے، اس ارادہ میں زوال نہ ہو۔

قرآن سے نفع حاصل کرنے کے لئے دو شرطیں

تو انتفاع بالقرآن کے لئے دو شرطیں ہوئیں۔ ایک یہ کہ دین کا علم ہو اور دوسری یہ کہ اس پر عمل کرنے کا پختہ قصد ہو۔ اور یہی حاصل ہے لمن کان له قلب کا۔ غرض اس آیت کا یہ مطلب ہوا کہ نفع اس شخص کو ہوگا جسکو علم دین حاصل ہو، اور اس پر عمل کے لئے عزم ہو۔ مجھے اس وقت اسی کا بیان کرنا ہے کہ ہر مسلمان کو ان دونوں صفتوں کے حاصل کرنے کی ضرورت ہے علم دین کی عزم کی۔ علم سے سیدھا راستہ معلوم ہوگا اور عزم سے اس راستہ پر چلنا نصیب ہو سکے گا۔

---

[۱]:۔ رشتہ داروں پر انہیں مت بڑھاؤ۔ [۲]:۔ لوٹتا ہوں۔ [۳]:۔ کمزور ارادہ۔ [۴]:۔ ہلکی سی رکاوٹ سے بھی ختم ہو جائے۔

مختصر دستور العمل کا فائدہ

سبحان اللہ یہ کس قدر مختصر تعلیم ہے، اس کی قدر اہل فہم جان سکتے ہیں کہ کس قدر مختصر عنوان ہے اور جامع ہے۔ یہ بھی حکمت کا اصول ہے کہ دستور العمل مختصر ہو، کیونکہ دستور العمل جس قدر مختصر ہو اس پر عمل کرنے میں سہولت ہوتی ہے۔ اس کا ثبوت حدیثوں سے بھی ملتا ہے، ایک اعرابی نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا، اور کہا مجھے کچھ تعلیم کیجئے مگر وہ تعلیم مختصر ہو، حضور نبی تھے کیسی جامع اور مختصر تعلیم فرمائی۔ فرمایا قل آمنت باللہ ثم استقم۔ یعنی ''اللہ پر ایمان لا پھر اس پر جما رہ''۔ کیسا چھوٹا سا جملہ ہے مگر اس میں سب ہی کچھ آ گیا، یہ ایسا ہے جیسے نکاح کے وقت ایجاب اور قبول کیا جاتا ہے اور لڑکے سے کہا جاتا ہے کہ تم نے فلاں لڑکی سے نکاح کو قبول کیا؟ وہ کہتا ہے قبول کیا، یہ ذرا سا لفظ ہے مگر تمام ذمہ داریاں اور حقوق معاشرت سب کو حاوی ہے، ایسے ہی جب کہا کہ اللہ پر ایمان لا، اس کے معنی یہ ہوئے کہ حق تعالیٰ کو خدا اور اپنے آپ کو بندہ مان لے، اس میں سارے حقوق الوہیت[۱] حقوق عبودیت[۲] آ گئے، اور دوسرے جملہ میں ہے ثم استقم یعنی ''اس پر جمے رہو''۔ حاصل یہ ہوا کہ ایمان لاؤ، اور مرتے دم تک مؤمن رہو، بس دیکھو جیسا اس کا سوال تھا ویسا ہی جواب ہو گیا۔ یہ اعلیٰ درجہ کی حکمت ہے کہ دستور العمل[۳] مختصر ہو، اس سے احکام مختصر نہیں ہو جاتے، ہاں یاد داشت مختصر ہو جاتی ہے، اس سے دماغ پریشان نہیں ہوتا، اور ہر وقت تمام اجزاء اس دستور العمل کے اس عنوان کی وجہ سے مستحضر[۴] رہتے ہیں،

اس کی مثال یہ ہے کہ ایک استاد نے بچہ کو آمد نامہ پڑھایا اور ایک ہزار مصدر یاد کرا دیئے۔ اب ان ہزار مصدروں کو یاد رکھنے میں اس کو بہت دقت[۵] ہوگی، اس کے لئے اس نے مصدر کی ایک علامت کلی بتلا دی کہ جس لفظ کے آخر میں ''دن'' یا ''تن'' ہو وہ مصدر ہوتا ہے اس سے اس کو کس قدر سہولت ہوگئی، اور کتنا بار ہلکا ہو گیا، اگر یہ علامت نہ بتلائی ہوتی تو ان مصدروں کے یاد رکھنے کے لئے اس کو کس قدر تعب[۶] اٹھانا پڑتا کہ ہمیشہ ان مصدروں کو بطور آموختہ[۷] کے پھیرا کرتا، اور اس علامت کے بتلا دینے کے بعد اسے آموختہ کی ضرورت ہی نہیں، ہر مصدر کو غیر مصدر سے تمیز کر سکتا ہے (کوئی طالب علم یہ سوال نہ کر بیٹھیں کہ اس علامت سے گردن بھی مصدر ہوا کیونکہ اس میں یہ بھی شرط ہے

۱:۔ اللہ کے حقوق۔ ۲:۔ بندگی کے حقوق۔ ۳:۔ کام کرنے کا طریقہ اور تربیت۔ ۴:۔ ذہن میں حاضر۔
۵:۔ تکلیف۔ ۶:۔ مشقت۔ ۷:۔ بطور سبق۔

کہ آخر میں ''دن'' یا ''تن'' ہونے کے ساتھ اس سے صیغے بھی مشتق ہوتے ہوں، یہ بحثیں اپنے موقعوں پر کتابوں میں مذکور ہیں۔ یہاں ایک مثال کے طور پر ذکر آ گیا تھا)۔اس علامت سے مصادر مختصر نہیں ہوگئے، مصادر تو ہزار ہا تھے اور وہ ہی رہے، ہاں یا دداشت مختصر ہوگئی۔

اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے **ثم استقم** یعنی ایمان پر مع اس کے کل لوازم کے جمے رہو، اس میں کل احکام شریعت کے آ گئے، اور ذہن میں جمعیت پیدا ہوگئی، اس کی قدر اس اعرابی ہی سے پوچھنا چاہئے، ایک بڑی چیز ہاتھ آ گئی اور جس چیز کی اس کو تلاش تھی وہ ہی مل گئی۔

ہم اپنے محاورات میں دیکھتے ہیں کہ جب ہم کوئی نوکر رکھتے ہیں تو اس سے بہت سے کام لیتے ہیں سب کاموں کو ایک دم بتا دینا ناممکن ہے، اس واسطے خلاصہ بتا دیا جاتا ہے کہ حاضر رہو اور جس وقت ہم گھنٹی بجائیں فورا بولو، اس کہہ دینے کے بعد کاموں کی تفصیل کی ضرورت نہیں رہتی، اس کو ضابطہ کہتے ہیں۔اسی کا ترجمہ قاعدہ کلیہ ہے۔

دین خود جوہر ہے

ہر کام میں ضابطہ سے آسانی ہو جاتی ہے اسی طرح قرآن سے نفع ہونے کے لئے ضابطہ بتلا دیا گیا جس کے بعد تفصیل یاد رکھنے کی ضرورت باقی نہیں رہی وہ ضابطہ یہی ہے **لمن کان له قلب** اور اس کے دو جزو ہوئے علم اور عزم یعنی ہمت۔ دین مکمل موجود ہے، اس کے علم کی ضرورت ہے، اور نرا علم کار آمد نہیں ہوتا، بلکہ اصل غرض عمل ہے، اس کے لئے عزم وہمت کی ضرورت ہے۔ دین کے بہت سے اجزاء ہیں، عنوان مختصر ہونے سے ان اجزاء کی کمی مقصود نہیں، بلکہ ان کے یاد رکھنے میں سہولت مقصود ہے۔ آج کل یہ بھی ایک ہوا چلی ہے کہ دین کا اختصار کیا جاتا ہے، جیسے محسوسات میں علم کیمیا نکل آیا ہے کہ اس سے ہر چیز کا جوہر نکال لیا جاتا ہے، دواؤں کے جوہر موجود ہیں، جو دوا سیر بھر وزن سے کام دیتی تھی وہ اب ماشہ بھر سے کام دیتی ہے۔ غرض صنائع کی ترقی ہے، اس سے ہر چیز کا اختصار کر لیا گیا ہے، جو کام دس آدمی کرتے تھے وہ ایک آدمی مشین سے کرسکتا ہے، جو مسافت دس دن میں طے ہوتی تھی وہ ریل سے یا موٹر سے دس گھنٹہ میں طے ہوتی ہے، بعض غذاؤں کے جوہر بھی نکال لئے گئے جن سے جو کام سیر بھر غذا سے نکلتا تھا وہ چھٹانک بھر جوہر سے نکل آتا ہے۔

بعض ذہین لوگوں نے علم کیمیا کو دین میں بھی استعمال کیا ہے، جس سے دین کا بھی اختصار کرنا چاہا ہے، گویا تھوڑے کام سے سارے دین کا کام لے سکتے ہیں، جیسے تھوڑی دوا سے بہت سی دوا

کا کام لیا جاتا ہے، اب دین کا جوہر کیا رہ گیا ہے؟ فقط الٹی سیدھی نماز پڑھ لینا، اور کسی رفاہ عام کے کام میں چندہ دے دینا، اس کو بجائے زکوۃ کے سمجھتے ہیں، یورپ کا سفر کر آنا یہ حج کا خلاصہ ہے، بعض نے تو یہاں تک اختصار کیا ہے کہ نماز کے لئے وضو کی بھی ضرورت نہیں رکھی، اور رکعتوں کی تعداد بھی اڑا دی اور اس سے بھی زیادہ اختصار یہ کیا ہے کہ تمام دین سے مقصود نیکی کرنا ہے، بس نیکی کرتے رہو، کسی کو ستاؤ مت، یہی دین ہے۔ یہ سب دین کے جوہر ہیں۔ صاحبو! دین خود جوہر ہے جوہر کے جوہر نکالنے کے کوئی معنی نہیں۔

تحلیل زائد چیزوں میں ہوتی ہے اصل میں نہیں

اگر کسی دوا کا جوہر نکالا تو کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس کا بھی جوہر نکالو، پھر اس جوہر کا بھی جوہر نکالو۔ اس کا انجام تو اس چیز کو فنا کر دینا ہے۔ علم کیمیا کا انکار نہیں، مگر تحلیل زوائد[۱] کی ہوا کرتی ہے، ایک دوا کا جوہر نکالتے ہیں تو اس کے یہ معنی ہیں کہ جو چیزیں اس میں زائد تھیں ان کو تدبیر سے تحلیل کر دیا اور اصل چیز رہ گئی اسی کا نام جوہر ہے، اور اسی کو ''ست'' بھی کہتے ہیں۔ اب ست چونکہ اصل چیز ہے اور زوائد سے پاک ہو چکا ہے، اب اس میں تحلیل نہیں ہو سکتی، دین سارے کا سارا جوہر اور ست ہی ہے، جن اجزاء کو زوائد سمجھتا جاتا ہے وہ زوائد نہیں، اگر وہ زوائد ہوتے تو ان کے ترک پر وعید کیوں ہوتی۔

مکرر افعال زائد نہیں

رہے مکررات مثلاً نماز میں چار رکعت ہیں، سو یہ سمجھنا کہ ایک رکعت کافی تھی، بار بار چار دفعہ ایک ہی جیسے افعال کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دیکھئے! آپ کا جسم کتنے اعضاء سے مرکب ہے جن میں مکررات بھی ہیں، دو ہاتھ ہیں۔ دو پیر ہیں، دو آنکھیں ہیں، وغیرہ وغیرہ، مگر ان میں چونکہ زوائد نہیں ہیں، بلکہ یہ سارے کے سارے اصلی اور ضروری اجزاء ہیں، گویا سب ہی ہیں اس واسطے ان میں تحلیل و تخفیف نہیں کی جاتی، ورنہ ان میں بھی اختصار کیجئے۔ دو ہاتھ کی جگہ ایک ہاتھ رکھئے دو پیر کی جگہ ایک پیر رکھئے۔ دو آنکھوں کی جگہ ایک آنکھ رکھئے۔ منہ میں دانت تو ۳۲ ہیں ان میں اختصار کر کے صرف ایک دانت رکھئے، باقی زوائد کو حذف کیجئے۔ اس کا جواب یہی ہو سکتا ہے کہ جو اعضاء دو ہیں ان کے دونوں کی ضرورت ہے دانت ۳۲ ہیں تو ۳۲ ہی کی ضرورت ہے اگر اتنے نہ

۱:۔ یعنی زائد چیزوں کو ختم کیا جاتا ہے اصل چیزوں کو نہیں۔

ہوں تو کام نہیں چلے گا۔ دو ہاتھ نہ ہوں تو کھانا، پینا، آبدست لینا دشوار ہوگا۔ دانت ۳۲ نہ ہوں تو کھانا مشکل ہوگا۔ پیر دو نہ ہوں تو چلنا پھرنا ناممکن ہے۔

مکر رافعال میں بھی حکمت ہے۔

اب سمجھئے کہ جو اعضاء کے اختصار پر مضار[1] مترتب ہوتے ہیں، یہ وعیدیں[2] ہی تو ہیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ اگر اختصار ہوگا تو فلاں نقصان ہوگا، دین آخرت کا کام ہے اس کے اجزاء کی کمی پر وعیدیں موجود ہیں کہ اگر فلاں کام نہ ہوگا تو اس پر یہ عذاب ہوگا، پھر اس میں اختصار کے کیا معنی؟ اس میں اختصار کے یہی معنی تو ہوئے کہ گو یہ عذاب ہے مگر ہم اس کو برداشت کریں گے، یہ ایسا ہی ہے جیسے جسم کے اجزاء کے بارہ میں کہیں کہ اگر ایک چیز ہوگی تو بلا سے، ہم چلنا پھرنا نہیں کریں گے، ایک ہاتھ ہوگا تو ہم آبدست نہیں لیں گے، پھر کسی کو یہ کرتے دیکھا ہے یا کوئی اس کو پسند کرتا ہے اگر دین کا ست نکالنا اور اختصار کرنا ہے تو اپنے جسم کا بھی ست نکالئے، اور اعضاء میں اختصار کیجئے، مگر اعضاء کی نسبت تو کہا جاتا ہے کہ ایک بھی زائد نہیں، بلکہ اعضاء ایسے ہیں جن کی ضرورت اور حکمت اب تک سمجھ میں بھی نہیں آئی، لیکن کہا جاتا ہے کہ صانع جل شانہ علیم وحکیم ہیں، ان میں بھی کوئی حکمت رکھی ہوگی، فعل الحکیم لایخلو عن الحکمۃ[3] حیرت ہے کہ جسم کے اجزاء میں تو حکمت ہو، اور دین کے اجزاء میں حکمت نہ ہو، حالانکہ دین بھی تو انہیں کا بنایا ہوا ہے جن کا جسم بنایا ہوا ہے، جو علیم وحکیم ہیں، اور جسم دنیاوی چیز ہے جس کو انہوں نے خود ناقص اور ناقابل اعتبار کہا ہے، اور جو فانی بھی ہے، اور دین اخروی چیز ہے جس پر آخرت مترتب ہے، اور آخرت کو کام اور قابل اعتبار کہا ہے، اور وہ باقی ہے، قل متاع الدنیا قلیل[4]۔ والآخرۃ خیر لمن اتقی[5]۔ ما عندکم ینفد وما عند اللہ باق[6]۔ پھر یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ جو چیز فانی اور ناقابل اعتبار ہو اس کے اجزاء میں تو حکمت ہو، اور جس پر ایک خیر باقی مرتب ہو اس کے اجزاء میں حکمت نہ ہو۔ یہ بہت موٹی بات ہے۔

مستحبات بھی زائد نہیں

میں تو کہتا ہوں کہ دین کا کوئی جزو بھی زائد نہیں ہے حتی کہ مستحبات بھی اپنے درجہ میں غیر زائد

---

[1]: نقصانات [2]: سزا کی دھمکی۔ [3]: حکیم کا فعل حکمت سے خالی نہیں ہوتا۔ [4]: کہہ دیجئے دنیا کا فائدہ چندروزہ ہے۔ (النساء، ۷۷) [5]: اور آخرت ہر طرح سے بہتر ہے اس شخص کے لئے جو اللہ کی مخالفت سے بچے۔
[6]: جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ ختم ہوجائے گا۔ اور جو اللہ کے پاس ہے دائم رہے گا۔ (النحل، ۹۶)

ہیں، گواتنا تفاوت ۱ ہے کہ واجبات کی کمی میں خسران ۲ اور مستحبات کی کمی میں حرمان ۳، مگر ضرر ۴ تو ان کی کمی میں بھی ہوا، اب لوگ مستحبات کو یہ کہہ کر چھوڑ دیتے ہیں کہ یہ کوئی ضروری کام نہیں۔ کریں گے تو ثواب ملے گا۔ نہ کریں گے تو گناہ نہ ہوگا۔ صاحبو! گناہ نہ ہونا اور بات ہے اور منفعت ہونا اور بات ہے، اگر آپ کو مستحبات کے ثمرات معلوم ہو جائیں تو ان کا بھی کافی اہتمام کرنے لگیں، اگر مستحبات کے ثمرات سامنے آجائیں تو کوئی ایک ادنیٰ سے مستحب کو بھی نہ چھوڑیں گے، گو یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ مستحبات سے ضرورت کو اٹھالیا ۵ اس وجہ سے کہ ہم لوگوں میں ہمت کم ہے۔

احکام کے مختلف درجات کی حکمت اور ہماری غلط فہمی

اگر سب کو فرض کر دیا جاتا تو غالباً ہم مستحبات ہی کو نہیں بلکہ فرائض کو بھی چھوڑ دیتے، اور یہ فرق علوم دینیہ کی تکمیل کے لئے ظاہر کیا گیا ہے۔ حق تعالیٰ علماء کو جزائے خیر دے جنہوں نے احکام دین کے مراتب کو خود شریعت کے اشارات سے سمجھ کر قائم کیا، اور یہ منجانب اللہ دین کی حفاظت ہے کہ ایسے وقت میں یہ ترتیب ہوگئی جب کہ دین میں کچھ گڑبڑ بھی نہیں ہونے پائی تھی، اگر اس وقت علماء دین کو بلا ترتیب چھوڑ دیتے تو اس وقت میں جب کہ ہوائے (نفس) ۶ اور رائے کا دور دورہ ہے، دین میں خلط مبحث ۷ ہو جاتا، اور اس کے کسی جزو کا بھی پتہ نہ چلتا۔ الحمد للہ کہ اب دین کی ایسی ترتیب ہوگئی کہ تمام احکام کے مراتب محفوظ ہیں۔ فرائض الگ ہیں۔ سنن الگ ہیں۔ مستحبات الگ ہیں، جس کی علت اور حکمت وہ ہے جو ابھی مذکور ہوئی۔ مگر ہم لوگوں نے اس کا نتیجہ الٹا نکالا کہ مستحبات کو زوائد سمجھ لیا، اور ان کا اہتمام بالکل چھوڑ دیا۔ یہ مانا کہ ضرورت کو ان سے اٹھالیا گیا ہے مگر جو ثمرات اور درجات ان پر موعود ۸ ہیں وہ بھی تو بلا ان کے ۹ نہیں ملیں گے، اور وہ ثمرات معمولی چیزیں ہیں۔

مستحبات کی مثال

دیکھئے کوئی اعلان کرتا ہے کہ جو کوئی صبح کو میرے مکان پر پہنچ جائے گا، اس کو ایک لاکھ روپیہ ملے گا، یہ اعلان امر اور وجوب کے درجہ میں نہیں ہے، انعام اور بخشش کے درجہ میں ہے، جس کو زائد ہی کہہ سکتے ہیں، لیکن کوئی ایسا جو اس اعلان کو سنکر وہاں پہنچ نہ جائے، ایک لاکھ روپیہ تو بڑی چیز ہے

۱: فرق۔ ۲: خسارہ نقصان۔ ۳: محرومی۔ ۴: نقصان۔ ۵: یعنی وہ ضروری اور لازم نہیں ہیں۔
۶: خواہش نفس پر عمل کرنا۔ ۷: دین سے متعلقہ ایجادات آپس میں اس طرح گھل مل جاتیں کہ ان کا فرق کرنا مشکل ہو جاتا۔ ۸: یعنی جس ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ ۹: ان کو کئے بغیر۔

ایک روپیہ کا بھی اعلان ہو بلکہ دولڈوؤں کا بھی اعلان ہو تب بھی وقت مقررہ سے پہلے پہنچ جائیں گے، خیر اس اعلان میں تو یقین یا کم از کم ظن غالب ہوتا ہے، شے موعود کے مل جانے کا اور جوئے میں تو یقین بلکہ ظن بھی نہیں ہوتا، صرف امید موہوم پر ہزاروں روپیہ کی بازی لگادیتے ہیں اس احتمال پر کہ شاید ہم ہی جیت جائیں پھر جس پر یقین ہو ایسے ثمرات کے ملنے کا جو دنیا و مافیہا[۱] سے بہتر ہیں اس پر کیا ہونا چاہیے؟۔

مستحبات کی مثال احکام کے اندر ایسی ہے جیسے دعوت کے کھانوں میں چٹنی کہ چٹنی کسی معنی کر زائد ہی ہے، نہ اس پر بقائے حیات[۲] موقوف ہے اور نہ پیٹ بھرنا موقوف ہے، پھر دیکھئے چٹنی کا بھی کتنا اہتمام ہوتا ہے کہ فرمائش کر کر کے چٹنی منگائی جاتی ہے اور صرف ایک ہی قسم کی چٹنی سے سیری نہیں ہوتی بلکہ طرح طرح کی چٹنیوں اور اچاروں کا مطالبہ ہوتا ہے، اور بلا چٹنی کے دعوت پھیکی کہی جاتی ہے، اسی طرح صرف فرائض و مؤکدات ادا کر لینے سے ضرورت کا مرتبہ تو پورا ہو جائے گا اور آخرت میں عذاب بھی نہ ہوگا لیکن بلا مستحبات کے جنت سونی سونی رہے گی اس کی جنت کا حصہ دوسروں کی حصہ کی نسبت ایسا رہے گا جیسا کم درختوں کا باغ زیادہ درختوں والے باغ کے سامنے۔

چنانچہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا پیغام جو شب معراج میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت پہنچایا گیا ہے الجنة قیعان وغراسها سبحان الله، یعنی ''فرما دیجئے گا اپنی امت سے کہ جنت چٹیل میدان ہے اور اس میں درخت لگانے کی ترکیب یہ ہے کہ سبحان اللہ پڑھا جائے''، یہ بات حدیث سے ثابت ہے کہ اگر ایک دفعہ بھی کوئی سبحان اللہ کہتا ہے تو اس کے لئے فوراً ایک درخت جنت میں لگ جاتا ہے، دیکھئے ظاہر میں یہ کوئی ایسی ضروری بات نہ تھی جس کو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ہم لوگوں تک پہنچایا، بات یہ ہے کہ وہ حضرات رحیم وکریم ہیں خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام انہوں نے ہم کو ایسی تدبیر بتادی جس سے جنت کے زیادہ درخت مل جائیں، اس میں یہ تعلیم بھی ہوگئی کہ فرائض پر بس مت کر لینا آگے بھی ہمت کرنا۔

غرض مستحبات بھی اہتمام کی قابل چیزیں ہیں زوائد نہیں ہیں، جب کہ مستحبات بھی زوائد نہیں ہیں تو فرائض و واجبات کا تو کیا پوچھنا ہے! پھر دین میں اختصار کیسے ہوسکتا ہے؟، بیان یہ تھا کہ لمن كان له قلب عنوان مختصر ہے اس سے دین کے اجزاء میں اختصار لازم نہیں آتا تفصیلات تو

---

[۱]:۔ دنیا اور جو کچھ اس کے اندر ہے۔ [۲]:۔ زندگی کا باقی رہنا۔

سب کی سب بدستور رہتی ہیں، عنوان مختصر سے صرف یادداشت میں سہولت ہو جاتی ہے اور یہ عین حکمت ورحمت ہے۔

ایک حدیث کے متعلق اشکال وجواب

یہاں سے اس حدیث کا حل بھی ہو جاتا ہے من قال لا إله إلا الله دخل الجنة[۱] اس سے بعض فاسد دماغ لوگوں نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ بس توحید کا قائل ہونا نجات کے لئے کافی ہے، رسالت کے قائل ہونے کی ضرورت نہیں، کیونکہ حدیث میں تو صرف اتنا ہی آیا ہے من قال لا إله إلا الله ہے حل اس طرح ہوا کہ لا إلہ إلا اللہ عنوان ہے دین کا جو حاوی ہے تمام اجزائے دین کو، گویا اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو کوئی دین اسلام قبول کرے وہ جنت میں جائے گا، اور دین میں تمام اجزاء دین آ گئے، ان کی تفصیل دوسری نصوص میں صراحۃً موجود ہے، مثلاً کل امن بالله وملائكته وكتبه ورسله[۲] اس میں اللہ پر ایمان لانے کے ساتھ ملائکہ پر اور کتب سماویہ[۳] پر اور تمام انبیاء پر ایمان لانا مذکور ہے، اسی طرح کی صدہا آیتیں ہیں جن میں اجزاء دین کا بیان ہے، تو کیا یہ حدیث ان آیات کی معارض ہے حاشا وکلا[۴] حقیقت یہی ہے کہ یہ محض عنوان ہے مراد تمام اجزاء دین ہیں۔

لا إلہ إلا اللہ ایک جامع عنوان ہے

اور میں کہتا ہوں کہ توحید کو ماننا مستلزم ہے رسالت کے ماننے کو بھی، کیونکہ توحید کو ماننا مستلزم ہے اس بات کو کہ حق تعالیٰ کو سچا مانا جائے اور حق تعالیٰ کے کلام میں موجود ہے محمد رسول اللہ تو جو شخص رسالت کو نہیں مانتا وہ حق تعالیٰ کی تکذیب کرتا ہے جب تکذیب کی تو اس پر من قال لا إله إلا الله کہاں صادق ہوا، غرض یہ محض جہالت اور کوتاہ نظری ہے کہ لا إله إلا الله کو صرف اس کے لفظی معنیٰ پر محمول کیا جائے بلکہ یہ تو ایک جامع مانع عنوان ہے جو تمام دین کو شامل ہے اس کی ایک بہت موٹی مثال وہی ہے جو قریب ہی بیان ہوئی ہے، یعنی نکاح جو کیا جاتا ہے وہ ظاہر میں تو نام ہے صرف ایجاب وقبول کا، لیکن یہ ایجاب وقبول نکاح کا محض عنوان ہے، اور درحقیقت ان کے اندر تمام دنیا کے بکھیڑے اور مصائب اور مصارف سب داخل ہیں جو نکاح کے بعد پیش آتے ہیں، فرض کیجئے کہ کسی نے نکاح کیا پھر چند روز کے بعد بی بی صاحبہ نے نان نفقہ کا مطالبہ اور آٹے دال کا تقاضا کیا اور رہنے

---

[۱]: جس نے لا إلہ إلا اللہ کہا وہ جنت میں جائے گا۔ [۲]: سب کے سب عقیدہ رکھتے ہیں اللہ کے ساتھ اور اس کے فرشتوں کے ساتھ اور اس کی کتابوں کے ساتھ اور اس کے سب پیغمبروں کے ساتھ (البقرۃ، ۲۸۵)۔ [۳]: آسمانی کتابیں۔ [۴]: ہرگز نہیں۔

کو گھر مانگا، تو کیا دلہا میاں یہ کہہ سکتے ہیں کہ واہ میں نے تو تمہیں قبول کیا تھا اس آٹے دال اور گھر گھرستی کا دینا کب قبول کیا تھا؟ اگر کوئی ایسا کہے بھی تو اس پر سب ہنسیں گے اور اس کو بیوقوف بنائیں گے، اور اس کو یہی جواب دیں گے کہ میاں جو نکاح میں یہ کہا تھا کہ میں نے تجھ کو قبول کیا اس میں سب کچھ آ گیا، نان نفقہ بھی، گھر گھرستی بھی، نمک، تیل، لکڑی بھی، اس سے یہ بات ثابت ہوگئی کہ نکاح ایک عنوان ہے جو خود تو مختصر ہے لیکن بہت سے بکھیڑوں کو شامل ہے، بس اسی طرح من قال لا إله إلا الله ہے کہ وہ ایک مختصر عنوان ہے جو تمام اجزائے دین کو شامل ہے، نماز کو بھی، روزہ کو بھی زکوۃ کو بھی حج کو بھی معاملات کو بھی معاشرات کو بھی اخلاق کو بھی فرائض کو بھی مستحبات کو بھی، ہاں ان مختلف اجزائے دین میں فرق مراتب ہونا اور بات ہے۔

لا الٰہ اِلا اللہ کا خلاصہ

پس لا اِلٰہ اِلا اللہ کا خلاصہ حق تعالیٰ سے تعلق ہو جانا ہے، جب یہ ہو گیا تو پھر جو کچھ بھی حق تعالیٰ فرمائیں گے، وہ سب کرنا پڑے گا، جیسے نکاح کا خلاصہ ہے بی بی سے تعلق ہو جانا جب نکاح ہو گیا تو پھر جو کچھ وہ اپنے حقوق واجبہ طلب کرے گی وہ دینا پڑیں گے، بلکہ نکاح کا تعلق تو محدود ہے اور وہ قطع بھی ہو سکتا ہے لیکن حق تعالیٰ کا تعلق غیر محدود ہے اور وہ قطع بھی نہیں ہو سکتا، بس لا إلـه إلا الله کہا اور ہمیشہ کے لئے پھنس گئے اور سارے حقوق الوہیت[1] سر پڑ گئے۔

اللہ تعالیٰ سے تعلق بہت لذیذ چیز ہے

کہیں اس فقرہ کو سن کر کہ پھنس گئے، وحشت نہ کرنے لگنا، کیونکہ حق تعالیٰ سے تعلق تو ایسا لذیذ ہے کہ اس میں پھنس جانے کے بعد پھر رہائی کی تمنا ہی نہیں رہتی، اسی کو کہا گیا ہے کہ

؎ اسیرش نخواید رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کمند[2]

وحشت بس جب ہی تک ہے جب تک اس میں پھنسے نہیں ہو، اور جب پھنس گئے تو بس پھر ساری دنیا اس قید کے مقابل بری معلوم ہونے لگے گی، سوائے اس قید کے کوئی چیز اچھی ہی نہ معلوم ہوگی۔

دیکھئے وہ لوگ جو اسلام لانے سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے جانی دشمن اور خون کے

---

[1]: اللہ کے حقوق۔ [2]: اس کا قیدی قید سے رہائی نہیں چاہتا اور اس کا شکار جال سے نکلنا نہیں چاہتا۔

پیاسے تھے جن کی سرشت میں گویا جہالت اور عداوت داخل تھی بس ایک دفعہ کلمہ پڑھنے کے بعد ہی حضور پر دل و جان سے فدا ہونے لگے اور حضور کے پسینہ کی جگہ اپنا خون گرانے کو بخوشی تیار ہو گئے، چنانچہ نہایت شوق کے ساتھ جہاد کئے، سر کٹوائے، شہید ہوئے، آخر یہ بھی کہیں سنا کہ ان میں سے کوئی ان تکلیفوں کے وقت اسلام سے پھر گیا ہو یا دل پر کبھی میل لایا ہو، آخر اس میں کوئی لذت ایسی ہی تو تھی جس کے سامنے ان کی نظر میں دنیا کے سارے عیش اور آرام گرد ہو گئے تھے اور ساری مصیبتیں آسان ہو گئیں تھیں، سارے مصائب برداشت کئے لیکن اس جال سے نکلنا گوارا نہ کیا، اسی کو مولانا فرماتے ہیں

گر دو صد زنجیر آری بگلم غیر زلف آن نگارے دلبرم [1]

اور یہ بالکل سچ ہے

اسیرش نخواہد رہائی زبند شکارش نجوید خلاص از کمند

محبوب سے ملنے والی تکلیف میں بھی راحت ہے

عاشق کو تو جو تکلیف محبوب کی طرف سے پہنچے وہ تکلیف ہی نہیں بلکہ سراسر راحت ہے، میں اس کی ایک مثال دیا کرتا ہوں وہ یہ کہ فرض کیجئے کسی کا کوئی محبوب ہے، وہ ایسا ہے کہ عاشق اس کے پیچھے پیچھے پھرتا ہے مگر وہ کبھی اس کو منہ بھی نہیں لگاتا، اتفاق سے مدتوں حیراں و پریشاں ہونے کے بعد ایک دفعہ ایسا ہوا کہ اس محبوب نے پیچھے سے آ کر اس عاشق کی گولی بھر لی، اور اتنی زور سے دبایا کہ میاں کی پسلیاں ٹوٹنے لگیں، اب ظاہر ہے کہ اس سے تکلیف تو ضرور ہو گی لیکن جب پیچھے پھر کر دیکھے گا کہ ارے یہ تو میرا محبوب ہے اس وقت اس کی کیا حالت ہو گی!! کیا وہ تکلیف پھر تکلیف رہے گی یا مبدل براحت [2] ہو جائے گی!!، اب فرض کرو کہ وہ محبوب یہ کہے کہ اگر تکلیف ہو رہی ہو اور میرے دبانے سے ناگواری ہو تو میں تجھ کو چھوڑ کر تیرے رقیب کو دبالوں؟ کیا اس کو وہ منظور کر لے گا؟ ہر گز نہیں وہ تو یہ کہے گا

نشود نصیب دشمن کہ شود ہلاک تیغت سر دوستاں سلامت کہ تو خنجر آزمائی [3]

یہ تو وہ تکلیف ہے جس پر ہزار راحتیں قربان اسی طرح اگر تعلق مع اللہ صحیح معنوں میں پیدا

---

[1]:۔ اگر دو سو زنجیریں بھی ہوں تو نکلنا آسان مگر اس محبوب کی زلف سے نکلنا مشکل۔ [2]:۔ راحت سے تبدیل ہو جائے گی۔ [3]:۔ تیری تلوار سے ہلاک ہونا دشمن کو نصیب نہ ہو۔ تو خنجر آزما ہم دوستوں کے سر سلامت ہوں۔

ہوگیا ہے تو تمام احکام خداوندی بجالانے میں لذت ہی لذت آئے گی اور کوئی بھی تکلیف محسوس نہ ہوگی۔

تعلق مع اللہ نصیب ہونے کا اثر

اب سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ پھنس جانے سے وحشت نہ ہونی چاہئے، وہ صورۃً پھنس جاتا ہے اور حقیقۃً دولت ہی دولت مل جاتی ہے، مثال مذکور سے سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ اپنے کو شریعت کی آغوش میں دینا محبوب کی گولی میں دینا ہے، اگر آغوش محبوب سے نکلنا پسند ہے تو مبارک ہو، شریعت کو بھی چھوڑ دو، مگر کیا ایسا ہوسکتا ہے؟ اسی واسطے میں نے کہا تھا کہ لا إلہ إلا اللہ کہکر پھنس گئے تو پھنس گئے، جیسے نکاح میں قَبِلتُ[1] کا لفظ کہہ کر پھنس گئے تو پھنس گئے، سارے حقوق نکاح کے اسی قبلتُ میں آگئے، وہاں ایک محبوب مجازی کے پھندے میں پھنس گئے، یہاں محبوب حقیقی کے پھندے میں پھنس گئے، بس لا إلہ إلا اللہ کا کہنا کیا ہوا کہ چاروں طرف سے جکڑ جانا ہوا، اب اس خیال کی غلطی سمجھ میں آ گئی ہوگی جس میں من قال لا إله إلا الله سے یہ استنباط[2] کیا تھا کہ صرف توحید کا قائل ہونا نجات کے لئے کافی ہے، اجی حضرت! توحید تو توحید اس جال میں پھنس جانے کے بعد تو مستحبات کو بھی نہ چھوڑ سکیں گے، اور اس مباح کے پاس بھی نہ جاسکیں گے، جس میں ذرا کھٹکا ہوگا کہ شاید محبوب کو ناپسند ہو۔

اعرابی کی مثال ذکر کرنے کا مقصد

غرض یہ سب عنوانات ہیں اور ضابطے ہیں، جن سے احکام کم نہیں ہوتے، بلکہ ان کے سمجھنے میں اور یاد رکھنے میں سہولت ہو جاتی ہے، جیسے حضور نے اس اعرابی کو تمام دین کی جان بتادی کہ بس لا إلہ إلا اللہ پر جمے رہو، یہ تمام دین کی جان اس لئے ہے کہ توحید پر جمے رہنا اور توحید کی حفاظت تمام حقوق محبوب حقیقی کی حفاظت ہے، اس میں تمام دین آ گیا، خواہ اصول ہوں یا فروع اور واجبات ہوں یا مستحبات اور اس کلمۂ توحید کے بعد جو بات بھی دین کی بتلائی جائے گی وہ سب اسی کے اجزاء ہوں گے، جیسے ازدواج کے تمام حقوق نکاح ہی کے اجزاء ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اس سائل کو تعلیم فرمائی قل اٰمنت باللہ اس میں مختصر عنوان سے تمام دین کی تعلیم کردی پھر فرمایا ثم استقم یعنی دین کے تمام اجزاء پر جمے رہنا یہ نبی ہی کی تعلیم ہوسکتی ہے کہ ایسے مختصر جملہ میں سب کچھ

---

[1]: ۔ میں نے قبول کیا۔ [2]: ۔ مسئلہ نکالا تھا۔

تعلیم کردیا۔

یہ اعرابی کی حکایت[1] میں نے اس واسطے پیش کی کہ کسی کام کا ضابطہ بنادینے سے اس کے اجزاء کے استحضار[2] میں سہولت ہو جاتی ہے، یہ نہیں کہ ان اجزاء میں اختصار ہو جاتا ہے جیسا اس شخص نے سمجھا جس نے من قال لا إله إلا الله سے یہ استدلال کیا کہ صرف توحید کا اعتقاد کافی ہے نہ رسالت کے اعتقاد کی ضرورت ہے نہ اعمال کی، اس کو میں نے بسط کے ساتھ عرض کردیا، اسی قبیل سے یہ لفظ ہے إن فی ذلک لذکری لمن کان له قلب اس میں بھی ایک ضابطہ بتلا دیا گیا ہے قرآن سے نفع ہونے کا، اس کے اندر سب باتیں دین کی داخل ہوگئی ہیں۔

گُر اور اس کے فائدے

اور یہ ضابطہ ایسا جامع ہوگیا جیسے حساب دانوں کے یہاں گر ہوتے ہیں جن کو گر یاد ہوتے ہیں وہ کیسی جلدی حساب کرلیتے ہیں، اس کی وجہ یہی ہے کہ وہ گر جانتے ہیں باقاعدہ ضرب تقسیم سے حساب لگانے والا جس حساب کو منٹوں میں نکال لے گا، اسی کو گر جاننے والے سیکنڈوں میں نکال دیتے ہیں، اور باقاعدہ حساب لگانے والے کو قلم، دوات، پنسل، کاغذ، تختی، سلیٹ کی ضرورت ہوتی ہے، اور گُر جاننے والوں کی زبان پر حساب کے گُر رکھے ہوئے ہیں، بات یہی ہے کہ ان کو حساب کے گُر یاد ہوتے ہیں، مثلاً جتنے روپے کی سیر بھر چیز اتنے آنے کی چھٹانک بھر یا جتنے روپیہ کا ایک گز کپڑا، اتنے آنے کا ایک گرہ، اس سے ہزاروں روپیہ کا حساب ذرا سی دیر میں زبانی ہی لگا لیا جاتا ہے، غرض گر بھی تو ایک ضابطہ ہی کا نام ہے جو استقراء[3] کے بعد وضع کرلیا جاتا ہے، گُر کا فائدہ یہ ہے کہ حساب کرنے میں بہت سہولت اور جلدی ہوتی ہے۔

قرآن سے نفع حاصل کرنے کا گر

اسی طرح حق تعالیٰ نے بھی اس آیت میں گُر بتا دیا ہے قرآن سے نفع ہونے کا، تو دیکھئے ایک گُر کتنے استقراء کے بعد وضع[4] ہوتا ہے، اگر ہم قرآن سے نفع اٹھانے کا گر وضع کرتے تو کتنے استقراء کی ضرورت ہوتی، اور کتنے زمانہ میں اس میں کامیابی ہوسکتی تھی، پھر بھی ہمارا ذہن کہاں تک پہنچ سکتا تھا، لہٰذا یہ بالکل سچی بات ہے کہ برسوں کی محنت بھی اس کے لئے کافی نہ ہوتی، پس قدر کیجئے

---

[1]:۔ دیکھیں گذشتہ ص (۳۳)۔ [2]:۔ اس کے اجزاء کو سامنے رکھنے میں۔ [3]:۔ تلاش وجستجو۔ [4]:۔ بناتے۔

حق تعالیٰ کی رحمت کی کہ ہم کو اس محنت سے بچا دیا، اور اپنی طرف سے خود ہی اس گُر کی تعلیم کر دی جس کا مختصر عنوان علم و ہمت ہے۔

اعمال میں کوتاہی کی وجہ

اب جس عمل میں کوتاہی ہوگی انہیں کی کمی سے ہوگی، مثلاً کسی کی نماز قضاء ہوگئی تو اس کی وجہ یہی ہوگی کہ یا تو اس کی فرضیت ہی اس کو معلوم نہیں، ظاہر ہے کہ جب ایک چیز کو آدمی ضروری نہیں سمجھتا تو اس کو وہ کرے گا کیوں، یا اگر فرضیت تو معلوم ہے لیکن ہمت نہ ہوئی، کسی کام میں مشغول تھے یا سو رہے تھے نماز قضاء ہوگئی، غرض کوئی کام ایسا نہیں نکلے گا جس میں کوتاہی انہیں دونوں کی کوتاہی سے نہ ہو، اور یوں تو عام طور سے دونوں ہی میں کوتاہی ہو رہی ہے لیکن ان میں سے بھی ہمت میں زیادہ کوتاہی ہے یعنی علم کی تو ذہنوں میں کچھ وقعت بھی ہے اور اس کو صحیح سمجھتے ہیں کہ علم نہ ہوگا تو عمل بھی نہ ہوگا، لیکن ہمت اور قصد[1] کی تو قریب قریب بالکل ہی وقعت نہیں، بہت سے لوگ مسائل کو جانتے ہیں لیکن ان پر عمل نہیں کرتے اس کی وجہ یہی ہے کہ قصد نہیں کرتے۔

بہت سے لوگ مشائخ کے مرید ہوتے ہیں صرف اس قصد سے کہ سارا بار انہیں کے ذمہ ڈال دیں اور خود کچھ کرنا نہ پڑے، یہ وہی بات تو ہے کہ خود قصد کی ضرورت ہی نہیں سمجھی جاتی اور اس غلطی میں صرف عام لوگ ہی مبتلا نہیں بلکہ پڑھے لکھے بھی مبتلا ہیں، ہم طلبہ سے بھی جب اعمال میں کمی ہوتی ہے تو صرف قصد کی کمی کی وجہ سے ہوتی ہے، بات دراصل یہی ہے کہ ہم نے علم کی طرف تو توجہ کی، اور جیسی توجہ تحصیل علم کی طرف کی ویسی توجہ قصد کی تحصیل کی طرف نہیں کی، علم کی تحصیل کے لئے تو بہت وقت صرف کیا مگر قصد کی تحصیل کے لئے کچھ بھی وقت صرف نہیں کیا، بُری بھلی کتابیں ختم کرنے کے بعد بے فکر ہوگئے اور یہ سمجھ لیا کہ بس علم ہی کافی ہے، حالانکہ یہ فاش[2] غلطی ہے۔

دیکھئے کسی نے ہر قسم کی مٹھائی بنانے کا علم تو حاصل کر لیا، اور اس کی تحصیل میں بڑی بڑی محنتیں کیں اس فن کی تمام کتابیں جمع کر لیں، اور ساری عمر اس میں صرف کر دی، لیکن کبھی مٹھائی کھانے کا قصد نہیں کیا، تو آپ بتا سکتے ہیں کہ کبھی اس کا منہ میٹھا ہوگا؟ ہرگز نہیں، جس کی وجہ بجز[3] اس کے کیا ہے

---

[1]:۔ ارادہ [2]:۔ بڑی۔ [3]:۔ سوائے۔

کہ اس نے قصد نہیں کیا۔

ہمت کی اہمیت ذہنوں میں پیدا کرنے کی ضرورت

دیکھئے قصد وہ چیز ہے کہ فرض کیجئے آپ کو سوتے میں پیاس لگی اور آنکھ کھل گئی مگر چونکہ کسل غالب ہے اس پیاس کو گوارا کیا اور پڑے رہے تو یہاں مقصود حاصل ہونے میں کس چیز کی کسر ہے؟ علم تو ہے یعنی حس ہے کہ پیاس لگی ہوئی ہے لیکن اٹھ کر پانی پینے کا قصد نہیں ہوا، اس لئے پیاسے رہے، اس کے بعد فرض کیجئے کہ اسی شخص کے پاس اس وقت حاکم کا حکم پہنچا کہ اسی وقت حاضر ہو، تو آپ فورا کھڑے ہو جاتے ہیں اور دو میل کا سفر طے کر کے حاکم کے ڈیرے پر پہنچتے ہیں حتی کہ سردی بھی لگی زکام بھی ہو گیا لیکن کام ہو گیا، اور کسل مانع نہ ہو سکا، بتائیے اس وقت ایک ہی شخص سے دو مختلف فعل کس چیز کے فرق سے صادر ہو گئے؟ ابھی تو اٹھا بھی نہیں جاتا تھا حتی کہ پیاس کی تکلیف گوارا کی یا ابھی ایسا چاق وچوبند[1] ہو گیا کہ سردی اور زکام سب کو برداشت کر لیا، اسی کو قصد کہتے ہیں، جب آدمی نے سمجھ لیا کہ جانا تو ہے ہی، کیونکہ حاکم کا حکم آچکا ہے تو اسی شخص سے جس سے پانی لانے کے لئے چار قدم نہ چلا گیا تھا اب چار میل چلا گیا، غرض قصد اتنی بڑی چیز ہے، اسی کا ترجمہ ہمت ہے، بس اسی کی ضرورت ذہنوں میں بہت کم ہو گئی ہے، اور اس کے حاصل کرنے کی طرف توجہ بھی نہیں جیسے علم حاصل کرنے کی طرف بعض کو کسی درجہ میں ہے۔

ہمت میں کمی کے نقصانات

غرض قرآن سے نفع حاصل کرنے کی دو شرطیں تھیں جن میں ایک تو کسی درجہ میں ہے بھی لیکن دوسری قریب قریب بالکل ہی نہیں، اس واسطے نفع نہیں ہوتا، یعنی علم تو کسی درجہ میں ہے بھی، لیکن اس پر عمل کرنے کا ارادہ قریب قریب بالکل ہی نہیں کرتے، اس میں شکایت صرف مولویوں کی نہیں، بلکہ ہر وہ شخص جو کسی مسئلہ کو جانتا ہے وہ اس کا عالم ہے، وہ سب اسی شکایت میں داخل ہیں، سب نے ہمت ہار دی ہے، اسی وجہ سے طرح طرح کی مشکلیں پیش آتی ہیں، مثلا ہمت ہی میں کمی ہے جو کہا جاتا ہے کہ اس زمانہ میں بلا سود کے گذر نہیں یا کہا جاتا ہے کہ بلا رشوت کے گذر نہیں یا کہا جاتا ہے کہ باغوں کی بہار[2] پھل آنے سے پہلے بیچنے کے بغیر گذر نہیں۔

میں کہتا ہوں کہ اگر حاکم وقت سود اور رشوت کو جرم قرار دیدے اور ایسے ہی بہار قبل از وقت

---

[1]:۔ چست۔ [2]:۔ پیداوار۔

بیچنے کی بھی قانوناً ممانعت کردے تو کیا پھر بھی کسی کو ہمت ہوگی ان کے کرنے کی؟ اس وقت یہ سب عذر رخصت ہوجائیں گے، دیکھئے رشوت کے لینے میں حق تعالیٰ کے سامنے یہ عذر کیا جاتا ہے کہ اس کے بغیر گذر کیسے ہوگی؟ اگر یہ عذر چلنے والا ہے تو اس کو حاکم کے سامنے بھی پیش کیجئے اور کھلم کھلا رشوت لیا کیجئے، اور یہی کہئے کہ ہم مجبور ہیں، دیکھیں وہ اس عذر کو سن لے گا یا نہیں، اور علانیہ رشوت لینے کی اجازت دے گا یا نہیں، حاکم کے قانون میں رشوت منع ہے اس واسطے کوئی عذر آپ کا نہیں چلتا، اور علانیہ رشوت نہیں لے سکتے، اور کبھی حاکم کو علم ہوجاتا ہے اور ثبوت ہوجاتا ہے تو اس پر سزا بھی ہوجاتی ہے، اور حق تعالیٰ کو تو ہر وقت علم ہے ان کی سزا کا خوف کیوں نہیں ہوتا؟ غرض سزا کے خوف سے حاکم کے سامنے رشوت نہیں لے سکتے، اس کا حاصل یہی تو ہے کہ خوف کی وجہ سے عزم ہوجاتا ہے رشوت سے بچنے کا، اور جب عزم ہوجاتا ہے تو پھر کام تو بلا رشوت لئے بھی چلتا ہی ہے، غرض کمی ہے تو عزم کی ہے، سود اور رشوت کے چھوڑنے کا چونکہ عزم نہیں ہے اس واسطے بہانے ڈھونڈھے جاتے ہیں، ایسے لوگ بھی بکثرت ہیں جنہوں نے باوجود قلت آمدنی کے پکا ارادہ کرلیا کہ سود اور رشوت نہ لیں گے، چنانچہ عمر بھر نہیں لیا، اور اسی برس کی عمر میں انتقال کیا ان کی ضرورت کون سی اٹکی رہی۔

ضرورتوں کو بڑہانے کی وجہ سے غلط سوچ کا پیدا ہونا

اب بعض لوگ یہ کہہ دیتے ہیں کہ اگر سود اور رشوت نہ لیں تو خرچ کہاں سے چلے، میں کہتا ہوں کہ خرچ کیا ہے، کیا اسی کا نام خرچ ہے کہ پاؤ بھر گھی ایک وقت میں کھایا جائے؟، اور تنزیب[۱] ہی پہنی جائے، خرچ کو کم کرو، آخر خرچ کو کسی حد پر جاکر ختم کرتے ہی ہو، کیا کوئی مرتبہ ایسا نہیں نکلتا کہ اس سے زیادہ خرچ نہ کیا جاوے!؟ اگر سو روپیہ مہینہ خرچ کروگے تو ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو ایک ہزار روپیہ مہینہ خرچ کرتے ہیں، تو ان کی برابری کی ریس کیوں نہیں کرتے، اور ایسے بھی لوگ موجود ہیں جو پانچ روپیہ مہینہ خرچ کرتے ہیں ان کی ریس کیوں نہیں کرتے، غرض ضرورتوں کو بڑھالیا پھر کہتے ہیں کہ بلا رشوت کے گذارہ کیسے ہو۔

خرچ بڑھانے کی ضرورت ہی کیا ہے

کسی نے غالب کو ایک خط نظم میں لکھا تھا اس میں لفظ ''ید'' مشدد تھا جس کے حاشیہ پر یہ لکھ دیا ''تشدید'' بضرورت شعر، غالب بہت مسخرہ تھا اس نے جواب میں یہ شعر لکھ بھیجا

؎ چہ خوش گفت فالقّ شاعرّ غرّا کہ کس ہچومن ذہن رسّا نباشد

۱:۔ ہندوستان میں ایک قسم کے باریک کپڑے کا نام (نور اللغات ۲/۲۰۲)

چو مقام ضرورت شعر افتد تشدید جائز چرا نباشد

اس طرح اس کے فعل کا قبح اس جوابی شعر میں دکھا دیا، جس کا حاصل یہ تھا کہ شعر گفتن چہ ضرور[1]، اسی طرح خرچ بڑھانے کو میں کہتا ہوں کہ خرچ افزوں چہ ضرور[2]، ایسے خرچ ہی کرنے کی کیا ضرورت ہے جس کے لئے سود اور رشوت لینے کی ضرورت پڑے؟، اسی کی تعلیم جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ایک دعاء میں ہے وہ دعاء مقفی[3] ہے نظم نہیں ہے کیونکہ حضور کے ارشادات نظم میں نہیں ہوتے تھے وماعلمناه الشعر وما ینبغی له[4] وہ دعا یہ ہے ومن علم لاینفع وقلب لایخشع ومن نفس لاتشبع یہاں تک دعا مقفیٰ چلی آتی ہے اگلا جملہ ہے ومن دعوة لایستجاب لها[5]، یہاں قافیہ چھوڑ دیا، میں جب حدیث پڑھاتا تھا تو یہ وسوسہ ضرور ذہن میں آتا تھا کہ یہ جملہ بھی مقفیٰ کیوں نہ ہوا، اس کا مقفی ہونا کچھ مشکل نہ تھا ہم جیسے بدلیاقت آدمی بھی چاہیں تو قافیہ ملالیں، مثلاً یوں کہہ دیتے ومن دعوة لاتسمع لیکن وجہ یہ ہے کہ نبی کا کوئی فعل تعلیم سے خالی نہیں، اس میں تعلیم ہے کہ تصنع[6] سے بچنا چاہئے خصوصاً وہاں میں کیونکہ دعا حق تعالیٰ سے عرض حال اور سوال کا نام ہے، حق تعالیٰ احکم الحاکمین ہیں، حاکم ہونے کا مقتضاء ہیبت ہے، ہیبت کے مقام پر کسی کو آپ نے قصداً اور تکلفاً مقفیٰ عبارت بولتے نہ سنا ہوگا، اس میں تعلیم ہوگئی کہ ضرورت کو خواہ مخواہ تصنیف نہ کرو، اختراعی[7] ضرورت کو آگ لگاؤ، وہ کام کرو جس کا حکم ہے خرچ اتنا مت بڑھاؤ جس کے لئے گناہ کرنا پڑے۔

ناموری کے لئے شادی پر زیادہ خرچ کرنے کی حقیقت

مولانا محمد قاسم صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ایک شادی کے متعلق جس میں بہت زیادہ خرچ کیا گیا تھا جس میں نیت محض ناموری کی تھی یہ فرمایا کہ خرچ تو خوب کیا لیکن اتنے خرچ سے ایسی چیز خریدی جس کو اگر بیچنے لگیں تو پھوڑی کوڑی کو بھی کوئی نہ لے، وہ کیا چیز ہے، نام۔ بس ایسے ہی لوگوں نے اخراجات غیر ضروریہ اختراع کر رکھے ہیں، مرتے ہیں کہتے ہیں برباد ہوتے ہیں مگر ان کو پورا کرتے ہیں، ارے آگ لگاؤ ایسی ضرورتوں کو۔

غیر ضروری اخراجات کی حقیقت

یہ دیکھو کہ شریعت کا حکم کیا ہے، شریعت پر چلنے سے دین تو سدھرتا ہی ہے دنیا کی بربادی سے

---

[1]:۔ شعر کہنے کی ضرورت ہی کیا ہے؟۔ [2]:۔ خرچ بڑھانے کی ضرورت ہی کیا ہے؟۔ [3]:۔ قافیہ والی۔ [4]:۔ سورۃ یٰسین، ۶۹۔ [5]:۔ اللہ کی پناہ ایسے علم سے جو نفع نہ دے، ایسے دل سے جس میں خدا کا خوف نہ ہو، ایسے نفس سے جس کا پیٹ ہی نہ بھرتا ہو اور ایسی دعا سے جو قبول نہ ہو۔ [6]:۔ تکلف۔ [7]:۔ گھڑی ہوئی۔

بھی حفاظت رہتی ہے، ایک شخص نے ایسے غیر ضروری اخراجات کی حقیقت بڑی لطافت سے ظاہر کی، بلند شہر میں ایک رئیس زادے تھے ان کے باپ کا انتقال ہوگیا، لوگوں نے چالیسواں کرنے کے لئے مجبور کیا اس وقت تو وہ مجبوراً راضی ہوگئے، اور جبراً قہراً اپنے باپ کا چالیسواں کیا، جس میں انہوں نے بہت تکلف کیا، ایک پورا کیمپ کا کیمپ گویا تیار کیا گیا، آٹھ دس طرح کے بہت پرتکلف کھانے پکوائے، لیکن جب مہمان دسترخوان پر بیٹھ گئے اور کھانا چن دیا گیا تو قبل کھانا شروع ہونے کے صاحبزادے صاحب تشریف لائے اور کھڑے ہوکر کہا کہ مجھ کو عرض کرنا ہے، جب سب متوجہ ہوگئے تو یہ کہا کہ آپ سب صاحبوں کو معلوم ہے کہ آپ اس وقت کس تقریب میں تشریف لائے ہیں، وہ تقریب یہ ہے کہ میرے باپ کا انتقال ہوگیا ہے اور یہ بھی مسلم[1] ہے کہ باپ سرپرست ہوتا ہے، اس کا سر پر سے اٹھ جانا ظاہر ہے کہ کس قدر صدمہ کی بات ہے، اس کا مقتضاء تو یہ تھا کہ میرے ساتھ ہمدردی کی جاتی، کیا یہی ہمدردی ہے کہ مجھ پر تو اتنا بڑا پہاڑ غم کا ٹوٹ پڑے آپ آستینیں چڑھا چڑھا کر پلاؤ قورمہ کھانے بیٹھ جائیں، اس کے بعد کہا کہ بسم اللہ شروع کیجئے۔

اس تقریر سے سب پر ایسی غیرت سوار ہوئی کہ فوراً اٹھ کھڑے ہوئے اور اسی وقت ایک محضر نامہ لکھا جس پر سب نے دستخط کئے کہ آج سے اس قسم کی سب رسوم موقوف، کسی نے پوچھا کہ صاحبزادہ جب کھلانا ہی نہ تھا تو یہ خرچ ہی کیوں کیا؟ کہا کہ اگر میں یہ سامان نہ کرتا تو اس کو بخل پر محمول کرتے اور کہتے کہ شریعت کو تو محض آڑ بنایا ہے دراصل اپنا خرچ بچایا ہے، اب یہ کہنے کا کسی کو منہ نہیں رہا اور میری اس وقت کی تقریر کا پورا اثر ہوا ورنہ یہ بات نہ ہوتی اور رسم نہ مٹتی، پھر وہ کھانا مساکین کو کھلا دیا اور دعا کی اور باپ کو ثواب بخش دیا۔

اخراجات میں کمی کرنے کی سخت ضرورت ہے

تو واقع میں تخفیف اخراجات کی سخت ضرورت ہے مگر ہم لوگوں نے ایسی آنکھیں بند کی ہیں کہ دین کی تو کیا سوجھتی دنیا کی بھی نہیں سوجھتی، کیرانہ میں کچھ گوجر رہتے ہیں، ایک گوجر کا باپ بیمار ہوا تو اس نے ایک حکیم کو بلا کر اس کے بہت ہاتھ جوڑے اور کہا کہ اجی اب کے تو میرے باپ کو اچھا ہی کردو کیونکہ اس سال چاول بہت مہنگے ہیں، اگر اس وقت مر گیا تو تیجے، دسویں، چالیسویں میں تو میرا دیوالہ ہی نکل جائے گا، دیکھئے باپ کے مرنے کا تو غم نہیں اپنا دیوالہ نکل جانے کا اندیشہ ہے، صاحبو!

---

[1] ثابت شدہ بات۔

یہ کیا حالت ہے کچھ تو عقل سے کام لینا چاہئے، اگر دین کا بھی خیال نہیں تو دنیا ہی کا خیال کیجئے، ذرا دیکھئے تو کہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے، اجی دین کی تعلیم تو وہ چیز ہے کہ اس سے دنیا بھی سدھرتی ہے۔

نئے تعلیم یافتہ پرانی رسموں سے کیوں منع کرتے ہیں

چنانچہ یہ فضول خرچیاں وہ ہیں جن کو نئے تعلیم یافتہ بھی منع کرتے ہیں، اس باب میں وہ بھی علماء کے ساتھ متفق ہیں، مگران پر ہمارا یہ اعتراض ہے کہ یہ آپ کا منع کرنا مسلمانوں کی اصلاح کے لئے نہیں بلکہ اپنے مطلب کے لئے ہے، کیونکہ وہ ان رسوم سے اس واسطے منع کرتے ہیں کہ اپنی پسند کی فضول خرچیوں کی گنجائش ملے اور وہ فضول خرچیاں کیا ہیں، کوٹ، پتلون، اور دوسری فیشن کی چیزیں، چنانچہ دیکھ لیجئے جو نئے تعلیم یافتہ پرانی رسوم کو بند کرتے ہیں وہ اس سے زیادہ اپنی فضولیات میں خرچ کرتے ہیں، تو یہ کہنا صحیح ہے کہ دنیا کو منع کیا گیا دنیا کے لئے، ایک خرابی سے بچے تو اس سے بدتر خرابی میں پڑے، تو جو غرض منع کرنے سے تھی وہ خاک بھی حاصل نہ ہوئی اور یوں کھڑے ہو کر بڑی تیز زبانی سے کہتے ہیں کہ مولویوں کو یہ نظر نہیں آتا کہ مسلمان کس حال کو پہنچ گئے ہیں اس وقت ان کی دنیا درستی کی بھی ضرورت ہے لیکن علماء جب وعظ کہیں گے تو بس نماز کا، روزہ کا، دنیا کو چھوڑنے کا، حالانکہ اب وہ وقت ہے کہ علماء کو چاہئے دنیا کا وعظ کہا کریں۔

علماء دین کے ذمہ دار ہیں یا دنیا کے؟

اس کے متعلق قابل غور یہ بات ہے کہ علماء کے ذمہ دنیا کی تعلیم ہے یا نہیں؟ تقسیم کام کا مسئلہ تو آج کل دنیا بھر کے نزدیک مسلم ہے، علماء بحیثیت رہبر دین ہونے کے دین کے ذمہ دار ہیں یا دنیا کے؟ سارے کام انہیں کے سر کیوں ڈالتے ہو، اگر یہی بات ہے تو ہم کہتے ہیں کہ آپ دنیا کی تعلیم کرتے ہیں، دین کی کیوں نہیں کرتے؟ مولویوں کے کسی وعظ میں تو دنیا کے متعلق بھی بیان سنا ہوگا لیکن آپ کے لیکچروں میں تو کبھی نماز، روزہ، حج، زکوۃ کا بیان سنا ہی نہیں جاتا اور یہ جو آپ رسوم کے متعلق غل شور مچاتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ ہم مسلمانوں کو اسراف سے بچاتے ہیں اور اسراف شریعت میں ممنوع ہے تو گویا دین کی تعلیم بھی کرتے ہیں، کیونکہ گناہ سے بچاتے ہیں تو اس کی حقیقت وہ ہی ہے جو میں نے ابھی بیان کی کہ یہ دین کی تعلیم ہی نہیں، نہ یہ گناہ سے بچاتا ہے، بلکہ یہ تو ایک نوع کے اسراف کو بند کر کے دوسری نوع کے اسراف کے لئے گنجائش نکالنا ہے، پس یہ تو دنیا کی تعلیم دنیا ہی کے لئے ہوئی اور مولوی جو اسراف کو منع کرتے ہیں تو اگر تقسیم کام کا مسئلہ آپ کے نزدیک مسلم نہیں

ہے تو آپ بھی دین و دنیا دونوں کے کام کیجئے اور مولوی بھی دونوں کے کام کریں، اور اگر تقسیم کام کا مسئلہ مسلم ہے جیسا کہ آج دنیا بھر کا اس پر اتفاق ہے تو آپ کو کوئی حق نہیں ہے کہ مولویوں پر اعتراض کریں کہ وہ بس دین ہی دین کا کام کرتے ہیں، دنیا کا کام کیوں نہیں کرتے؟۔

علماء نے اپنے ذمہ دین ہی کا کام کیوں لیا؟

اب اس کا راز سنئے کہ مولویوں نے اپنے ذمہ صرف دین ہی کا کام کیوں لیا ہے بات یہ کہ گو دنیا بھی بقدر ضرورت ہے لیکن پھر بھی دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، کیونکہ دین کے سامنے دنیا کی کچھ بھی تو حقیقت نہیں وہ باقی ہے یہ فانی ہے، وہ کامل ہے یہ ناقص، لیکن باوجود اس تفاوت[1] کے معاملہ برعکس ہے کہ دنیا کی ضرورت اور اہمیت تو سب کے ذہنوں میں ہے اور دین کی ضرورت سے غفلت ہے، اسی لئے علماء نے دین کی ترغیب و تعلیم کو اپنے ذمہ لے رکھا ہے، رہی دنیا سو اول تو خود ہی اس کی ضرورت کو لوگ سمجھے ہوئے ہیں، دوسرے اس کی تعلیم آپ لوگوں نے اپنے ذمہ لے ہی رکھی ہے، گو اس کا طریق جو آپ نے اختیار کیا ہے وہ غلط ہے اور علماء اس غلطی کو بھی ظاہر کرتے رہتے ہیں۔

پس اس حالت میں آپ کا علماء کی شکایت کرنا ایسا ہے جیسا فرض کیجئے حکیم عبدالمجید خان کے پاس ایک مریض پہنچا، اس کو دیکھ کر حکیم صاحب نے تشخیص کیا کہ مرض سخت ہے اور اندیشہ ہے کہ اگر علاج فورانہ کیا گیا تو دق ہو جاوے، پھر بہت غور کے ساتھ نسخہ لکھ کر دیا کہ اس کا باقاعدہ استعمال کرو جب وہ نسخہ لکھوا کر لوٹا تو دروازہ پر ایک چمار بھی بیٹھا ہوا تھا، اس نے پوچھا کہ حکیم جی نے کیا بتلایا، اس نے سب حال سنا دیا، اس پر چمار نے کہا کہ تمہاری جوتیاں بھی تو پھٹی ہوئی ہیں ان کے سلوانے کے لئے حکیم جی نے کوئی بھی مشورہ نہیں دیا، بس صرف نسخہ لکھ دیا، اس سے یہی کہا جائے گا کہ ارے یہ تو تیرا کام ہے حکیم جی کا کام نہیں، البتہ حکیم صاحب جوتی سلوانے سے منع نہیں کریں گے، لیکن اگر وہ چمار اس طور پر جوتی سینے لگے کہ جوتی کے ساتھ پاؤں میں سے بھی سوا نکلنے لگے تو اس وقت حکیم صاحب ضرور اپنا فرض منصبی سمجھ کر کہ بدن کو ضرر سے بچانا ضروری ہے اس فعل کو منع کریں گے، اسی طرح علماء دنیا سے منع نہیں کرتے لیکن جب وہ یہ دیکھیں گے کہ دنیا سے دین کا نقصان ہو رہا ہے اور دنیا کی تحصیل کے لئے خلاف دین طریقے استعمال کئے جارہے ہیں اس وقت ان کا فرض منصبی ہوگا کہ

---

[1]: فرق۔

وہ مسلمانوں کو دین کے ضرر سے بچاویں اگر چہ دنیا کے حصول میں کچھ کمی واقع ہوتی ہو، خلاصہ یہ کہ جب علماء اپنا فرض منصبی ادا کر رہے ہیں پھر ان پر اعتراض کیسا۔

البتہ اگر علماء دین کی تعلیم کرنے کے ساتھ ساتھ دنیا کے کاموں سے بالکل روکتے، مثلاً یہ کہتے کہ کھانا مت کھاؤ، کپڑا مت پہنو، مکان مت بناؤ، تجارت مت کرو، تب تو یہ اعتراض کسی درجہ میں صحیح بھی ہوتا، لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ علماء دین کی تعلیم تو خود کرتے ہیں اور دنیا کو حدود دین کے اندر رکھتے ہوئے آپ کی رائے پر چھوڑتے ہیں، پھر ان پر کیا اعتراض۔

علماء پر ایک غلط اعتراض اور اس کا جواب

یہاں تک تو تعلیم یافتہ لوگوں سے خطاب تھا، ان سے بڑھ کر بعض بیباک جاہل یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ گناہ کریں گے تو ہم خود بھگتیں گے آپ کو کیا پڑی؟ میں کہتا ہوں کہ واقعی بھگتیں گے تو آپ ہی، لیکن علماء کے ذمہ بھی تو فرض ہو گیا کہ آپ کو متنبہ کریں، وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہونا چاہتے ہیں، پھر آپ جانیں اور آپ کا کام، انہیں جاہلوں میں سے بعض لوگ یہ بھی کہہ دیتے ہیں کہ مولوی کہتے ہیں کہ گناہ کا وبال آئے گا، ہم تو دیکھتے ہیں کہ گناہ کرنے والے چین کرتے ہیں، کسی کا کان بھی گرم نہیں ہوتا، علماء کی کچھ عادت ہی ہو گئی ہے کہ بات بے بات گناہ گناہ ہی پکارتے رہتے ہیں اور دنیا کی ان کو خبر نہیں کہ غیر قومیں تو دھڑا دھڑ سود لے رہی ہیں اور بڑھی چلی جاتی ہیں، نہ کسی پر کوئی وبال آتا ہے نہ کچھ ہوتا ہے میں کہتا ہوں کہ کسی چیز سے فوراً نقصان نہ ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ آئندہ بھی اس کا نقصان ظاہر نہ ہوگا۔

دیکھئے کوکین کھانے سے فوری کونسی تکلیف ہوتی ہے کوئی بھی نہیں، بلکہ فائدے حاصل ہوتے ہیں، جن کے واسطے وہ کھائی جاتی ہے، لیکن اگر طبیب کسی کو کوکین کھاتے دیکھ لے تو وہ ضرور منع کرے گا، کیونکہ وہ جانتا ہے کہ گو اس وقت تو اس کا کوئی نقصان ظاہر نہیں ہوا لیکن انجام اس کا خون کا خشک ہو جانا اور مہلک امراض کا پیدا ہونا ہے، اس واسطے وہ منع کرتا ہے، وہاں کوئی یہ نہیں کہتا کہ لوگ کوکین سے کیا فائدہ حاصل کر رہے ہیں، نہ کسی کا خون خشک ہوتے دیکھا، نہ کسی کو مرتے دیکھا، اور حکیم صاحب ہیں کہ منع ہی کرتے رہتے ہیں، اگر کوئی ایسا کہے تو اسی کو بیوقوف بنایا جائے گا نہ کہ حکیم صاحب کو۔

اسی طرح یہاں سمجھ لیجئے کہ یہ ظاہری کوکین دنیا میں مضر ہے، اور غفلت اور معصیت کی کوکین

آخرت میں مضر ہوگی، پس علماء کا احسان ماننا چاہئے کہ وہ اس سے منع کرتے ہیں، گناہ سے صرف چند روز کی آسائش ہے لیکن جب آدمی مرے گا تو کہے گا کہ مولوی سچ کہتے ہیں، لیکن اس وقت اس کہنے سے کیا ہوتا ہے، مولوی دنیا کو منع نہیں کرتے اور دنیا کی باتوں میں دخل نہیں دیتے، ہاں جب ضرر دینی کی نوبت آجاتی ہے تب وہ دخل دیتے ہیں، اور منع کرتے ہیں، تو اب وہ شبہ نہ رہا کہ مولوی دنیا کو منع کرتے ہیں، اور وہ جو آپ نے کہا تھا کہ مولوی دنیاوی تعلیم نہ کریں تو دنیا سے منع بھی تو نہ کریں اس کا حل ہوگیا۔

علماء پر اعتراضات کی وجہ

حقیقت یہ ہے کہ ان اعتراضات کی بناء ہی غلط فہمی پر ہے، آپ علماء سے ملتے نہیں آپ کو ان کے حالات معلوم نہیں، دور بیٹھے جو چاہتے ہیں ان پر تہمت لگا دیتے ہیں، اور اس کے ساتھ ہی ایک یہ وجہ بھی ہے کہ آپ کے قلب میں ان کی عظمت نہیں۔

دینی نقصان سے بچانے کے لئے علماء کی تدبیر

اور میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ وہ حضرات دنیائے مباح[1] کو تو کیوں منع کرتے بعض اوقات دنیائے غیر مباح کو بھی کسی بڑے دینی ضرر سے بچانے کے لئے گوارا کر لیتے ہیں، مثلاً ایک شخص ہے کہ وہ کسی ناجائز نوکری میں مبتلا ہے اور اس کے پاس اور کوئی جائز ذریعہ معاش نہیں ہے اس کو احساس ہوا کہ میں ناجائز کام کرتا ہوں اب وہ کسی محقق عالم سے پوچھتا ہے کہ میں یہ نوکری چھوڑ دوں تو وہ بحالت موجودہ اس کو یہ جواب دیتے ہیں کہ نہیں جلدی نہ کرو کسی جائز ذریعہ معاش کا انتظام کرلو پھر چھوڑنا، اور ایسی حالت میں وہ حضرات اس واسطے منع نہیں کرتے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ اس وقت تو وہ ایک ہی گناہ میں مبتلا ہے، اس کو چھوڑ کر بہت ممکن ہے ناداری کا تحمل نہ ہونے سے بہت سے گناہوں میں مبتلا ہو جائے، کیونکہ احتیاج وہ چیز ہے کہ اس کی بدولت بہتوں نے خودکشی کرلی ہے، بہت سے نعوذ باللہ مرتد ہوگئے ہیں، تو وہ محقق اندازہ کر لیتے ہیں کہ اس کے قلب میں تحمل نہیں، اگر میں اس نوکری کو چھوڑنے کی اجازت دے دوں گا تو پھر ایمان تک کی خیر نہیں، البتہ اگر وہ یہ دیکھتے ہیں کہ کسی میں صفت تحمل موجود ہے تو پھر اس کو بلا ضرورت ناجائز میں مبتلا رہنے کی ہرگز اجازت نہیں دیتے، کیونکہ ایسی صورت میں ایسا کرنا جائز ہی کہاں ہوسکتا ہے۔

---

[1]: جائز۔

تحمل پیدا کرنے کا طریقہ

اور جب تحمل اتنی بڑی چیز ہے تو میں اس تحمل کے پیدا ہونے کا طریقہ بتلاتا ہوں وہ طریق غلبہ محبت الٰہی کا حاصل کرنا ہے، یہ غلبہ محبت وہ چیز ہے کہ جو مشکل سے مشکل چیز کو آسانی کر دیتی ہے، دیکھو دنیا میں سب سے مشکل چیز موت ہے، جس کے نام سے بھی ہم لوگوں کو موت آتی ہے، مگر اہل محبت کے قصہ پڑھیئے، وہ تو موت کی تمنائیں کرتے ہیں۔ ایک بزرگ کہتے ہیں ؎

خرم آن روز کزیں منزل ویراں بروم　　راحت جان طلبم وز پئے جاناں بروم
نذر کردم کہ گر آید بسر ایں غم روزے　　تا در میکدہ شادان وغزل خواں بروم [۱]

ایک بزرگ انتقال فرماتے وقت یہ اشعار پڑھتے ہیں ؎

چیست توحید آنکہ از غیر خدا　　فرد آئی در خلاؤ در ملا
وقت آں آمد کہ من عریاں شوم　　جسم بگذارم سراسر جاں شوم [۲]

موت کا آسان ہو جانا تو کیا معنی ان کے تو حوصلے ہی کچھ اور ہو جاتے ہیں، ایک بزرگ جن کا نام ابن الفارض ہے، ان کے روبرو مرتے وقت آٹھوں جنتیں پیش کی گئیں، ہمارے نزدیک تو اس سے بڑھ کر کیا چیز ہو سکتی تھی، مگر انہوں نے فوراً منہ پھیر لیا اور یہ شعر پڑھا۔ ؎

إن كان منزلتي في الحب عندكم　　ما قد رايت فقد ضيعت ايامي [۳]

یہ ایک خاص حالت تھی اس وقت ان کی نظر جنت سے بھی بڑی نعمت پر تھی، یعنی لقائے حق [۴] جو مقصود بالذات ہے، اور جنت بھی اسی لئے مطلوب ہے کہ وہاں یہ نعمت نصیب ہوگی، اسی کو کہا گیا ہے ؎

چوں بجنت وعدۂ دیدار آمد لاجرم　　عاشقان جنت برائی دوست میداند دوست [۵]

غرض حضرت ابن الفارض پر مرتے وقت ایک خاص کیفیت طاری تھی جس کے اثر سے انہوں نے

---

[۱]:۔ وہ دن کتنا اچھا ہوگا جب میں اس ویران جگہ دنیا سے روانہ ہوں گا۔ دل کی راحت حاصل کروں گا اور محبوب حقیقی کی طرف جاؤں گا۔ میں نے نذر مان لی ہے کہ اگر غم کے یہ دن گذر گئے تو میں مے کدہ (جنت) کے دروازہ تک خوشی بخوشی گاتا ہوا جاؤں گا۔　[۲]:۔ توحید اس کے سوا کیا ہے کہ جلوت اور خلوت میں خدا کے علاوہ سب سے تنہا ہو جاؤں۔ وہ وقت آ گیا ہے کہ میں بھی تنہا ہو جاؤں جسم کو چھوڑ کر سرتاپا روح بن جاؤں۔　[۳]:۔ اگر آپ کے نزدیک میری محبت کا یہی مرتبہ ہے جو میں نے دیکھا تو میں نے اپنے دن ضائع کر دیئے۔　[۴]:۔ اللہ تعالیٰ سے ملاقات۔　[۵]:۔ کیونکہ جنت میں دیدار کا وعدہ ہے اس لئے جنت کے عاشق دوست کے دیدار کی خاطر جنت کو دوست رکھتے ہیں۔

جنتوں کے بھی پیش کیے جانے پر اپنا منہ پھیر لیا اور مذکورۂ بالا شعر پڑھا، بس پھر اسی وقت ان سے وہ جنتیں محجوب[۱] کردی گئیں اور ایک تجلی خاص ہوئی اور دم نکل گیا، غرض یہ وہ حضرات تھے جن میں محبت حق ساری چیزوں پر غالب تھی حتی کہ محبت جنت پر بھی، یہاں سے حضرت قلندر رحمۃ اللہ علیہ کے اس قول کی شرح ہوتی ہے ؎

گر بیاید ملک الموت کہ جانم ببرد تا نہ بینم رخ تو روح رمیدن ندہم [۲]

واقعی ان کے نزدیک موت مکروہ تو کیا ہوتی بلکہ محبوب ہے، کیونکہ وہ وسیلہ ہے ان کے مقصود کے حاصل ہونے کا، غرض غلبۂ محبت الٰہی ایسی چیز ہے کہ جو ہر چیز کا تحمل پیدا کر دیتی ہے، اسی لئے محققین طالب کے قلب میں پہلے اس کو پیدا کرتے ہیں اس کے بعد ناجائز نوکری وغیرہ چھڑاتے ہیں، بلکہ پھر تو ان کو خود اس باب میں کہنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، وہ آپ ہی چھوڑ دیتا ہے، بلکہ اگر کوئی منع بھی کرتا ہے تو رسّیاں توڑا کر اس سے کوسوں بھاگتا ہے، ایسے ناجائز کام پھر اس سے ہو ہی نہیں سکتے، اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ ان حضرات کا کسی ناجائز کام سنے فی الحال منع نہ کرنا اس کے جواز کی بناء پر نہیں بلکہ دو ناجائز چیزوں میں سے جس کا مفسدہ شدید[۳] تھا اس سے بچانے کے لئے خفیف[۴] مفسدہ کو عارضی طور پر گوارا کر لیتے ہیں۔

اس لئے ان پر اعتراض بھی نہیں ہوسکتا کہ یہ حضرات بعض کو ناجائز نوکری سے کیوں منع نہیں کرتے، وہ منع ضرور کرتے ہیں مگر تدبیر اور سلیقہ سے، اور اس طرح کہ پھر جڑ ہی کٹ جائے، اگر اس وقت منع کریں تو دو چار دن کو وہ نوکری چھوڑ دے گا لیکن پھر گھبرا کر کریگا یا اس سے بھی بدتر مفاسد میں مبتلا ہوگا، اور اس تدبیر سے چھڑانے کے بعد اس کو پھر کبھی وسوسہ بھی نہیں آئے گا، اس بات کو محققین ہی سمجھ سکتے ہیں کہ کس کا تحمل کتنا ہے؟ جس کو وہ دیکھتے ہیں کہ ابتداء ہی سے تحمل ہے اس کو وہ ابتداء ہی سے روکتے ہیں، اس تشخیص میں وہ مجتہد ہیں ان سے منازعت[۵] کا کسی کو حق نہیں، اگر بالفرض وہ غلطی بھی کریں گے تو مجتہد کی غلطی قابل گرفت نہیں، اس صورت میں بھی ان کو اجر ملتا ہے وإذا اخطأ فله اجر[۶]، اب دونوں شبہے رفع ہوگئے، یہ شبہ بھی کہ مولوی دنیا کو منع کرتے ہیں، چنانچہ معلوم ہو گیا کہ

۱:۔ سامنے سے ہٹادی گئیں۔ ۲:۔ اگر ملک الموت میری جان لینے آئیں تو میں جب تک آپ کی تجلی کا دیدار نہ کرلوں روح نکلنے نہیں دوں گا۔ ۳:۔ سخت۔ ۴:۔ ہلکا۔ ۵:۔ جھگڑا کرنے کا۔ ۶:۔ ایسی صورت میں خطا پر بھی ثواب ملتا ہے۔

مولوی دنیا کو منع نہیں کرتے حتی کہ بعض اوقات دنیائے ناجائز کو بھی منع نہیں کرتے، اور یہ شبہ بھی کہ ناجائز کام کو کیوں منع نہیں کرتے وہ بھی حل کر دیا گیا کہ منع کرتے ہیں، لیکن تمام پہلوؤں پر نظر کر کے۔ اب آپ کا یہ الزام بالکل غلط ہو گیا کہ مولوی دنیا کو منع کرتے ہیں، البتہ یہ پہلے بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وہ خود تعلیم دنیا کی نہیں کرتے کیونکہ یہ ان کا کام نہیں اور جس دنیا کو وہ منع کرتے ہیں وہ دنیا وہی ہے جو دین میں مضر ہے یعنی جو دنیا دین کو خراب کرتی ہے سو اس سے منع کرنا ان کے فرائض میں داخل ہے

مسلمانوں کے پاس بقدر ضرورت دین موجود نہیں

رہا یہ کہ جائز دنیا کی تعلیم کیوں نہیں کرتے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ اتنی دنیا جو دین کو خراب نہ کرے وہ مسلمانوں کو حاصل بھی ہے، اور جن کو حاصل نہیں وہ اس کی کوشش میں خود ہی مشغول ہیں، پھر تحصیل حاصل سے کیا فائدہ؟ دین البتہ آج کل مسلمانوں کے پاس بقدر ضرورت بھی موجود نہیں، یعنی فرائض تک بھی ادا نہیں کرتے، بتلایئے کتنے مسلمان ہیں جو پابندی سے نماز پڑھتے ہیں؟ اور کتنے مسلمان ہیں جو باقاعدہ زکوۃ دیتے ہیں؟ وغیرہ وغیرہ، جس فرض اور رکن دین کو آپ دیکھیں گے مسلمانوں کو اس میں قاصر پائیں گے، پھر کیا بیجا ہے اگر علماء ان ہی کے متعلق وعظ کہیں کیونکہ دنیا بقدر ضرورت موجود ہے اور دین بقدر ضرورت بھی موجود نہیں، تو کس کی تعلیم کی ضرورت ہوئی، انصاف کیجئے۔

دنیا کے ضروری درجے کی تعلیم خود شریعت نے دی ہے

اور یہ سب کلام اس صورت میں ہے کہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ علماء نے دنیا کی تحصیل کی تعلیم نہیں کرتے، حالانکہ یہ امر خود محل کلام ہے بلکہ اس میں ایک خاص تفصیل ہے، جس کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا کے دو درجے ہیں، ضروری اور غیر ضروری، سو وہ حضرات غیر ضروری کی بیشک تعلیم نہیں کرتے، لیکن ضروری کی خود شریعت میں بھی تعلیم ہے اور ان حضرات کے ارشادات میں بھی مصرح ہے، چنانچہ حدیث ہے کسب الحلال فریضة بعد الفریضة[1] اور حضرت سفیان ثوری رحمۃ اللہ علیہ کا باوجود سید التارکین[2] ہونے کے یہ ارشاد ہے کہ جس کے پاس کچھ نقدی ہو اس کو محفوظ رکھنا چاہئے، اگر ہم محتاج ہوتے تو امراء ہم کو ہاتھ کا رومال بنا لیتے، یعنی ذلیل کرتے، جیسے رومال کہ اس سے میل کچیل پونچھا جاتا ہے، شریعت میں کہیں بھی یہ تعلیم آپ دکھا سکتے ہیں کہ روپے پیسے کو ضائع کرو اور بے موقع

---

[1]: ۔حلال روزی کمانا بھی دوسرے فرائض کے بعد فرض ہے۔ [2]: ۔دنیا کو ترک کرنے والوں کے سردار۔

اڑادو، بلکہ اس کی سخت ممانعت کی گئی ہے، اگر مسلمان شریعت پر عامل[1] ہوتے تو نہ دوسروں کے دست نگر ہوتے نہ دوسروں سے مغلوب ہوتے، اس لئے سخت ضرورت ہے کہ جس کے پاس مال ہو وہ تھوڑا بہت جمع کر کے بھی رکھے نفس کی تسلی کے لئے، غرض خرچ کو کم کیا جائے اور اسراف سے بچا جائے۔

مکان وقف کرنے سے منع کرنے کی حکمت

مجھ سے ایک عورت نے مشورہ کیا کہ اپنے مکان سب وقف کر دوں، میں نے اس کو منع کیا بعض لوگوں نے کہا کہ یہ تو مناع للخیر[2] بنتا ہے، میں نے کہا نہیں بلکہ یہ مناع للشر[3] بنتا ہے کیونکہ میں جانتا تھا کہ عورت ناقص العقل ہے، اس وقت تو جوش میں کار خیر سمجھ کر وقف کر رہی ہے اور کل کو اگر احتیاج پیش آئی تو پھر پچھتائے گی، اور اس خیر کو برا بھلا کہے گی اور خدا جانے کہاں تک نوبت پہنچے، تنگدستی میں مستقل رہنا بڑے بڑوں کو بھی مشکل ہے، تو اس وقت کی خیر موجب[4] ہو جائے گی آئندہ کے شر کی، اس لئے بس عافیت اسی میں ہے کہ ایسی خیر ہی نہ کرو، معترضین کی نظر اس بات تک نہیں پہنچی جو چیز دوسروں کو آئینہ میں نظر نہیں آتی کسی کو اینٹ میں نظر آجاتی ہے۔

حضرت حاجی صاحب اور حافظ ضامن صاحب کا قصہ

حضرت حاجی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اور حضرت حافظ ضامن صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قصہ ہے کہ ایک شخص نے جس کو کسی ظالم نے ایک جائداد کے مقدمہ میں پریشان کر رکھا تھا، حضرت حاجی صاحب سے کہا کہ میں پھر اپنا حق ہی چھوڑ دوں، حضرت نے فرمایا بہتر، صبر کرو، حافظ صاحب نے کہیں سن لیا اور بڑے زور کے ساتھ اس سے منع کیا کہ ہرگز صبر نہ کرنا، مقدمہ کرو ہم دعاء کریں گے اور حضرت حاجی صاحب کی طرف خطاب کیا کہ یہ آپ نے اس کو کیا بتلا دیا، آپ کے تو بیوی نہ بچہ آپ نے دنیا کو چھوڑ دیا وہ دنیا کو چھوڑ دے گا تو بیوی بچوں کا کیا حشر ہوگا، یہ بھی تو سوچ لیا ہوتا، یہ سن کر حضرت حاجی صاحب خاموش ہو گئے اور اپنے حجرہ میں چلے گئے، اسی واقعہ میں غور کر لیجئے معلوم ہو جائے گا کہ وہ خود دنیا کو چھوڑنا چاہتا تھا مگر اس کو اس سے منع کیا گیا، اور مباح دنیا کی حفاظت کا مشورہ دیا گیا۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

---

[1]۔ عمل کرنے والے ۔[2]۔ خیر کو روکنے والے۔ [3]۔ برائی کو روکنے والے۔ [4]۔ ذریعہ بن جائیگی۔

اس سلسلہ میں ایک بات اور قابل تنبیہ ہے وہ یہ کہ اس مشورہ کو سن کر کہ حرام نوکری کو فوراً نہ چھوڑنا چاہئے کسی کو یہ کہنے کی جرات نہ ہو کہ پھر اسی طرح سود اور رشوت کو بھی حلال کر دینا چاہئے کیونکہ اس کی بھی آج کل سخت ضرورت ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کس نے کہا ہے کہ محققین حرام نوکری کو حلال کر دیتے ہیں، ان کی تعلیم کا خلاصہ تو یہ ہے کہ وہ چھوٹے مفسدہ کو بڑے مفسدہ کے خوف سے کچھ دن کے لئے گوارا کر لیتے ہیں، اور رفتہ رفتہ تدبیر سے چھوڑا دیتے ہیں، اس میں اور حلال کرنے میں بڑا فرق ہے، حرام چیز تو کبھی حلال نہیں ہوسکتی، پاخانہ کبھی پاک نہیں ہوسکتا، دیکھئے کسی کے ہاتھ پاخانہ میں سن گئے تو اب دو صورتیں ہیں، ایک تو یہ کہ اس نے فوراً ہاتھ کو زمین پر ایسا رگڑا کہ پاخانہ کی نجاست تو زائل ہوگئی لیکن ہاتھ بھی زخمی ہوگیا، اب تکلیف ہے اور چلا رہا ہے، اور ایک یہ صورت ہے کہ اس نے تھوڑی دیر کے لئے صبر کیا اور پانی لاکر دھوڈالا، اس صورت میں نجاست بھی زائل ہوگئی اور کوئی تکلیف بھی نہ ہوئی اس کے یہ معنی نہیں کہ جتنی دیر تک اس نے صبر کیا وہ نجاست نہ رہی یا اس کو پاخانہ برا نہ معلوم ہوتا تھا یا اس کو پاک سمجھتا تھا۔

کیا دنیاوی ترقی کے لئے سود کو حلال سمجھنا ضروری ہے

اس پر یاد آیا، میں انجمن نعمانیہ لاہور میں بلایا گیا اور علماء بھی بلائے گئے تھے، اہل شہر کی اہل جلسہ سے یہ درخواست تھی کہ علماء مسئلہ سود پر غور کر کے کوئی صورت جواز کی نکالیں، کیونکہ آج کل مسلمانوں کی ترقی کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے، اس کے بغیر ترقی ہو ہی نہیں سکتی، مولوی سلیمان صاحب پھلواروی نے جب میری آمد کی خبر سنی تو فرمایا کہ بس اب اس مسئلہ کا صحیح فیصلہ ہو جائے گا، اور جو امر حق[1] ہوگا وہ ظاہر ہو جائے گا، مختلف علماء نے مختلف تقریریں کیں، پھر آخر میں میری نوبت[2] آئی، میں نے عدم جواز پر تقریر کی، لیکن ایک خاص عنوان سے میں نے کہا کہ صاحبو! سود لینا ترقی کا موجب ہے یا سود کو حلال سمجھنا بھی ترقی کے لئے شرط ہے، مثلاً ایک شخص سود تو لیتا ہے مگر اس کو حرام سمجھتا ہے اور دوسرا سود بھی لیتا ہے اور اس کو حلال بھی سمجھتا ہے، تو میں کہتا ہوں کہ ان دونوں کی ترقی میں کیا فرق ہوگا؟ کچھ بھی نہیں، کیوں کہ روپیہ جس کو مقصود اور ترقی کے لئے ضروری سمجھا جاتا ہے وہ تو دونوں ہی کے پاس آجائے گا پھر حلال ثابت کرنے کو ترقی میں کیا دخل ہوا، اگر ایسی ہی حرص ہے ترقی

---

[1]: یعنی جو صورت صحیح ہوگی، وہ سامنے آجائے گی۔ [2]: باری

کی تو اس کے پیچھے اپنے عقیدہ کو کیوں خراب کرو، سود لینا ہی ہے تو سود لو لیکن خدا کے لئے اس کو خواہ مخواہ حلال تو نہ سمجھو، حرام سمجھ کر بھی اگر سود لو گے تو کیا تمہاری مطلوب ترقی حاصل نہ ہو گی۔

لیجئے میں نے ایسی ترکیب بتلا دی کہ عقیدہ کا عقیدہ درست رہے اور ترقی کی ترقی ہو جائے، پھر میں نے ترقی کر کے کہا کہ اگر ہمارے مولوی بھی فتوی جواز سود کا دے دیں تب بھی خدا تعالیٰ کے فضل سے عام مسلمان سود کو جائز نہ سمجھیں گے، کیونکہ اس کی صریح حرمت قرآن مجید میں موجود ہے اور اس حرمت کا سب کو علم ہے، اگر خدانخواستہ علماء کا سود کے جواز پر اتفاق بھی ہو گیا پھر بھی عام مسلمان یہی کہیں گے کہ ہمارے علماء ہی خود بگڑ گئے کہیں سود بھی کسی کے حلال کئے حلال ہو سکتا ہے، پھر میں نے کہا کہ افسوس آج کل لوگ یوں چاہتے ہیں کہ علماء شریعت کو ربڑ بنا دیں کہ جس طرف کو وہ کہیں اسے کھینچ تان کر اسی طرف لے جائیں اور جس چیز سے چاہیں اس کا سرا ملا دیں، جس چیز کو وہ حلال کرانا چاہیں اس کو حلال کر دیں، ان سے یہ توقع نہ رکھئے، سو اول تو سود اور رشوت کی ضرورت ہی تسلیم نہیں، یہ کیا ضرور ہے کہ پلاؤ قورمہ ہی کھاؤ، تن زیب ہی پہنو، جس کے لئے ان چیزوں کے حلال کرانے کی فکر ہو، موٹا چال چلن رکھو، سادہ زندگی بھی تو ایک چیز ہے، شریعت کی تعلیم سادہ زندگی ہے اس کو اختیار کرو کسی گناہ میں پڑنے کی ضرورت نہیں۔

حرام کو حلال سمجھنا کفر ہے

اور اگر بفرض محال مان بھی لیا جائے کہ آپ کو کچھ ایسی ضرورتیں لاحق ہیں جن سے آپ بزعم خود مجبور ہیں تو حرام کماؤ، مگر یہ کیا ضرور ہے کہ حرام کو حلال کرنے کی کوشش کرو، کیونکہ حرام کا کسب تو گناہ ہی کا مرتبہ ہے اور تحلیل حرام[1] کفر ہے، گناہ اور کفر میں کچھ فرق ہے یا نہیں، پھر خواہ کوئی مرتبہ ہو مگر ہم کو گناہ اور کفر میں کیوں شریک کرتے ہو، ہم سے ایسے فتووں کی کیوں توقع رکھتے ہو۔

مولویوں سے ایسی نوکری نہیں ہوتی

ایسی درخواستیں کر کے لوگوں نے مولویوں کو ہاں میں ہاں ملانے کے لئے نوکر رکھنا شروع کیا ہے جیسے ایک حکایت ہے کہ ایک رئیس کے یہاں لازمی طور پر ایک نوکر ہاں میں ہاں ملانے کے لئے رہا کرتا تھا چنانچہ ایک نوکر انہوں نے رکھا اور یہی خدمت سپرد کی کہ جو بات ہم کہیں اس کی تم تصدیق کر دیا کرو، ایک دن کہنے لگے ہم شکار کے لئے گئے تھے ایک ہرن مارا گولی اس کا سم توڑ کر

---

[1]: حرام کو حلال سمجھنا

پیشانی پھوڑ کر نکل گئی، لوگ ہنسنے لگے کہ کہاں سم کہاں پیشانی، نوکر صاحب بولے حضور بجا فرماتے ہیں وہ ہرن اس وقت پیشانی کھجلا رہا تھا، جانور کی عادت ہوتی کہ سم سے کھجلاتا ہے گویا انہوں نے تصدیق کردی کہ سم کو توڑ کر اور کھوپڑی کو پھوڑ کر پار نکل گئی، اب آپ لوگ بھی بس یہ چاہتے ہیں کہ مولویوں سے یہ کام لیں، سو حضور مولویوں سے ایسی نوکری نہیں ہوتی، اول تو زیادہ مولوی ایسے ہیں کہ فتوی لکھنے کی تنخواہ نہیں لیتے اور جو بیچارے پیٹ کی خاطر تنخواہ بھی لیتے ہیں تو یہ کام ان سے بھی نہیں ہوسکتا دنیا کی خاطر دین نہیں بیچا جاتا، کوئی اجتہادی امر ہوتا تو شاید فتوی بھی دیا جاسکتا لیکن قرآن کی آیت سود کے بارہ میں صریح موجود ہے وحرم الربوا[۱] پھر بھلا کسی کی مجال ہے کہ اس کی حلت کا فتوی دیدے جیسا بد دینوں نے یہ شیوہ اختیار کیا ہے۔

رِبٰوا کا ایک غلط مطلب

چنانچہ بعضے ذہین مگر جاہل لوگوں نے اس میں بھی ایک ایجاد کی ہے اور یہ کہدیا ہے کہ قرآن میں رِبٰوا بکسر راء ہے ہی نہیں جس کے معنی سود کے ہیں بلکہ رُبٰوا بضم راء ہے اور مشتق ہے ربودن سے، جیسے دلربا، ہوشربا، ربودن کے معنی اچک لے جانا، تو اس سے ممانعت ہوئی ڈکیتی اور غصب کی اور کہتے ہیں یہ مولویوں کی اختراع ہے کہ ربوا پر زیر لگا دیا، یہ تحریف نئے لوگوں کی ایجاد ہے اللہ بچاوے[۲]، غرض اول تو بہت سے ذرائع حرام ہیں ضرورت ہی کا درجہ مسلم نہیں اور اگر تمہاری خاطر سے مان بھی لیا جاوے تب بھی غایت سے غایت یہ ہے کہ حرام کماؤ، مگر دین میں تو ترمیم مت کرو گناہ کو گناہ ہی کے مرتبہ میں رہنے دو۔

گناہوں سے بچنے کا طریقہ

اور میں اس وقت تمہاری خاطر سے کہتا ہوں کہ خیر گناہ کرلو لیکن جب تمہاری ایک درخواست میں نے منظور کی تو تم بھی میری دو درخواستیں منظور کرلو، ایک تو یہ کہ گناہ کرو مگر اس کو سمجھنا گناہ اور حرام ہی جیسا ابھی بیان کرچکا ہوں، اور ایک یہ کہ سوتے وقت دن بھر کے گناہوں کا حساب کرلیا کرو یعنی تھوڑی دیر اس طرح محاسبہ کیا کرو کہ صبح سے ہم نے اس وقت تک کیا کیا گناہ کیئے؟ خصوصاً وہ گناہ جو معاش کے متعلق ہیں، کیونکہ مال حرام سب سے بری چیز ہے، یہ تخم[۳] ہے تمام گناہوں کا، سو اس طرح گناہوں کو یاد کیا کرو اور زبان سے کہا کرو کہ اے اللہ میں بڑا نالائق ہوں اس قابل ہوں کہ غرق کردیا جاؤں، کوئی عذر میرے پاس نہیں، میں نے بہت ہمت کی مگر مجھے کامیابی نہیں ہوتی، آپ مدد کیجئے اور

---

[۱]:۔ اور سود کو حرام کیا۔ [۲]:۔ کہ عربی قرآن میں فارسی الفاظ مان کر اپنا مطلب نکالنے کی کوشش کی۔ [۳]:۔ بیج

اس خباثت سے نکال دیجئے، میں یہ ایسی کام کی بات بتاتا ہوں کہ اول تو اس سے وہ گناہ ہی چھوٹ جائے گا، اور اگر بالفرض نہ چھوٹا اور ساری عمر بھی اسی میں مبتلا رہے تب بھی اتنا فائدہ پہنچے گا کہ مرتے وقت ایک ہی گناہ سر رہے گا کیونکہ جب روز توبہ کیجاتی ہے تو اس سے ماضی کا تو کفارہ ہوجاتا ہے، تو بجائے اس کے کہ سو دن کے گناہ سر ہوتے ایک ہی دن کے رہ جائیں گے، یہ بھی کچھ تھوڑی بات نہیں۔

دیکھئے ایک مجرم پر دس دفعہ لگا کر سزا کی جاتی ہے تو وہ اپیل کرتا ہے لیکن وکلاء کہتے ہیں کہ سزا ضرور رہے گی، ایک بیرسٹر کہتا ہے کہ کوشش کریں گے اور امید ہے کہ تخفیف ہوجائے گی اور بجائے دس دفعات کے ایک دو دفعہ رہ جائیں گی، تو وہ کس قدر خوش ہوتا ہے اور بیرسٹر صاحب کی خوشامد کرتا ہے اور کافی معاوضہ دینے کو تیار ہوجاتا ہے، اور کہتا ہے کہ یہی غنیمت ہے، اسی طرح اگر آخرت کی بہت سی دفعات لگی ہوئی ہوں اور ان میں معتد بہ[1] کمی ہوجائے تو غنیمت سمجھنا چاہئے، جو تدبیر میں نے بتلائی ہے اس سے آپ کے ذمہ صرف ایک دفعہ رہ جاتی ہے، اور بدوں اس کے[2] بہت سی دفعات لگی ہوئی ہیں یعنی بے فکری کا گناہ آپ کے ذمہ ہے، غفلت کا گناہ آپ کے ذمہ ہے، روزانہ عمل کا گناہ آپ کے ذمہ ہے، اگر یہ تدبیر کروگے تو صرف ایک ہی عمل کا گناہ رہ جائے گا، یہ تھوڑی بات ہے۔

گناہوں کی قسمیں اور انہیں چھوڑنے کا طریقہ

اور ان گناہوں کے متعلق میں ایک اور کام کی بات عرض کرتا ہوں، نئی بات آپ کو سناتا ہوں آپ نے اب تک دو ہی باتیں سنی ہوں گی، ایک وہ بات جو مولوی صاحبوں کے وعظوں میں کہی جاتی ہے کہ ایک گناہ بھی چھوٹا ہو یا بڑا مت کرو، اور ایک وہ بات جو آزاد لوگوں سے سنی ہوگی کہ سب گناہ کرو ایک کو چھوڑنے کی بھی ضرورت نہیں کیونکہ جب جہنم میں جانا ہی ٹھہرا تو پھر کیوں کسر رکھیں جو ہوگی دیکھی جائے گی یہ دو باتیں ہوئیں، ان دونوں کے بین بین[3] تیسری بات آپ نے سنی ہوگی، وہ میں سناتا ہوں کہ گناہ دو طرح کے ہیں، ایک وہ گناہ جن کے چھوڑنے میں ذرا بھی تکلیف نہیں ہوتی اور ایک وہ گناہ جن کے چھوڑنے میں کسی قدر تکلیف ہوتی ہے، اول کی مثال مردوں کو ریشم پہننا یا داڑھی منڈانا ہے، بتلایئے اس کے چھوڑنے میں کیا تکلیف ہوتی ہے اور کس کام میں حرج ہوتا ہے، دنیا کا کون سا کام اس پر موقوف ہے نہ معاش اس پر موقوف ہے نہ صحت اس پر موقوف ہے پھر اس

---

[1]:۔ کافی حد تک [2]:۔ اس کے بغیر۔ [3]:۔ درمیان۔

کے چھوڑنے میں آپ کے پاس کیا عذر ہے، اگر حق تعالیٰ سے ذرا سا بھی تعلق ہے تو ایسے گناہ کا تو خیال بھی نہ آنا چاہئے کیونکہ حق تعالیٰ تو اس سے ناراض ہوتے ہیں، اور دنیا میں اس کی کوئی ضرورت نہیں تو کیا عقل کی بات ہے کہ ایسا کام کیا جائے، کسی کام کے کرنے سے ایک معمولی حاکم کی ذرا نظر ترچھی دیکھی جاتی ہے تو سب کے خون خشک ہوجاتے ہیں، اور کیسی ہی ضرورت ہومگر اس کام کو نہیں کیا جاتا، حق تعالیٰ تو احکم الحاکمین ہیں ان کی نظر ترچھی ہو اور کام بھی ایسا نہ ہو کہ ضروری ہو تو اس کے کرنے کے لئے مسلمانوں کی ہمت کیسے ہوسکتی ہے، غرض یہ قسم گناہ کی تو اس قابل ہے کہ فوراً ہی چھوڑ دی جائے کیونکہ اس کے لئے کوئی معتد بہ داعی بھی نہیں سوائے لاپروائی کے، ایسے گناہوں کو تو آج ہی چھوڑ دو۔

اور گناہ کی دوسری قسم کی مثال مثلاً ناجائز نوکری کرنا ہے، میں ایسے گناہوں کو ایک دم نہیں چھوڑاتا اس کے لئے وہی طرز عمل رکھو جو میں نے ابھی بیان کیا ہے کہ رات کو ان کو یاد کرو اور اپنی خطا کا اعتراف کرو اور زبان سے کہو کہ اے اللہ میں نالائق ہوں، میں خبیث ہوں، میرے پاس کوئی عذر نہیں، میں گناہگار ہوں، اپنی غلطی سے شرمندہ ہوں، روز اسی طرح کیا کرو، اس کا نتیجہ وہی ہوگا جو میں نے ابھی کہا تھا کہ اول تو وہ گناہ چھوٹ جائے گا، اور اگر ساری عمر بھی نہ چھوٹا تو صرف ایک دفعہ کے مجرم رہیں گے، لیجئے میں نے ایسی آسان تدبیر بتلادی ہے جس کی نسبت میرا دعوی ہے کہ اس سے زیادہ تخفیف دس برس تک بھی کسی مصلح[۱] سے نہ سنے گا، اب آپ کے پاس کیا عذر ہے۔

صاحبو! قیامت میں حق تعالیٰ کے سامنے جوابدہی کرنا اور عذر پیش کرنا بہت مشکل ہے درحقیقت تو مشکل سے مشکل کام کے لئے بھی کوئی عذر نہیں ہوسکتا کیونکہ حق تعالیٰ کو بحق الوہیت[۲] حق حاصل ہے کہ جو چاہیں امر کریں خواہ وہ کام مشکل ہو یا آسان لیکن حق تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، تکلیف مالایطاق کو بالکل برطرف[۳] رکھا ہے، کوئی حکم ایسا نہیں دیا جس میں طاقت سے زیادہ تکلیف ہو، بلکہ اتنی تکلیف بھی تو نہیں ہے جتنی معمولی حکام دنیا کے احکام میں ہوتی ہے، اور معمولی تکلیف تکلیف نہیں، اور میں نے جو ایک شق نکالی ہے اس میں تو معمولی تکلیف بھی نہیں رہی اور بہت ہی آسانی ہوگئی، اور اس پر جو میں نے آپ سے اس وقت سوال کیا ہے کہ باوجود اتنی سہولتوں کے آپ

۱:۔ اصلاح کرنے والے۔ ۲:۔ پروردگار ہونے کی بناء پر۔ ۳:۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا جو ہماری طاقت سے باہر ہو۔

کے پاس کیا عذر ہے، اگر حق تعالیٰ اسی کا اعادہ فرماویں تو آپ کے پاس کیا جواب ہوسکتا ہے؟ سمجھ لیجئے اور غور سے کام لیجئے۔

یہ ترک گناہ کی تعلیم ہے گناہ کی نہیں

اور اس بیان پر شاید بعض طبیعتوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہوگا کہ یہ تو گناہ کی تعلیم کی جارہی ہے، سو سمجھ لو کہ یہ گناہ کی تعلیم نہیں بلکہ ترک گناہ کی تعلیم ہے، ہاں اس کے لئے سہولت کی سبیل[1] نکالی گئی ہے جیسا مفصل مذکور ہوا، اب اس شق کے متعلق ایک بات باقی رہی ہے، وہ یہ کہ جس گناہ کے ترک سے کوئی تکلیف نہ ہو، ظاہر ہے کہ ایسے گناہ کسی لذت دنیاوی کی وجہ سے ہی کئے جاتے ہیں، بلکہ ہر گناہ میں کچھ نہ کچھ تو حظِ نفس[2] ہے ہی، اس طرح کرنے سے جب گناہ چھوٹیں گے یا محاسبہ سے سب گناہ چھوٹ جاویں گے، تو وہ لذات بھی چھوٹ جائیں گی، تو یوں کہیئے کہ دنیا ہاتھ سے گئی بس دنیا میں ملا بن کر رہیں گے تو دنیا کی زندگی کا لطف تو گیا۔

دنیا کی لذتوں کی حقیقت

میں کہتا ہوں کہ واقعی اس کا اثر اخیر میں ہوگا تو یہی، مگر آپ اس سے گھبراتے کیوں ہیں، یہ دنیا کی لذتیں اسی وقت تک لذتیں ہیں جب تک کہ دوسری لذتیں سامنے نہیں آئیں، ان سے بڑھ کر لذتیں کچھ اور بھی ہین جن کا ابھی آپ کو پتہ نہیں ہے، نہ وہ بیان میں آسکتی ہیں۔

بس ایک مثال سے میں آپ کو بتائے دیتا ہوں، وہ مثال یہ ہے کہ بچے مٹی سے کھیلتے ہیں اور بہت سے کھلونوں سے کھیلتے ہیں پتنگ اڑاتے ہیں اچھلتے ہیں، کودتے ہیں ان کاموں میں ان کو کیسا مزہ آتا ہے، حتی کہ انہیں باتوں میں آپس میں لڑائی جھگڑے ہوتے ہیں روتے ہیں پیٹتے ہیں، بڑوں تک فریاد لے جاتے ہیں وہ کہتا ہے میرا کھلونا چھین لیا، وہ ان کو منع کرتے ہیں، ہر وقت روک ٹوک کرتے ہیں، ان کو میاں جی کے سپرد کردیتے ہیں جس سے ان کی زندگی تلخ ہوجاتی ہے، اور جس سے یہ سب کھیل کھلونے چھن جاتے ہیں اور کھیل کود چھوٹ جاتے ہیں، اس سے ان کو کیسی حسرت ہوتی ہے، مگر آپ کی شفقت اس حسرت کا کچھ خیال نہیں کرتی اور ان لذات کے چھوٹ جانے کی کچھ پرواہ نہیں کرتی، اور ان کو باندھ باندھ کر مدرسہ بھیجتی ہے، آپ ان سے یہی تو کہتے ہیں کہ یہ کھیل کود کی لذتیں

---

[1]۔ صورت [2]۔ لذّت

کیا ہیں، تو پڑھ لکھ جائے گا تو ڈپٹی ہوگا، تحصیلدار ہوگا، کرسی پر بیٹھ کر حکومت کرے گا، یہ اچھا یا ان پڑھ رہنا اور کھیل کود میں رہنا، اور سمجھ آنے کے وقت تکلیف کا محسوس کرنا اچھا۔

بچہ کی سمجھ میں اس وقت آپ کی ایک بات بھی نہیں آتی، اور وہ آپ کی روک ٹوک اور تعلیم کو ظلم کہتا ہے، بتائیے آپ اس کو اس وقت کس طرح سمجھا سکتے ہیں، اور آپ کو اس وقت کیا کرنا چاہئے، آیا بچہ کو اس کے حال پر چھوڑ دینا چاہئے یا بہلا پھسلا کر نرمی سے، سختی سے جبراً قہراً تعلیم دلانی چاہئے، جو اس بات کا جواب ہوگا، لذات دنیا چھوڑانے کے متعلق وہی میرا جواب ہے کہ آپ کو اس وقت تو بہلا کر راہ پر لگایا ہے اور سہولت کی تدبیر بتلائی ہے جس کا اثر وہ ہی ہوگا کہ دنیا چھوٹ جائے گی اور دین سر پڑ جائے گا، مگر جب حقیقت واضح ہوگی اس وقت اس کی قدر ہوگی۔

دین کی لذت کی حقیقت

اس سر پڑ جانے پر ایک قصہ یاد آیا، ایک ڈوم تھا، وہ روزہ رکھنے سے بہت گھبراتا تھا، اور یہ مسئلہ کہیں سن لیا تھا کہ چاند دیکھنے سے روزہ واجب ہوتا ہے، بس آپ نے کیا کیا کہ چاند رات کے وقت گھر میں بیٹھ رہا کہ کہیں چاند نظر نہ پڑ جائے اور روزہ واجب نہ ہو جاوے، جب کئی روز ہو گئے بیوی نے گھر سے نکال دیا، جنگل جو گیا دن چھپے کے وقت پاخانہ کی ضرورت ہوئی نظر نیچے کئے ہوئے پاخانہ گیا اور بہت احتیاط کی کہ چاند نظر نہ پڑ جائے، لیکن ایک تالاب پر جو آب دست کرنے بیٹھے تو تالاب کے کنارہ پانی میں چاند کا عکس نظر آ گیا، بہت خفا ہوئے اور چاند کو مخاطب بنا کر کہنے لگے جا کمبخت! سر ہی ہوتا پھرتا ہے، تو حضرت دین اس طرح سر پڑے گا جیسے چاند اس ڈوم کے سر پڑ گیا اور ظاہر ہے کہ جب دین آ گیا تو دنیا بھاگے گی، تو یہ خیال بالکل سچا ہے کہ دنیا کی لذتیں چھوٹ جائیں گی مگر اس میں برائی کیا ہے؟ کیونکہ ان سے بہتر لذتیں حاصل ہو جائیں گی اور جب ان سے بہتر لذتیں حاصل ہوئیں تو ان کے چھوٹنے سے گرانی بھی نہ ہوگی، جیسے کسی سے ایک کوڑی چھن جائے اور اس کے بدلے ایک اشرفی مل جائے اور اس کو کیا گرانی ہوسکتی ہے، دین کی لذت وہ چیز ہے کہ ذرا محسوس ہو جائے تو پھر کوئی لذت بھی اس کے سامنے حقیقت نہیں رکھتی۔

ہم دین کا چسکا لگانا چاہتے ہیں

یہی راز ہے اس بات کا کہ قبیلہ بنی ثقیف نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اوّل عرض کیا کہ ہم اسلام لاتے ہیں مگر اس میں دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ جہاد میں نہیں جائیں گے، دوسرے زکوۃ

وخیرات کچھ نہیں کریں گے، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو منظور فرمالیا، اس وقت کوئی ناسمجھ آدمی کہہ سکتا ہے کہ ایسے اسلام لانے سے فائدہ کیا، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو کیسے منظور کرلیا، اس کا حل یہی ہے کہ حضور کو معلوم تھا کہ دین ایسی چیز نہیں ہے جو پاس آنے کے بعد خود نہ لپٹ جائے، بس ان کے صرف اسلام کو منظور فرمالیا، پھر دیکھ لیجئے اسلام ان کو ایسا لپٹا کہ اپنی سب شرطیں بھول گئے، مال بھی خرچ کیا اور جان بھی خرچ کی، جہاد کیا، اسی طرح ہماری اس تعلیم کی حقیقت یہی ہے کہ ہم دین کا چسکا لگانا چاہتے ہیں، اور دین کی سڑک پر ڈالتے ہیں، سڑک پر پہنچ کر ایک ایسا باغ ملے گا جس کی بہار آپ کو خود ہی کھینچ لے گی تو اب میری تعلیم پر اعتراض نہ رہا۔

ملامت کے خوف سے ہی گناہ چھوڑ دو

دیکھئے کس قدر آسانی ہوگئی جس کا خلاصہ میں مکرر اعادہ کرتا ہوں کہ میں تکلیف کے گناہ کو فی الحال نہیں چھوڑاتا، یعنی وہ گناہ جن کے چھوڑنے میں آپ کو تکلیف ہو، صرف تکلف کے گناہ کو چھوڑاتا ہوں، یعنی وہ گناہ جن کو آپ نے بتکلف بلاضرورت طبعیہ[۱] اپنے ذمہ لے رکھا ہے، جن کے چھوڑنے میں آپ کو کوئی تکلیف نہ ہوگی، سو ایسے گناہوں کو چھوڑنا کیا مشکل ہے؟، اتنی تو ہمت کرو تراشے ہوئے گناہ چھوڑ دو، مگر کم سمجھوں کی یہ حالت ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ شریعت پر عمل کرو اور گناہوں کو چھوڑ و تو کہہ دیتے ہیں کہ کیا کھانا پینا چھوڑ دیں، مر جائیں، میں کہتا ہوں کہ مرو مت مگر تھوڑی تکلیف تو گوارا کرو، میں تو فی الحال ان گناہوں کو چھوڑاتا ہوں جن کے چھوڑنے سے موت نہیں آتی، پھر وہ اعتراض کہاں رہا کہ شریعت پر عمل کریں تو کیا مر جائیں؟، ہاں یہ ضرور ہوگا کہ ہواپرست[۲] لوگ برا کہیں گے سو اس سے مت ڈرو، اور میں کہتا ہوں کہ برا کہنے کی کہاں تک پرواہ کی جائے گی، اگر کوئی چاہے کہ سب کو راضی کر لے تو یہ ناممکن ہے، دیکھنا یہ چاہئے کہ کسی کا برا کہنا اور ملامت کرنا بجا ہے یا بیجا ہے اگر بیجا ہے تو عقلمند کا کام یہی ہے کہ اس کی پرواہ نہ کرے، اور میں کہتا ہوں کہ اگر ملامت سے آپ ڈرتے ہیں تو گناہ پر بھی تو ملامت ہوتی ہے، تو ملامت ہی کے خوف سے گناہ کو چھوڑنا چاہئے۔

ہمارے گناہوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل دکھتا ہے

وہ ملامت معلوم بھی ہے کس کی ہوتی ہے وہ اللہ کی ہوتی ہے اور رسول کی ہوتی ہے، کیونکہ گناہ کرنے سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ملامت کرتے ہیں، اور رنجیدہ ہوتے ہیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا دل

۱:۔ بغیر طبعی ضرورت کے بلاوجہ۔ ۲:۔ خواہشات کی پیروی کرنے والے۔

دکھتا ہے، آپ نے سنا ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر ہفتہ میں دو بار عرض اعمال امت [1] ہوتا ہے، آپ خیال کر سکتے ہیں کہ جب مسلمانوں کے گناہ حضور کے سامنے آتے ہوں گے تو حضور کو کس قدر رنج ہوتا ہوگا، حضور کی شان تو یہ ہے کہ کفار پر بھی اس قدر رنج فرماتے تھے گویا جان دینے کو تیار ہیں، قرآن میں لعلک باخع نفسک ان لا یکونوا مؤمنین (سورۃ الشعراء، ۳) یعنی ''شاید آپ اپنی جان کو تلف کر دیں گے اس رنج میں کہ کفار ایمان نہیں لاتے''، جب کفار پر حضور کو اس قدر شفقت تھی تو مسلمانوں پر کیا کچھ ہوگی، جس وقت مسلمانوں کی بداعمالیاں پیش ہوتی ہوں گی تو حضور پر کیا گذرتی ہوگی ؟!، کیا یہ کوئی مسلمان گوارا کر سکتا ہے کہ حضور کو تکلیف دے۔

مرزا قتیل کا قصہ

اس تکلیف پر ایک حکایت یاد آئی، غالبا مرزا قتیل کا قصہ ہے کہ وہ داڑھی منڈایا کرتے تھے، ایک شخص ان سے ملنے آئے اور از روئے نصیحت ان سے کہا کہ ''آغا ریش می تراشی'' [2]، مرزا قتیل نے جواب میں کہا ''آرے ریش می تراشم لیکن دل کسے نمی خراشم'' [3] اس شخص نے فورا کہا ''آرے دل رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم می خراشی'' [4]، اس جملہ کا مرزا قتیل پر اثر یہ ہوا کہ بیتاب ہو گئے، اور وجد کی سی کیفیت ہوگئی اور توبہ کی اور بزبان حال بار بار یہ کہتے تھے۔

جزاک اللہ کہ چشمم باز کردی   مرا با جان جان ہمراز کردی [5]

سو سب سے بڑی ملامت تو اللہ اور رسول کی ہے اور درحقیقت بچنے کی چیز یہی ہے، اگر لوگ ملامت کریں تو ایک طرف ان کی ملامت اور ایک طرف اللہ اور رسول کی ملامت، اپنے دل سے پوچھو کہ کونسی ملامت قابل لحاظ ہے !، مسلمان تو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ اللہ اور رسول کی ملامت لوگوں کی ملامت سے کمتر ہے۔

عاشق کی شان یہ ہے کہ ملامت سے نہ ڈرے

اس کے متعلق اور سنئے، حضرت آپ ہیں عاشق، آپ کو اللہ اور رسول کے ساتھ تعلق عشق کا

---

[1]:۔ امت کے اعمال پیش کئے جاتے ہیں۔ [2]:۔ آغا! تم ڈاڑھی تراش رہے ہو؟ [3]:۔ ہاں ڈاڑھی تراش رہا ہوں مگر کسی کا دل تو نہیں چھیل رہا۔ [4]:۔ کیوں نہیں، تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا دل مبارک زخمی کر رہے ہو۔
[5]:۔ اللہ تمہیں جزائے خیر دے کہ تم نے میری آنکھیں کھول دیں۔ اور محبوب کے ساتھ میرا تعلق قائم کر دیا۔

ہے، چنانچہ ارشاد ہے والذین آمنوا اشد حبا للہ[۱] یہاں مطلق مؤمن کے لئے شدّت حُب کو ثابت کیا گیا، شدت حب عشق ہوئی، جب آپ عاشق ہیں تو عاشق کی تو شان یہی ہے کہ ملامت سے نہ ڈرے، عاشق کو تو ملامت میں لطف آیا کرتا ہے پھر لطف اٹھائیں۔

مسلمانوں کو دنیا دار نہ کہو

اور جب آیت قرآنی سے ہر مؤمن کا عاشقِ حق ہونا ثابت ہوگیا تو اس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ ایک شعر جو مشہور ہے

اہل دنیا کافرانِ مطلق اند		روز وشب در زق زق و در بق بق اند[۲]

اور اکثر واعظ لوگ اس شعر کو وعظ میں پڑھا کرتے ہیں، اس کو اگر ظاہری معنی پر محمول کیا جاوے تو محض غلط ہے، کیونکہ عاشق ہونے کے بعد اس کو کافر کیسے کہا جاسکتا ہے، البتہ ایک توجیہ سے صحیح ہوسکتا ہے، وہ توجیہ یہ ہے کہ اس شعر کے پہلے مصرعہ کی ترکیب میں تقدیم وتاخیر ہے، یعنی اہل دنیا مبتدا ہے اور کافرانِ مطلق خبر ہے، مگر مقصود اس کا عکس ہے، یعنی کافرانِ مطلق مبتدا ہے، اور اہل دنیا خبر، تو مطلب یہ ہوا کہ فقط کافرانِ مطلق ہی دنیا دار ہیں، ان کے سوا مسلمانوں کو خواہ وہ کیسے ہی گناہگار ہوں دنیا دار مت کہو، مسلمان تو کسی حال میں بھی ہو تارک نماز ہو، بدکاری میں مبتلا ہو، زکوۃ نہ دیتا ہو، غرض سارے گناہ کرتا ہو تب بھی اس کو کافر نہیں کہہ سکتے۔

اور واعظ صاحبان یہ غضب کرتے ہیں کہ جو لوگ ایسے گناہوں میں بھی مبتلا نہیں صرف مال و دولت اور عیش وآرام میں مشغول ہیں، ان کو بھی دنیا دار کہہ کر اس شعر کا مصداق قرار دیتے ہیں، اور لفظ کافر کا ان پر اطلاق کرنے سے باک نہیں کرتے، یہ کس قدر زیادتی ہے، مسلمان تو کیسا ہی دنیا میں مبتلا ہو پھر بھی اس کے قلب کو ایک خاص تعلق حق تعالیٰ سے ہوتا ہے اور اس تعلق کے اثر سے وہ اپنا گھر دنیا کو نہیں سمجھتا بلکہ اپنا اصلی گھر آخرت ہی کو سمجھتا ہے، یعنی وہ یہ سمجھتا ہے کہ وطن تو اس کا آخرت ہے، لیکن وہ چند روز کے لئے مسافرانہ دنیا میں آ گیا ہے، تو اب اس کی مثال ایسی ہوگئی جیسے کوئی باغپت کا رہنے والا مہینے دو مہینے کے لئے لکھنؤ چلا جائے، تو اس کو لکھنؤ والا نہیں کہا جاتا، نہ خود وہ اپنے آپ کو

---

[۱]:۔ اور جو مؤمن ہیں، انہیں اللہ تعالیٰ سے نہایت قوی محبت ہے۔ (سورۃ البقرۃ، ۱۶۵)۔ [۲]:۔ اہل دنیا مطلقا کافر ہیں (یا کافر ہی اہل دنیا ہیں) جو دن رات دنیا کے سامان میں لگے ہوئے ہیں۔

لکھنؤ کا رہنے والا سمجھتا ہے نہ کوئی دوسرا۔

دیکھیے سالہا سال بلکہ بعض صورتوں میں تمام عمر لوگ ملازمت کے سلسلہ میں وطن سے باہر رہتے ہیں، مگر پھر بھی اپنے آپ کو رہنے والا اور کہیں کا سوائے اپنے وطن کے نہیں کہتے حتی کہ کاغذات میں بھی اپنے نام کے آگے پانی پتی، بجنوری، دھلوی، لکھواتے ہیں یعنی اپنی نسبت وطن ہی کی طرف کرتے ہیں، پھر جب کہ مسلمان اپنا اصلی گھر آخرت ہی کو سمجھتا ہے تو دنیا میں آکر اس کو دنیا والا یا دنیادار کیسے کہا جائے، ہاں اپنی غفلت اور جہالت سے دنیا کے خارستان[۱] میں آکر چند روز کے لئے اس سے دل لگا لیا ہے، اور بوجہ غفلت کے بعض مسلمان بھی اس کے کانٹوں میں اپنے کپڑے پھڑواتے پھرتے ہیں، مگر جب وطن کا نام آئے تو آخرت ہی کا نام لیں گے، دنیا کی دلفریبیاں دیکھ کر آخرت سے ذہول ضرور ہو جاتا ہے لیکن یہ نہیں ہوتا کہ دنیا کو اپنا وطن سمجھنے لگیں۔

مولانا جامی کے سبق آموز اشعار

اسی کے خلاف شکایت مولانا جامیؒ نے کی ہے، ؎

دلا تا کے دریں کاخ مجازی　　کنی مانند طفلاں خاکبازی
توئی آں دست پرور مرغ گستاخ　　کہ بودت آشیاں بیروں ازیں کاخ
چرا ازاں آشیاں بیگانہ گشتی　　چو دوناں چغد ایں ویرانہ گشتی[۲]

آگے مولانا نے وطن اصلی کو یاد دلایا ہے۔ ؎

بیفشاں بال و پرزیں عالم خاک　　پرتا کنگرۂ ایوان افلاک[۳]

خیر یہ تو بڑوں کی باتیں ہیں، جن کو دنیا اور آخرت آنکھوں سے نظر آتی ہیں، وہ تو دنیا کو کیوں پسند کرنے لگیں، ان کو تو دنیا سے نفرت ہوتی ہی ہے، مگر جو مسلمان بظاہر اور واعظوں کے قول کے موافق دنیادار ہیں، وہ بھی گو دنیا کے لذائذ اور تنعمات[۴] میں مبتلا ہیں مگر جب پوچھا جائے تو کہیں

---

[۱]:۔ کانٹوں کی جگہ۔ [۲]:۔ اے دل! تو کب تک مٹی سے کھیلنے والے بچوں کی مانند اس جگہ سے لگا رہے گا۔ اے ہاتھوں میں کھیلنے والے پرندے! تیرا آشیانہ اس گھر سے کہیں باہر ہے۔ تو اس آشیانہ سے بیگانہ ہو کر کمتر اُلو کی طرح اس ویرانہ کا کیوں ہو گیا؟۔ [۳]:۔ اس مٹی والے جہاں سے اپنے پَر جھاڑ اور آسمانوں کے بلند محلات کی طرف اڑ۔
[۴]:۔ نعمتیں۔

گے کہ یہی وطن آخرت ہے۔

خلاصہ یہ کہ ع اہل دنیا کافرانِ مطلق اند۔ میں خبر مقدم اور مبتدا مؤخر، تو اس میں مسلمانوں پر اطلاق اہل دنیا کا نہ ہوا، بلکہ مطلب یہ ہوا کہ اہل دنیا ہونا منحصر ہے کفار میں، مسلمان کیوں ہوتا دنیا دار؟ ہم نے تو کبھی نہیں دیکھا کہ کوئی ادنی مسلمان بھی ایسا فنا فی الدنیا[۱] ہو کہ ہر وقت دنیا ہی کا ذکر کرتا رہتا ہو، اور کبھی اللہ اور رسول کا ذکر اس کی زبان پر نہ آئے، اس کا پتہ اس کے مقابل سے چلتا ہے، کفار کو دیکھئے کہ ہر وقت دنیا ہی کی دھن میں رہتے ہیں، ریل میں ایک ہندو آکر بیٹھا اور اس نے سب سے پہلے مجھ سے سوال کیا کہ آپ کے یہاں غلہ کا کیا بھاؤ ہے؟، بس ان کا سفر ہے تو دنیا ہے حضر ہے تو دنیا، یہ ہے زق زق اور بق بق جس کو اس شعر میں کہا ہے ع روز و شب در زق زق و در بق بق اندر[۲]، یہ حالت مسلمان کی کبھی نہیں ہوسکتی، یہ کفار ہی کے ساتھ خاص ہے، جن کی یہ حالت ہے کہ ع چو میرد مبتلا میرد چو خیزد مبتلا خیزد[۳]، بس جن کی یہ حالت ہے انہیں کو اس شعر میں اہل دنیا کہا گیا ہے، لیجئے اب اس شعر کے مصرعہ ثانی ہی سے جس میں روز و شب زق زق، بق بق کا مضمون ہے پتہ چل گیا کہ مصرعہ اول میں تقدیم و تاخیر ہے یعنی خبر مقدم اور مبتدا مؤخر ہے۔

ہر مسلمان کو اللہ تعالیٰ سے شدید محبت ہوتی ہے

غرض مسلمان دنیا دار نہیں بلکہ عاشق ہے اور عاشق بھی صادق، مگر اس نے جہالت اور غفلت سے اپنی مٹی پلید کر رکھی ہے، اور اپنا عشق اس قدر خفی کر دیا ہے کہ کسی کو اس کا احساس ہونا بھی مشکل ہوگیا ہے، مگر حق تعالیٰ کو تو علم ہے، اس واسطے حق تعالیٰ کے نزدیک ان کا لقب عاشق ہی ہے، جیسا میں نے اوپر اس آیت سے ثابت کر دیا ہے والذین آمنوا اشد حبا لله جس میں کسی کی تخصیص نہیں کی، نہ جنید کی، نہ شبلی کی، نہ اگلوں کی، نہ پچھلوں کی، بلکہ جو ایمان رکھتا ہے ہر اس شخص کے واسطے یہی حکم ثابت کیا، اشد حبا لله یعنی وہ خدا تعالیٰ کے برابر کسی سے محبت نہیں رکھتا اور یہ بھی نہیں فرمایا کہ وہ حق تعالیٰ سے محبت رکھتا ہے، بلکہ اشد کا لفظ فرمایا، جس کا حاصل یہ ہوا کہ مسلمان کو شدید محبت حق تعالیٰ ہی سے ہوتی ہے۔

عاشق کی حالت کیا ہوتی ہے

۱:۔ دنیا میں کھپ گیا ہو۔ ۲:۔ دن رات زق زق اور بق بق میں رہتے ہیں۔ ۳:۔ مریں گے تو مبتلا، اٹھیں گے تو مبتلا۔

لیجئے ہر مسلمان کو حق تعالیٰ زمرۂ عشاق ہی میں شمار کرتے ہیں، آپ اپنی طرف کتنے ہی اس لقب سے الگ ہوں مگر وہ آپ کو الگ نہیں کرتے، اس کی مثال ایسی ہے کہ کسی کو عہدہ دیا گیا تحصیلداری کا، اور وہ اس سے الگ ہونا چاہتا ہے اور استعفا دیتا ہے، لیکن حاکم بالا اس کا استعفاء منظور نہیں کرتا، تو وہ اس عہدہ سے علیحدہ ہونا چاہتا ہے لیکن اس کو علیحدہ نہیں ہونے دیا جاتا، غرض آپ کے واسطے عاشق کا خطاب ثابت ہو چکا ہے، جب یہ ہے تو پھر عاشق کو ملامت سے ڈرنا نہیں چاہئے، دیکھئے ایک مردار عورت پر کوئی عاشق ہو جاتا ہے تو نہ گھر کی خبر رہتی ہے نہ بار کی نہ مال کی پرواہ رہتی ہے نہ جان کی نہ آبرو کی سب کو اس پر نثار کر دیتا ہے، اور ملامت سے ڈرتا تو کیا ملامت میں اس کو لطف آتا ہے، پھر جب کہ آپ کا تعلق حق تعالیٰ جیسے احکم الحاکمین کے ساتھ عشق کا ہے تو ان کی رضا کے لئے جان یا مال یا آبرو کی کیا پرواہ ہونی چاہئے اور اہل دنیا کی ملامت سے ڈرنا کیا معنی۔ اب بتلایئے کیا عذر ہے آپ گناہ کے چھوڑنے میں، اب تو معلوم ہوگیا کہ عاشق کے سامنے ملامت کوئی چیز ہی نہیں بلکہ عشق میں ملامت سے الٹا لطف آتا ہے عاشق کی تو ہر حالت میں یہ شان ہوتی ہے۔ ؎

اے دل آں بہ خراب از مئے گلگوں باشی　　بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجان　　شرط اول قدم آنست مجنوں باشی[۱]

مجنون ہر حالت میں مصیبت کے لئے تیار رہتا ہے

دیکھئے مجنون کو کہ ہر مصیبت کے لئے تیار رہتا تھا، چنانچہ ایک دفعہ کا قصہ ہے کہ آپ اونٹنی پر سوار ہو کر لیلیٰ کی طرف چلے، اس اونٹنی کے ساتھ اس کا ایک چھوٹا بچہ تھا، وہ پیچھے رہ جاتا تھا، اور اونٹنی بار بار اس کی مڑتی تھی جس سے سفر میں دیر ہوتی تھی، یہ رنگ دیکھ کر آپ نے یہ شعر کہا ؎

ھویٰ ناقتی خلفی وقدامی الھوی　　وانی وایاھا یختلفان[۲]

یعنی میری ناقہ کا محبوب تو پیچھے ہے اور میرا محبوب آگے ہے، تو میں اور وہ ایک دوسرے سے اختلاف رکھتے ہیں، یعنی وہ پیچھے کو جانا چاہتی ہے اور میں آگے کو جانا چاہتا ہوں، پس اس اونٹنی ہی کو

---

[۱]: اے دل! یہ بہتر ہے کہ تو سرخ شراب میں (یعنی عشق حقیقی میں) مبتلا ہو۔ اور سونے کے خزانے کے بغیر قارون کی طرح تیرا دبدبہ ہو۔ لیلیٰ کی منزل تک جانے والے راستہ میں اگرچہ خطرات ہیں مگر اس راستہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تو مجنون ہو۔ [۲]: میری اونٹنی کا محبوب پیچھے ہے اور میرا محبوب آگے تو میں اور وہ دونوں ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔

چھوڑنا چاہئے اور پیدل چلنا چاہئے، اس کے بعد اتنا صبر بھی نہ ہوا کہ اس اونٹنی سے باطمینان اتر لیتے، نہیں بلکہ اپنے آپ کو اس کے اوپر سے گرادیا، بہت چوٹ لگی اور بدن پاش پاش ہوگیا، اب پیدل چلنے کے قابل بھی نہ رہے، اور سکون کس کو تھا، جب کچھ بن نہ پڑا تو لڑھکنا شروع کیا کہ مقصود سے کچھ تو قرب ہو، یہاں کوئی خشک کہہ سکتا ہے کہ بڑی غلطی کی، اگر باقاعدہ اترتے تو چوٹ نہ لگتی اور پیدل ہی چل کر لیلیٰ کے پاس جلدی پہنچ جاتے، اس طرح گرنے میں چوٹ بھی لگی اور مقصود بھی فوت ہوا، اب زخمی پڑے ہیں کہ معمولی طور پر بھی چل نہیں سکتے، اس کا جواب آپ کو کیونکر سمجھایا جائے، جو عشق کا مذاق رکھتا ہو وہی سمجھ سکتا ہے، عاشق کو بھلا اتنا ہوش کہاں کہ اونٹ کے اوپر سے یوں اترا کرتے ہیں، اور یہ قاعدہ ہے راستہ قطع کرنے کا، اس کا کام تو بس طلب ہے اور تڑپ۔ طالب صادق کا قول تو یہ ہوتا ہے۔

دست از طلب ندارم تا کامِ من بر آید یا تن رسد بجاناں یا جاں زتن بر آید [۱]

اسی قصہ پر مولانا فرماتے ہیں کہ

عشق مولیٰ کے کم از لیلیٰ بود گوئے گشتن بہراو اولیٰ بود [۲]

یعنی غیرت دلاتے ہیں مسلمانوں کو کہ جب مجنوں کا ایک عورت کے پیچھے یہ حال تھا تو مسلمان کا اللہ کی راہ میں کیا حال ہونا چاہئے؟ غرض عاشق کی تو یہ شان ہوا کرتی ہے، جب آپ اللہ کے عاشق ہیں تو پھر کسی بات کا کیا ڈر؟ اور ملامت کی کیا پرواہ؟، ان کی رضا کے لئے سب کچھ گوارا ہونا چاہئے، اس لئے آپ پہلے ہی سوچ لیجئے کہ اس طلب میں آپ کو کوئی ملاّ کہے گا، کوئی مسجد کا مینڈھا کہے گا، کوئی کہے گا کہ گلگلوں کی تسبیح گلے میں ڈال لو، میں کہتا ہوں کہ سب کی سن لو اور جواب کسی کو مت دو، جواب دینا تو طالب علموں کا کام ہے تمہارا کام نہیں، چوں چراں کرنا طالب علموں کا کام ہے، چنانچہ کیرانہ میں ایسا ہی ہوا، ایک طالب علم نے ایسی باتوں کا جواب خوب ترکی بہ ترکی دیا، وہ بیچارے مسجد کے حجرہ میں رہتے تھے، ان سے کسی دنیا دار نے کہا کہ مولوی لوگ تو مسجد کے مینڈھے ہوتے ہیں، انہیں کیا خبر کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، اس نے کہا جی ہاں! مگر مسجد کے مینڈھے دنیا کے کتوں سے ہزار درجہ بہتر ہیں، خیر! اس جواب کا بھی ایک موقع ہے مگر ہم تو اس کو بھی اچھا نہیں سمجھتے، ہم تو کہتے ہیں کہ بجائے ترکی بترکی جواب دینے کے یوں کہنا چاہئے تھا کہ اچھا بھائی تم ہم سے

۱:۔ جب تک مقصود حاصل نہ ہو جائے تلاش سے نہ رکوں گا یہ جسم محبوب تک جا پہنچے گا ورنہ روح اس جسم کو چھوڑ دے گی۔ ۲:۔ مولا کا عشق لیلیٰ سے کم کیسے ہو سکتا ہے؟ اس کے پیچھے تو گیند کی طرح لڑھکنا اور زیادہ ہوگا۔

اچھے سہی کیونکہ جب عشق کا دم بھرا تو پھر ملامت کی کیا پرواہ۔

مشہور مثل ہے کہ جب اوکھلی میں دیا سر تو موسلوں سے کیا ڈر[1]، تم کو تو اس پر قناعت کرنا چاہئے کہ ہم کو تو بفضلہٖ وہ دولت حاصل ہے کہ ملامت کرنے والے کو اس کی ہوا بھی نہیں لگی، وہ کیا ہے وہ یہ کہ تمہارا عاشقانِ الٰہی میں نام لکھا گیا ہے، دیکھئے ایک کیمیا گر کیمیا کے اوپر اتنا نازاں ہوتا ہے کہ اسے کوئی غریب کہے امیر کہے بھلا کہے برا کہے وہ ظاہر بھی نہیں کرنا چاہتا کہ میں کیمیا گر ہوں، وہ اپنی کیمیا پر مست ہے، دیکھنے والے اس کو لنگوٹ بند دیکھ کر غریب سمجھتے ہیں، بیوقوف سمجھتے ہیں مگر اس کے دل سے پوچھو کہ وہ کتنا خوش ہے، اسی طرح جب کہ آپ کو عشق کی کیمیا حاصل ہے تو آپ کو دنیا سے استغنا ہونا چاہئے اور کوئی کچھ بھی کہے اپنی اسی کیمیا پر مست رہنا چاہئے۔

ملامت سے ہمت قوی ہوتی ہے

اس ملامت کی ایک نئی حکمت قلب میں اس وقت وارد ہوئی وہ یہ کہ جس کام پر ملامت ہوتی ہے اس پر آدمی زیادہ مضبوط ہو جاتا ہے، کیونکہ طبعاً اپنی بات کی پچ ہو جاتی ہے، اور ضد میں آ کر اس کام کو جس پر ملامت کی گئی ہے اور بھی زیادہ کرنے لگتا ہے، اور ایک چڑ سی پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص کوٹھے پر چڑھتا ہو اور کمزوری کے باعث اس کو چڑھنا مشکل ہو تو اگر کوئی اس کو چڑھا دے کہ جی ہاں آپ چڑھ ہی تو جائیں گے تو اس کو اس طعن سے ایک جوش سا پیدا ہو جائے گا، اور جس طرح بھی بن پڑے گا چڑھ ہی کر دم لے گا، غرض ملامت سے ہمت قوی ہو جاتی ہے، اور یہ ہمت وہ چیز ہے جس کو طالب میں پیدا کرنے کے لئے شیخ وقت بہت تدابیر کرتا ہے اور یہاں اسکو وہ بات بلا ان تدابیر کے ملامت ہی سے حاصل ہوگئی تو بجائے برا ماننے کے اور خوش ہونا چاہئے، اور ملامت کرنے والے کا احسان ماننا چاہئے کہ جو کام شیخ بھی مشکل سے کرسکتا وہ اس نے ذرا بات کہہ کر کر دیا تو وہ ہمارا محسن ہوا یا دشمن۔

غرض آپ کسی کی عیب چینی سے نہ گھبرایئے اس سے گھی چینی ملے گی، اور عمل کی ہمت پیدا ہو جائے گی اور ہمت وہ چیز ہے کہ حکماء دین کہتے ہیں کہ علم سے زیادہ ہمت کی ضرورت ہے مگر آج کل ہمت کی بہت ہی کمی ہوگئی ہے، گو علم کی چنداں کمی نہیں، پہلے لوگوں میں اتنا علم نہ تھا جتنا اب ہے، مگر ہمت آج کل سے زیادہ تھی، اسی سے سارے کام درست ہو جاتے تھے۔

---

[1]۔ جب ہاون میں سر ڈال دیا تو دستے کی چوٹ سے کیا ڈرنا

علم سے متعلق کوتاہیاں

اور اس تفاوت سے کوئی یوں نہ سمجھے کہ علم کے متعلق کوئی شکایت نہیں، اس میں بھی بہت کوتاہیاں ہو رہی ہیں، چنانچہ اکثر لوگ علم حاصل تو کرتے ہیں مگر بے ڈھنگے طور پر، چنانچہ بعضوں نے تو یہ سمجھ لیا کہ علم نام صرف عربی پڑھنے کا نہیں، علم ہر زبان میں آ سکتا ہے، کیونکہ علم کے معنی ہیں ''جاننا''، جاننا عربی زبان سے بھی ہو سکتا ہے اور اردو سے بھی ہو سکتا ہے، اور صرف زبانی تعلیم سے بھی ہو سکتا ہے، ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ آج کل کتابیں اردو کی بکثرت موجود ہیں عربی کا مشغلہ ہی چھوڑ دیا جو بجائے خود ایک کمی ہے، کون نہیں جانتا کہ اردو کی کتابیں ہر فن کی موجود ہیں، مثلاً ڈاکٹری کا فن بقدر کفایت اردو میں موجود ہے، پھر آپ خود اس کو دیکھ کر اس میں ماہر کیوں نہیں ہو جاتے، اور ماہرین نے اس کی تحصیل کے لئے انگریزی وغیرہ کی قید کیوں لگائی ہے؟، ڈاکٹری کے کالجوں میں اردو کی کتابیں کیوں نہیں پڑھا دیتے؟، معلوم ہوا کہ عقلاء کے نزدیک یہ مسئلہ مسلم ہے کہ کسی فن کی اعلیٰ درجہ کی تکمیل اسی زبان میں ہو سکتی ہے جس زبان میں وہ فن مدون[۱] ہے، ترجموں سے تکمیل نہیں ہوتی۔

پھر حیرت ہے کہ دنیا کے فنون میں تو یہ مسئلہ مسلم ہو اور دین کے فنون میں مسلم نہ ہو، دین کے لئے صرف اردو دانی کو کافی سمجھ لیا جاتا ہے حتیٰ کہ دین میں دخل دینے کے لئے وہ لوگ بھی تیار ہو جاتے ہیں کن کو صرف اردو دانی آتی ہے، بلکہ اردو بھی صحیح طور سے نہیں آتی اور تلفظ اور املاء بھی ان کا صحیح نہیں، ایسے لوگ اہل فن یعنی علماء سے بحث مباحثہ کرنے کے لئے تیار ہو جاتے ہیں، خیر اس جھگڑے کو چھوڑو۔

اردو کی دینی کتب کسی عالم سے پڑھو

لو میں تنزل[۲] کرتا ہوں اور مطالعہ کو منع نہیں کرتا، اردو ہی میں دین کی کتابوں کا مطالعہ کرو، مگر اس کا طریقہ تو سیکھ لو، محض اردو دانی کو کتاب کے سمجھنے کے لئے کافی مت سمجھو، بلکہ ان ہی اردو کی کتابوں کو کسی معتبر عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لو، جہاں سینکڑوں کاموں کے لئے وقت صرف کرتے ہو ایک آدھا گھنٹہ اس کے لئے بھی صرف کیا کرو، دیکھئے کوئی شخص اردو کی قانون کی کتاب دیکھ کر ایک عرضی دعویٰ بھی نہیں لکھ سکتا، یہ کام بھی وکیل ہی سے پوچھ کر کیا جاتا ہے، اور اگر قانون کا علم پورا بھی حاصل کرنا نہ ہو بلکہ بقدر ضرورت ہی حاصل کرنا ہو وہ بھی اسی طرح آ سکتا ہے کہ قانون کی کتاب

۱: تحریر کیا گیا ہے۔ ۲: نیچے آ کر عرض کرتا ہوں۔

وکیل سے سبقاً سبقاً پڑھو، مگر گو قانون کی کتابیں اردو میں موجود ہیں لیکن زبان کے آسان ہونے سے یہ کہاں لازم آیا کہ وہ فن بھی آسان ہے؟، فن تو ایسا مشکل ہے کہ انگریزی دان اور پاس شدہ وکیل بھی ایک دم کام نہیں کر سکتے، پاس ہونے کے بعد بھی کسی وکیل کے پاس کام سیکھتے ہیں، تب وہ کام کے قابل ہوتے ہیں، اسی طرح دین کی کتابوں کی اردو تو آسان ہے مگر فن تو آسان نہیں، بس اردو سے آپ کو اتنی سہولت ہوگئی کہ آپ عبارت پڑھ سکتے ہیں، زبان کے سیکھنے کے لئے جتنا وقت عربی پڑھنے میں لگتا ہے وہ نہیں لگے گا، لیکن اس سے فن کہاں آسان ہوگیا، اور علماء سے استغناء کیسے ہوگیا، بس طریقہ صحیح یہی ہے کہ اردو کی کتاب بھی اگر دیکھنا ہو تو اس کو کسی عالم سے سبقاً سبقاً پڑھ لو۔

مزید سہل تدبیر

مگر میں دیکھتا ہوں کہ دین کی طرف سے اتنی لاپروائی ہے کہ اس کے لئے بھی کوئی تیار نہیں ہوگا کہ کتاب سبقاً سبقاً روزمرہ جا کر پڑھا کرے، اس لئے میں ایک اور اس سے زیادہ سہل تدبیر بتاتا ہوں، وہ یہ ہے کہ کتاب کا مطالعہ بطور خود ہی سہی لیکن جہاں سمجھ میں نہ آئے اس پر پنسل سے نشان لگادو، اور ہفتہ میں ایک دفعہ یا پندرہ دن میں ایک دفعہ کسی عالم کے پاس جا کر ان مقامات کو حل کرلو، ان مقامات کے سمجھنے میں خود اجتہاد نہ کرو، اب بتایئے کہ اس سے کون سا معاش میں حرج ہوا، اب کوئی عذر آپ کے پاس علم کے حاصل نہ کرنے کے لئے نہیں۔

یہ ڈھنگ ہے علم کے حاصل کرنے کا، اور بے ڈھنگا کام تو بے ڈھنگا ہی ہوتا ہے، آج کل تعلیم یافتہ اصحاب علم کا شوق رکھتے ہیں اور بعض وقت دین کی کتابیں بھی دیکھتے ہیں، لیکن صحیح طریق سے نہیں دیکھتے، لہٰذا کوئی نتیجہ کارآمد اس سے نہیں نکلتا، صحیح طریق وہی ہے جو میں نے عرض کیا۔

ہر ایک کی کتاب دیکھنا نقصان دہ ہے

تحصیل علم کے متعلق ایک بات اور بتلاتا ہوں جو نہایت ضروری ہے گو اس کو تعصب کہا جائے گا، مگر درحقیقت خیر خواہی ہے، وہ یہ ہے کہ مختلف مضامین اور مختلف مصنفین کی کتابیں نہ دیکھئے، آج کل یہ بھی ایک شوق ہے کہ جو کتاب ملی اسی کو دیکھنے لگے خواہ وہ ہندو کی ہو یا عیسائی کی ہو یا دہری کی ہو، نہ معلوم اس میں کیا مصلحت ہے سوائے وقت ضائع کرنے کے، بعض وقت علم متضاد ہوتے ہیں تو اس تضاد سے مفید علم بھی فاسد ہوجاتا ہے، جیسے کھانا کھا کر سنکھیا کھالیا کہ وہ خود ہضم ہوتا ہے نہ دوسرے کھانے کو ہضم ہونے دیتا ہے، بلکہ سب کو بگاڑ دیتا ہے اور سب زہر ہی زہر ہوجاتا ہے، اسی

طرح مختلف کتابیں دیکھنے سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوتا بلکہ شبہات پیدا ہو جاتے ہیں اور تمام علم زہر بن جاتا ہے اور قلب کو ہلاک کر دیتا ہے۔

محقق بننے کا صحیح طریقہ

اب اگر کوئی کہے کہ ہم مختلف کتابیں اس واسطے دیکھتے ہیں کہ محقق ہو جائیں کیونکہ تحقیق جب ہی ہوتی ہے کہ انسان متضاد چیزوں سے واقف ہو مثلاً کسی نے ہمیشہ میٹھا حلوا ہی کھایا ہے وہ حلوے کی قدر کیا جانے ؟، جب اس کو ایک دفعہ کڑوا ایلوا بھی کھلا دیا جائے تب اس کو قدر ہوگی کہ حلوا ایسی اچھی چیز ہے اسی واسطے کہا ہے تعرف الاشیاء باضدادھا[۱]

میں کہتا ہوں بسم اللہ آپ ضرور محقق بنئے ، مگر اس کا طریقہ یہ نہیں ہے ، اس کا طریقہ بھی یہی ہے کہ پہلے اپنے علم دین کو مکمل کر لیجئے اور اہل فن کی صحبت میں رہیئے ، اس کے بعد جس کی کتاب چاہے دیکھئے ، سلف نے بھی یہ کام کئے ہیں ، جن کی کتابیں اس وقت تک موجود ہیں جن کی بدولت علم کلام ایسا مکمل موجود ہے کہ قیامت تک کوئی مخالف دم نہیں مار سکتا ، اور یہ تکمیل اس طرح ہوگی کہ معاش کو آگ لگایئے طالب علم بنئے ، میزان[۲] سے پڑھیئے اور پوری تحصیل[۳] کیجئے ، پھر کسی محقق[۴] کی صحبت میں بھی کچھ روز رہیئے ، اس طرح آپ محقق بن جائیں گے ، یہ طریقہ کچھ دین ہی کے ساتھ خاص نہیں بلکہ ہر کام کی اور ہر فن کی حالت یہی ہے کہ سیکھنے اور محنت کرنے ہی سے آتا ہے ، صرف بطور خود ایک دو کتاب دیکھ لینے سے نہیں آتا ، غرض محقق بننا کچھ برا نہیں مگر ہر کام کا طریقہ ہے ، محقق بننے کا طریقہ وہ ہے جو میں نے بتایا ، آج کل لوگوں کو شوق ہے کہ کام طریقہ سے تو کرتے نہیں اور قدم رکھتے ہیں سب سے آگے۔

بے علم مسلمانوں کا مناظرہ میں حصہ نقصان دہ ہے

ایک کوتاہی علم کے متعلق یہ ہے کہ بعض بے علم مسلمان مناظروں میں گھس جاتے ہیں ، اور بعض وقت جہالت سے کامیاب بھی ہو جاتے ہیں ، پھر تو ان کا دماغ بہت ہی بڑھ جاتا ہے ، ایک جگہ ایک عیسائی تقریر کر رہا تھا ، اس نے اثناء تقریر میں اعتراض کیا کہ دیکھو حضرت عیسیٰ علیہ السلام مردہ کو زندہ کر دیتے تھے ، اندھوں کو اچھا کر دیتے تھے ، اس کے مسلمان بھی قائل ہیں ، خود قرآن میں موجود

---

[۱]: ۔ چیزوں کی صحیح پہچان ان کی ضد (مخالف) کی پہچان سے ہوتی ہے۔ [۲]: ۔ درس نظامی کی ابتدائی کتاب ''میزان الصرف''۔ [۳]: ۔ یعنی مکمل علم حاصل کیجئے۔ [۴]: ۔ جو دین کی بات صحیح طریقہ سے سمجھتا ہو۔

ہے، اور مسلمانوں کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) ایسا نہیں کرتے تھے، تو اس سے فضیلت ثابت ہوئی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر، آج کل کے سے محقق کھڑے تھے، وہ اس عیسائی سے الجھ گئے، اور کہنے لگے ہمارے حضور ﷺ کی تو بڑی شان ہے ایسے کام تو میں کرسکتا ہوں، وہ عیسائی اتفاق سے کانا تھا کہنے لگا مردہ کو زندہ کرنا تو بڑی بات ہے میری ایک آنکھ پھوٹی ہوئی ہے اسی کو درست کردو تو میں جانوں، اب ان کو کوئی علمی جواب تو آیا نہیں مگر تھے ذہین، کہنے لگے عیسی علیہ السلام تو نبی تھے اور میں ہوں امتی، ان کی برابری کا دعویٰ گستاخی میں شمار ہوگا، ہاں اتنا کرسکتا ہوں کہ تیری دونوں آنکھیں یکساں کردوں، اس طرح کہ دوسری کو بھی پھوڑ دوں، بس اس پر مجمع میں ایک قہقہہ لگا اور عیسائی خاموش ہوگیا، غرض بعض وقت اس طرح جاہلوں کی نظر میں کامیابی بھی ہوجاتی ہے مگر یہ کوئی کامیابی نہیں۔

باریک مسئلہ ہر شخص نہیں سمجھ سکتا

ایک کوتاہی تحصیل علم کے متعلق یہ ہے کہ دین کے متعلق کوئی عامی بھی سوال کرتا ہے تو دقیق سے دقیق[1] مسئلہ کا، جس کے سمجھنے کی لیاقت[2] نہیں، اور فرمائش یہ کی جاتی ہے کہ ہم کو تو سمجھا ہی دو، ایک انجینئر صاحب نے مجھ سے ایک مسئلہ علم بلاغت کے متعلق پوچھا، میں نے کہا اس کا جواب سمجھنے کے لئے چند علوم کی ضرورت ہے، کہنے لگے پھر مجیب[3] کا کمال ہی کیا ہوا، میں نے کہا جناب اقلیدس اردو میں ہے، اور عبارت اس کی کیسی سلیس ہے مگر اس ایک سہل سے سہل شکل کسی ایسے شخص کو سمجھا دیجئے جو اصول موضوعہ[4] اور علوم متعارفہ[5] کو نہ جانتا ہو، مگر آپ ایسا ہرگز نہیں کرسکتے، پھر آپ سے بھی یہی کہا جاسکتا ہے کمال ہی کیا ہوا جو آپ نے ایسے شخص کو نہ سمجھایا جو علومِ متعارفہ اور اصولِ موضوعہ کو نہ جانتا ہو، اور آپ انجینئر ہیں تعمیر کا کام بھی جانتے ہیں، اگر ایک معمار آپ سے یہ کہنے لگے کہ جو کام آپ آلات سے کرتے ہیں وہ مجھے بلا آلات کے سکھا دیجئے، تو آپ ایسا کرسکتے ہیں یا آپ کو یہی کہنا پڑیگا کہ بھائی وہ کام آلات ہی پر موقوف ہے، آلات منگالو اور ان کا استعمال سیکھ لو تب میرا سا کام کرسکو گے، اب انجینئر صاحب چپ تھے۔

بعض حضرات اس موقع پر یہ بھی کہنے لگتے ہیں کہ اچھا صاحب ہمارا سوال حل کرنے سے پہلے ان علوم کو بھی سمجھا دیجئے جن پر جواب کا سمجھنا موقوف ہے۔ مگر اس کے ساتھ فرمائش یہ بھی ہوتی

---

[1]:۔ باریک سے باریک۔ [2]:۔ قابلیت۔ [3]:۔ جواب دینے والے۔ [4]:۔ طے شدہ اصول۔ [5]:۔ متعلقہ علوم۔

ہے کہ اسی وقت اور ایک ہی مجلس میں سب کام ہو جائیں اور ہم یہاں سے محقق بن کر اٹھیں، میں پوچھتا ہوں کہ اتنی جلدی کون سا کام ہو جاتا ہے، ایک ذرا سا امتحان آپ دینا چاہتے ہیں تو اس کی تیاری میں کتنے دن لگتے ہیں، حالانکہ وہ علم ہی کیا ہے جس کا آپ امتحان دینا چاہتے ہیں، اور علم شرائع[۱] تو وہ علم ہے جو بڑے بڑے عقلاء کی سمجھ سے بالا ہے، جس کے لئے حق تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور عقل اس کے واسطے کافی نہ ہوئی بلکہ وحی کی ضرورت ہوئی۔

اب ایک اس علم کو لے لیجئے جو آپ کے ہم جنس انسانوں کا بنایا ہوا ہو، مثلاً پارلیمنٹ کی ممبری کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے ان کو آپ کسی یونیورسٹی میں حاصل کرنے کے لئے جائیں اور یہی فرمائش کیجئے کہ وہ علوم ہم کو سکھا دو اور یہی شرط کیجئے کہ اسی ایک جلسہ[۲] میں سکھا دو، دیکھیں کون سا پروفیسر ہے جو ایسا کر سکتا ہے، اگر کوئی ایسا کر سکتا ہے تو ہم بھی آپ کو ایک ہی جلسہ میں محقق بنا دیں گے، غرض یہ ناممکن ہے کہ ایک جلسہ میں بلکہ ایک دن میں، بلکہ دو چار دن اور دو چار مہینہ میں بھی محقق بنا دیا جائے، ہاں باقاعدہ طالب علمی کیجئے اور سب کام چھوڑ کر علم کے پیچھے پڑیئے، ایک معتد بہ[۳] وقت میں آپ ضرور محقق بن جائیں گے، پھر آپ نہ صرف خود ان مسائل کو سمجھ لیں گے بلکہ اوروں کو بھی سمجھا سکیں گے۔

غیر محقق کے لئے محقق کی اتباع ضروری ہے

اور اگر اس طرح طالب علمی کرنے اور باقاعدہ علم پڑھنے سے کم فرصتی کا عذر ہے اور اس ہوس کو چھوڑیئے، اور کسی محقق کا دامن پکڑیئے، اور جو کہے اس کو تسلیم کیجئے، تمام فنون میں یہی طریقہ ہے، آپ کیسے ہی بڑے آدمی ہوں اور کیسے ہی تعلیم یافتہ ہوں لیکن ڈاکٹر نہ ہوں اور آپ کا بچہ بیمار ہو تو آپ کو ڈاکٹر ہی کے پاس جانا پڑے گا، اور جو وہ کہے گا وہی کرنا ہوگا، اس کے نسخہ کو آپ پڑھ بھی نہ سکیں گے، مگر یہ نہ کہہ سکیں گے کہ ذرا سمجھا دیجئے کہ نسخہ کیا لکھا اور کس مرض کا لکھا ہے، اسی کا نام تو اتباع[۴] ہے، وہ ڈاکٹر اس وقت بمقابلہ آپ کے محقق ہے آپ غیر محقق ہیں، اس واسطے اس کی ہر بات کو تسلیم ہی کرنا پڑے گا، اس سے ثابت ہوا کہ غیر محقق کو محقق کے اتباع سے چارہ نہیں۔

دنیا کے کاموں میں یہ سب کے نزدیک مسلم ہے پھر دین کے کاموں میں کیوں مسلم نہیں، غرض یا تو محقق بنئے یا محقق کا اتباع کیجئے، اور اس کے سامنے قیل وقال[۵] نہ کیجئے، میں یہ بھی بتا دوں گا

۱:۔شریعت کا علم ۔ ۲:۔مجلس ۔ ۳:۔ایک مناسب مدت ۔ ۴:۔ پیروی کرنا ۔ ۵:۔ بحث، سوال وجواب ۔

کہ محقق کس کو کہتے ہیں اور وہ کیسے مل سکتا ہے کوئی پہلو نہ چھوڑوں گا ان شاء اللہ، مگر سب سے پہلے اس پندار کو دماغ سے نکال دیجئے کہ ہم محقق ہیں، پھر محقق کی تلاش شروع کیجئے اور عزم کر لیجئے کہ اگر کوئی محقق مل گیا تو ہم اس کی جوتیوں میں پامال ہو جائیں گے جس کو مولانا فرماتے ہیں۔

پیش یوسف نازش وخوبی مکن ‌ ‌ ‌ جز نیاز و آہ یعقوبی مکن [۱]

اس کے سامنے ناز سے کام نہیں چلتا نیاز ہی سے کچھ کام چل سکتا ہے۔

محقق کے ملنے کی دوصورتیں

اب میں محقق کے ملنے کا طریقہ بتلاتا ہوں، سو اس کی دوصورتیں ہیں ایک تو غیر مکتسب[۲] یعنی منجانب اللہ ایسا محقق مل گیا، اور عادۃ اللہ یہ ہے کہ طلب صادق[۳] پر اس کا ترتب ہو جاتا ہے، طلب صادق میں یہ اثر ہے کہ مطلوب مل ہی جاتا ہے، مثل مشہور ہے ''جوینده یابنده[۴]'' یہ مثل چاہے اور کسی کام میں صحیح ہو یا نہ ہو مگر اس طریق میں تو بالکل صحیح ہے خدا کا طالب خدا تک پہنچ کر رہتا ہے بشرطیکہ طلب صادق ہو، طلب صادق خود پہنچا دیتی ہے مطلوب تک، عادت الٰہی یہی ہے کہ اسی کے متعلق مولانا کہتے ہیں۔

ہر کجا پستی است آب آنجا رود ‌ ‌ ‌ ہر کجا مشکل جواب آنجا رو
ہر کجا دردے دوا آنجا رود ‌ ‌ ‌ ہر کجا رنجے شفا آنجا رود[۵]

اور ایک جگہ اس مضمون کو زیادہ کھول کر فرمایا ہے۔

آب کم جو تشنگی آور بدست ‌ ‌ ‌ تا بجوشد آب از بالا و پست
تشنگان گر آب جویند از جہاں ‌ ‌ ‌ آب ہم جوید بعالم تشنگاں[۶]

دوسرے شعر میں وصول کا راز بتلایا ہے، وہ یہ کہ طلب صرف ادھر سے نہیں ہوتی بلکہ ادھر سے بھی ہوتی ہے، بلکہ اول ادھر سے ہوتی ہے، اگر ادھر سے نہ ہوتی تو ادھر توفیق طلب کی کیسے ہوتی؟

---

[۱]:۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے ناز و انداز مت اپناؤ، بلکہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرح آہ وزاری کرو۔ [۲]:۔ غیر اختیاری۔ [۳]:۔ سچی طلب۔ [۴]:۔ جو تلاش کرتا وہ منزل پالیتا ہے۔ [۵]:۔ جہاں نشیب ہو وہاں پانی جاتا ہے۔ جہاں مشکل ہو وہاں جواب ملتا ہے، جہاں درد ہو وہیں دوا۔ جہاں رنج وہیں شفا۔ [۶]:۔ پانی کم تلاش کر پیاس زیادہ پیدا کر۔ جب پیاس ہوگی تو اوپر نیچے ہر طرف سے پانی ابل پڑے گا۔ پیاسے اگر پانی کی تلاش میں پھرتے رہتے ہیں تو پانی بھی اس دنیا میں پیاسوں کا منتظر رہتا ہے۔

توفیق بھی تو ان ہی کے دینے سے ہوتی ہے، غرض طلب صادق مطلوب تک پہنچا دیتی ہے، گویا طلب صادق کو الہام ہوتا ہے کہ یہ کام فلاں جگہ ہوگا فلاں محقق ہے، اور اکثر یہی ہوتا ہے کہ طالب ایسی جگہ پہنچ جاتا ہے جہاں اس کا کام ہونے والا ہے۔

دوسری صورت

اور دوسری صورت مکتسب ہے وہ یہ کہ جتنے مشائخ وعلماء اس وقت مشہور ہیں، ان سب کے پاس خالی الذھن ہوکر چند روز رہ کر دیکھو، اس سے ضرور حق واضح ہو جائے گا، اب میں کہتا ہوں کہ اگر اس طرح مل گیا اور تردد باقی نہ رہا تو بس محقق متعین ہوگیا، اب اس کے پاس رہو یا نہ رہو مگر اس کا اتباع کرو اس محقق کے سامنے چوں وچرا نہ کرو، حتی کہ بدوں اس کے اذن [۱] کے کتاب بھی مت دیکھو صرف اس کو دیکھو اس کے اقوال کا اور اس کے افعال کا اتباع کرو۔ خوب کہا ہے ؎

در مصحف روئے او نظر کن — خسرو غزل وکتاب تا کے [۲]

دیکھئے آپ مقدمہ لڑانے عدالت میں جاتے ہیں تو جو وکیل بلکہ وکیل کا محرر کہتا ہے وہی کرنا پڑتا ہے، حتی کہ کاغذ پر دستخط بھی اگر بے موقع کر دیئے تو وہ دوسری جگہ دستخط کراتا ہے، آپ کی اتنی بھی مجال نہیں ہوتی کہ اس سے پوچھیں کہ اس جگہ دستخط کرنے میں کیا خرابی تھی جو دوسری جگہ دستخط کراتے ہو۔ اس معنی کر کہا ہے ؎

جملہ اوراق وکتب درنار کن — سینہ را از نور حق گلزار کن [۳]

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کتابیں غلط ہیں، پڑھنا لکھنا نہیں چاہئے، جیسے بعض جاہل اس کا مطلب یہی لے لیتے ہیں کہ پڑھنے لکھنے کی کوئی ضرورت نہیں، بس کودا اچھلا کرو اور جو چاہو کرتے رہو، اور کیسے ہی برے سے برے افعال اور گناہ کرو کچھ حرج نہیں، اور جب کوئی اعتراض کرے تو یہی پڑھ دو۔ ع ''جملہ اوراق وکتب درنار کن'' بہت سے جاہل پیر ایسے ہی پھرتے ہیں، جو الف کے نام بے بھی نہیں جانتے اور خود بھی گمراہ ہیں اور اوروں کو بھی گمراہ کرتے ہیں، جو چاہیں کرتے پھرتے ہیں، اور یہی جملہ ان کا متمسک [۴] ہے ع ''جملہ اوراق وکتب درنار کن''۔

میں کہتا ہوں کہ اگر اس پر عمل ہے تو آپ کے یہاں دنیا کے بھی تو کچھ کاغذات ہونگے، مثلاً

---

[۱]: اس کی اجازت۔ [۲]: اس کے چہرہ کو پڑھتے رہو پھر غزل اور کتاب پڑھنے کی کیا ضرورت۔ (جاری ہے)

بیع نامے، تمسک رہن نامے وغیرہ سب کو ایک دم آگ میں چھونک دو، غرض اس جملہ کا یہ مطلب نہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ جب کوئی محقق تم کو مل جائے تو اس سے کچھ حاصل کرنے کے لئے کچھ عرصہ کے واسطے اس طرح اس پر عمل کرو کہ جو وہ کہے اس کے مقابلہ میں کتاب پیش مت کرو، اس سے کسی بات میں معارضہ مت کرو جو وہ کہے آمنّا وصدّ قنا[۱] کہہ کر تسلیم کرو۔

محقق کے پاس رہنے سے غلط سوچ دور ہوگی

اس کا راز یہ ہے کہ کتاب تو غلط نہیں ہے لیکن تمہاری سمجھ غلط ہے اگر تمہیں کتاب سمجھنے کی لیاقت ہوتی تو تم کو محقق کی ضرورت ہی کیا تھی، جب تمہیں اتنی لیاقت نہیں، جب ہی تو اس کے پاس گئے ہو، پھر اس کے سامنے لیاقت بگھارنا اپنے افعال میں تعارض ہے، چند روز اسی طرح اس کے اقوال کو تسلیم کرو پھر تم کو معلوم ہو جائے گا کہ جو وہ کہتا ہے وہ ہی کتاب کہتی ہے، اور جو تم سمجھتے تھے وہ غلط تھا مگر ابتدا میں کتاب پر اعتماد کرنا اور اس کے قول پر اعتماد نہ کرنا یہ زہرِ قاتل ہے اور اس کا نتیجہ سوائے گمراہی اور محرومی کے کچھ نہیں۔

محقق کے لئے صاحبِ کشف ہونا ضروری نہیں

نیز اس کی صحبت میں بہت سی باتیں وہ بھی دیکھو گے جو تصریحاً کتاب میں نہیں ملیں گی، اس اس طرح سمجھ لینا کہ ایک شخص گانا سیکھنا چاہتا ہے تو علمِ موسیقی کا استاد جس طرح کہے اور جس طرح خود آواز نکال کر بتلائے، اسی کی تقلید کرنی پڑے گی، تب تو گانا آئے گا، اور اگر کوئی موسیقی کی کتاب ہاتھ میں لے کر استاد پر اعتراض کرنا شروع کردے کہ استاد! یہ تال آپ کی کتاب کے خلاف ہے، اور یہ سُر آپ کا کتاب کے خلاف ہے، تو اس کو گانا کبھی نہیں آئے گا، ہاں اگر استاد کا پورا اتباع کیا، اور اس کے کہنے سے اس کے گانے کی نقل بے سوچے سمجھے اتاری تو چند ہی روز میں گانا آجائے گا، اور یہ بھی ثابت ہو جائے گا کہ استاد جو بتاتا تھا وہ سب کتاب کے موافق ہی تھا، باقی محقّق کے لئے صاحبِ کشف اور صاحبِ تصرف[۲] ہونا لازم نہیں، جیسا آج کل یہ بھی ایک خبط[۳] ہے، اور اسی کو معیارِ کمال اور محقّق اور کامل کی پہچان قرار دے رکھا ہے کہ جس کے پاس بیٹھو اور کشف ہونے لگے اور کلکتہ اور بمبئی اور سمندر نظر آنے لگے، وہ کامل ہے اور جس کی صحبت میں یہ بات حاصل نہ ہو اس کو کچھ بھی نہیں

(بقیہ صفحہ گذشتہ) [۳]:۔ تمام کاغذ اور کتابوں کو آگ کے سپرد کر کے اپنے سینہ کو حق کے نور سے منور کر دو۔ [۴]:۔ لیل۔

(متعلقہ صفحہ ھذا) [۱]:۔ درست ہے اور سچ ہے۔ [۲]:۔ اسے کشف ہو یا وہ لوگوں ک الٹ پلٹ کر دیتا ہو۔ [۳]:۔ بے وقوفی۔

سمجھتے یہ ایسی غلطی ہے کہ بہت سے لکھے پڑھے اس میں مبتلا ہیں اور بہت سے آدمی اس کشف و کرامت کی بدولت گمراہ ہو چکے ہیں کسی نے تصرف سے خواب میں اپنی حقانیت دکھادی، کسی نے تصرف سے کلکتہ کی سیر کرادی بس اسی کے پیچھے ہو لئے، ایمان تک کی بھی پرواہ نہ رہی، کلکتہ چیز ہی کیا ہے بلکہ ساری دنیا کیا چیز ہے۔

محقق سے کیا چیز حاصل کرنی ہے؟

جو چیز محقق سے حاصل کرنے کی ہے وہ تو چیز ہی اور ہے، وہ چیز کیا ہے؟ **وصول الی اللہ** یعنی حق تعالی کو پہچاننا، جب حق تعالی کو پہچانو گے تو دنیا کو کیا اپنے آپ کو بھی بھول جاؤ گے، یہ چیز کسی گمراہ سے حاصل نہیں ہوسکتی، باقی کشف و کرامت اور تصرّفات اور شعبدے ہر قسم کے آدمی سے ہو سکتے ہیں، بہت سے جوگی بہت سے مسمریزم والے بہت سے شعبدے باز ایسی چیزیں دکھلا سکتے ہیں جو سمجھ میں نہیں آسکتی، ان چیزوں کے لئے حق پر ہونا شرط نہیں اور **وصول الی اللہ** کے لئے حق پر ہونا شرط ہے اور اسی کے لئے محقق کی تلاش کی ضرورت ہے۔

محقق کے سامنے چوں و چراں نہ کرو

غرض جب ایسا محقق مل جائے تو پھر وہ جس راہ پر چلائے اسی راہ چلو اس کے سامنے لم اور کیف اور چوں چرا نہ[1] کرو، کیونکہ وہ تم کو ایسے راستہ پر لے جا رہا ہے جس کو تم نہیں جانتے پھر ایسی بات میں دخل دینا جس کو تم نہیں جانتے کیسے درست ہوسکتا ہے، بلکہ اس کے ہاتھ میں **کالمیت فی ید الغسال**[2] ہو جاؤ، اور جو تصرف تمہارے اندر کرے کرنے دو چند روز میں ثابت ہوگا کہ اس کے تصرف سے تم کو کیا نفع پہنچا۔

محقق ملنے کے بعد دوسری طرف نظر نہ اٹھاؤ

اور اس صورت کے متعلق میں ایک ضروری بات یہ بھی بتائے دیتا ہوں کہ جس کو ایسا محقق مل گیا ہو اور تردد نہ رہا ہو، اس ایک ہی کو اختیار کر لینا چاہئے، اس کو دوسری طرف نظر اٹھانا جائز نہیں، اسی میں متفرق کتابوں کا دیکھنا بھی داخل ہے بعض لوگ کہہ دیا کرتے ہیں کہ مختلف کتابوں کے دیکھنے میں کیا حرج ہے، اگر کہیں کوئی مضمون غلط اور مضر ہوگا تو اس کی اصلاح ہم اپنے محقق سے کرلیں گے،

---

[1]:۔ کیوں اور کیسے۔ [2]:۔ جیسے مردہ نہلانے والے کے ہاتھ میں۔

میں کہتا ہوں یہ ایسا ہے جیسے انگلی آگ میں جلا لینا اس اعتماد پر کہ ہمارے پاس ایک مجرب مرہم ہے وہ لگالیں گے، اس کو کون عقلمند پسند کرے گا کہ پہلے انگلی کو جلالو پھر مرہم لگاؤ، بیوقوف سے بیوقوف بھی یہی کہتا ہے کہ آگ سے بچتے رہو، اسی طرح یہ کونسی عقلمندی ہے کہ ایک مضر کتاب دیکھو پھر اس سے جو نقصان پہنچے اس کی اصلاح کیلئے دوسری کتاب تلاش کرو یا شیخ اور محقق کو دق[1] کرو، یہی کیوں نہ کرو کہ ایسی کتاب ہی نہ دیکھو، شیخ کے پاس رہ کر اور ہی کام بہتیرے ہیں وہ کرو۔

مرہم پٹی پر ایک قصہ یاد آیا، کوئی سرحدی پٹھان ہندوستان آئے تھے، ان کے بدن پر زخم ہوگئے، کسی نے ان کا علاج کیا اور مرہم پٹی کی وہ اچھے ہوگئے، بہت خوش ہوئے، اور کہا بھائی تم ہمارے یہاں آئے گا تو ہم تم کو اس کا بدلہ دے گا، ہم تم سے بہت خوش ہے، یہ ہندوستانی اتفاقاً ان کے ملک میں پہنچے اور تلاش کرتے کرتے مکان پر بھی پہنچ گئے، خان ملے بہت خوش ہوئے اور کھانا کھلایا، ٹھرایا، پھر کہا بھائی تم بیٹھے گا ہم تمہارے احسان کا بدلہ دے گا، ہم ابھی آتا ہے، یہ کہہ کر خان کہیں کو گئے، یہ مہمان سمجھے کوئی توڑا روپؤں کا لا کر دے گا، خوشی خوشی بیٹھے رہے، خان کی بیوی نے کہا کہ ارے کمبخت کیوں تری موت لائی ہے وہ چھرا لینے گیا ہے، وہ تجھے زخمی کرے گا پھر ان زخموں کا علاج کرے گا جیسے تو نے زخموں کا علاج کیا تھا کیونکہ وہ کہا کرتا تھا کہ اگر وہ یہاں آیا تو میں یہی کروں گا، یہ حضرت وہاں سے بدحواس ہو کر بھاگے اور چھپ چھپا کر اپنی جان بچا کر نکل آئے۔

اگر کوئی کتاب دیکھنی ہو تو محقق سے اجازت لو

یہ بری کتابوں کا دیکھنا پھر اس کی اصلاح کرنا ایسی حماقت ہے جیسے اس سرحدی نے تجویز لی تھی، بالفرض اگر کچھ ضرر[2] بھی نہیں ہے تو کم از کم تضییع وقت[3] تو ہے ہی، محقق کے پاس رہ کر وہ کام کیجئے جو اس کے پاس رہ کر کرنے کے ہیں، یہ وقت پھر نہیں ملے گا، دوسرے مضر یا فضول اشغال میں اپنا وقت پھر ان کی اصلاح میں اس کا وقت ضائع نہ کیجئے، اگر ایسا ہی کتب بینی کا شوق ہے تو اسی محقق سے پوچھ لیجئے کہ میں فلاں کتاب دیکھنا چاہتا ہوں، اگر وہ اجازت دے تو دیکھئے ورنہ نہیں، غرض اس سے ایسا تعلق رکھئے کہ نرم گیر و سخت گیر و خوش بگیر[4]۔

محقق سے اپنا عیب مت چھپاؤ

ا:۔تنگ کرو۔ ۲:۔ نقصان۔ ۳:۔وقت ضائع کرنا۔ ۴:۔نرمی کرے یا سختی خوش رہو۔

اسی طرح اس سے اپنا کوئی عیب مت چھپاؤ اور ان عیبوں کی اصلاح کے لئے جو وہ کہے وہ کرو وہ تمہارے عیبوں کی ایسی اصلاح کر دے گا جیسے صابن میلے کپڑے کی اصلاح کر دیتا ہو، بعض لوگوں کو اپنا عیب ظاہر کرتے عار آتی ہے، میں کہتا ہوں پھر اصلاح کیسے ہوگی، شیخ پر ظاہر کر ہی دینا چاہئے۔

یہ بھی اطمینان رکھئے کہ وہ بد تہذیب نہیں ہے، وہ آپ کے عیبوں کو گاتا نہیں پھرے گا بلکہ دل سے اور للّٰہیت کیساتھ ان کی اصلاح کرے گا، اور بدوں اس کے یعنی بلا عیبوں کو ظاہر کئے ہوئے ہرگز امید نہ رکھئے کہ اصلاح ہو سکے گی، بلکہ اگر وہ تمہارے عیبوں کو دوسروں کیسامنے ظاہر بھی کر دے تو سمجھ لو کہ اسی میں تمہاری مصلحت ہوگی، یہ ایسا ہے جیسے ڈاکٹر کہے کہ اس مرض کا آپریشن دھوپ میں اور ہوا میں کھلی جگہ میں ہوگا، تو اگر اس سے علاج کرانا اور صحت کا حاصل کرنا منظور ہے تو یہی کرنا پڑے گا، اور حیا اور شرم کو بالائے طاق رکھنا ہوگا، اسی طرح شیخ کے سامنے عار[۱] کو چھوڑ دو اور اس کی ہر تجویز کو اپنے واسطے مفید سمجھو اور مکدر[۲] کو نفع نہ ہوگا، اور شیخ کے پاس جانا بیکار رہو گا۔

قزوینی کا سبق آموز قصہ

مثنوی میں ایک قصہ قزوینی کا لکھا ہے کہ کسی زمانہ میں ان میں گدوانے کا رواج تھا، اور لوگ اپنے جسم پر تصویریں بنوایا کرتے تھے، ایک قزوینی ایک گودنے والے کے پاس پہنچا اور فرمائش کی کہ میری کمر پر شیر کی تصویر بنا دے، اس نے کہا اچھا اور کمر کھول کر کام کرنا شروع کیا، پہلے دم کی طرف سے تصویر بنانی چاہی، ایک سوئی کچ سے چبھوئی، اس نے کہا یہ کیا کرتے ہو، کہا شیر کی دم بناتا ہوں، اس نے کہا میاں دم کو جانے دو، لنڈورے شیر بھی تو ہوتے ہیں، اس نے کہا اچھا، اب اس نے سر بنانا چاہا پھر سوئی کچ سے چبھوئی، اس نے کہا اب کیا کر رہے ہو، کہا شیر کا سر بناتا ہوں، کہا میاں یہ شیر سچ مچ کا تھوڑا ہی ہے یہ کیا کچھ کھائے پیئے گا جو منھ اور سر بناتے ہو، سر کو رہنے دو، گودنے والے پیٹ بنانا چاہا تو پھر سوئی چبھوئی، پھر یہ چیخ اٹھے اور کہا کیا کر رہے ہو، کہا پیٹ بناتا ہوں، کہا جب اس کو کھانے پینے کی ضرورت نہیں تو پیٹ کی بھی کیا ضرورت ہے؟، غرض جب وہ گودنے والا شیر کا کوئی عضو بنانا چاہے تو یہ چیخنے لگیں، تو اس نے جھلا کر کہا کہ شیر بنوانے کو آئے ہو، اور کوئی عضو بنانے نہیں دیتے تو میں کیا چیز بناؤں؟ شیر تو آخر چند اعضاء ہی کے مجموعے کا نام ہے، جب تم کوئی عضو ہی نہیں بنا دیتے تو

۱:۔شرم۔ ۲:۔ تنگ دل۔

پھر شیر بنوانے ہی کے کیا معنی؟ ایسا شیر تو بھائی مجھے بنانا نہیں آتا جس کی نہ دم، نہ سر، منہ ہو نہ پیٹ، ہاتھ پاؤں ہوں نہ ناک کان،

شیر بے گوش و سرو شکم کہ دید　　ایں چنیں شیرے خدا ہم نا فریدا[۱]

اس پر مولانا فرماتے ہیں۔

چوں نداری طاقت سوزن زدن　　پس تو از شیر زیاں کم دم بزن[۲]

یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو اصلاح کرانے کا تو دم بھرتے ہیں، اور جب ان کو روک ٹوک کی جاتی ہے تو مکدر ہوتے ہیں، اور بات بات پر حجت[۳] کرتے ہیں کہ اس میں کیا حرج ہے، اس میں کیا حرج ہے؟ حرج کو تم جانتے ہو یا تمہارا مصلح! اگر تم خود ہی حرج کو جانتے ہو تو پھر مصلح کے پاس کیوں آئے، جب مصلح کے پاس آئے ہو تو اپنی رائے کو چھوڑ دو۔

چوں گزیدی پیر ہین تسلیم شو　　ہمچو موسی زیر حکم خضر رو[۴]

در بہر زخمے تو پر کینہ شوی　　پس کجا بے صیقل آئینہ شوی[۵]

اگر مصلح سے بحث ومباحثہ رہا تو فائدہ نہ ہوگا

خوب سمجھ لو کہ اگر قیل وقال[۶] رہے گی تو بس تم جیسے تھے ویسے ہی رہو گے، اپنا وقت بھی خراب کرو گے اور مصلح کا بھی، دیکھو آئینہ کو کتنا رگڑا جاتا ہے تب اس میں جلا پیدا ہوتی ہے، چاہئے تو یہ کہ اگر وہ تمہاری رعایت کرے اور نرمی کرے تو فرمائش کرو کہ رعایت نہ کیجئے کام پورا کیجئے، ڈاکٹر جب آپریشن کرتا ہے تو اس کو اچھا سمجھا جاتا ہے، اور اسی طرح روحانی آپریشن کو سمجھ لو، اس میں بھی یہی فرمائش ہونا چاہئے کہ پورا کام ہو رعایت اور نرمی نہ کی جائے، خیر اگر یہ فرمائش بھی نہ ہو تو کم سے کم یہ تو ہونا چاہئے کہ اس کے مجوزہ تصرفات[۷] پر راضی رہیں۔

محقق مصلح ماں ہے شفقت میں، باپ ہے عقل میں

---

[۱]:۔ ایسا شیر جس کے نہ کان ہوں نہ سر نہ پیٹ وہ کس نے دیکھا؟ اس جیسا شیر تو خدا نے بھی نہیں بنایا۔ [۲]:۔ جب سوئی لگنے کی طاقت تم نہیں تو شیر کا نام ہی مت لو۔ [۳]:۔ بحث [۴]:۔ جب کسی کو پیر بنایا تو اپنے آپ کو اس کے سپرد کرو جیسے حضرت موسی علیہ السلام نے اپنے آپ کو حضرت خضر علیہ السلام کے سپرد کر دیا تھا۔ [۵]:۔ اگر تم ہر زخم پر غصہ کرو گے تو بغیر رگڑائی کے آئینہ جیسا کب بنو گے؟ [۶]:۔ بحث مباحثہ۔ [۷]:۔ تجویز کردہ کاموں۔

خوب سمجھ لیجئے کہ محقق مصلح بالکل باپ ہے اور بالکل ماں ہے، یعنی ماں ہے شفقت میں اور باپ ہے عقل میں ماں ہر وقت اسی فکر میں رہتی ہے کہ میرا بچہ تندرست رہے موٹا تازہ رہے اور جلدی جلدی بڑا ہو جائے اور باپ یہ چاہتا ہے کہ بچہ علم و ہنر سیکھے، ترقی حاصل کرے، اسی طرح مصلح ماں کی طرح ہر وقت یہ چاہتا ہے کہ طالب کو فائدہ پہنچ جائے، اور باپ کی طرح ہر وقت یہ چاہتا ہے کہ طالب کی اصلاح ہو جائے، نفس و شیطان سے بچا رہے اور آخرت کی ترقی حاصل کرے، پھر ایسے ہمدرد کا کہنا ماننا چاہئے یا مخالفت کرنا چاہئے؟ اس سے تو کسی قسم کا خطرہ نہیں رکھنا چاہئے، وہ جو کچھ کہے گا ہمدردی سے کہے گا۔

آداب شیخ

غرض محقق پیر مل جائے تو غنیمت سمجھو، اور اس کی صحبت کو اکسیر اعظم سمجھو، اور اپنے آپ کو عمر بھر کے لئے اس کے سپرد کر دو، اور اس سے کسی امر میں قیل و قال مت کرو، اور اس کے کسی فعل میں بدگمانی بھی نہ کرو، بہت سے افعال اس کے ایسے ہوں گے جو تمہاری سمجھ میں نہ آئیں گے، اس وقت جلدی مت کرو بلکہ دیکھتے رہو، بعد میں اس کا راز کھل جائے گا، ہاں اگر کوئی امر خلاف شریعت کرے تو اور بات ہے، لیکن اس میں بھی جلدی نہ کرو حتی الامکان محمل صحیح[۱] پر اس کو محمول کرو، اگر سمجھ میں نہ آئے تو چند دن[۲] انتظار کرو، ہاں اگر بار بار خلاف شریعت اس سے صادر ہو اور کوئی تاویل بھی نہ سکے تو اس سے علیحدہ ہو جاؤ یعنی اس پیر کو چھوڑ دو، مگر اس صورت میں بھی اس کے ساتھ گستاخی نہ کرو، یہ ہیں آداب شیخ، اور اس طریق میں ادب بھی ایک چیز ہے بلا اس کے ایک قدم چلنا ناممکن ہے۔

محقق نہ ملنے کی شکایت اور اس کا جواب

یہ اس صورت میں ہے کہ کسی کو محقق پیر مل جائے اور تردد[۳] نہ رہے، مگر ایک آزاد جماعت وہ بھی ہے جو سمجھتے ہیں کہ کس کا اتباع کریں؟ محقق ملتا ہی نہیں، یہ شکایت آج کل اکثر زبانوں پر ہے کہ ہم کو کس کی پیروی کریں، علماء اور مشائخ میں خود اختلاف ہے، کوئی کچھ کہتا ہے اور کوئی کچھ، اور بعض لوگ تو اس کے متعلق بہت ہی دریدہ دہن[۴] ہیں، اور جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں کہ سب کو چھوڑ و اس غم ہی کو مت پالو۔

ان حضرات سے میں یہ عرض کرتا ہوں کہ اختلاف کس چیز میں نہیں ہے، دنیا کی کوئی چیز بھی

۱:۔ کسی صحیح صورت۔ ۲:۔ کچھ دن۔ ۳:۔ شک شبہ۔ ۴:۔ گستاخ۔

اختلاف سے خالی نہیں، معاملہ علاج ہی کو لے لیجئے کہ جس ڈاکٹر کے پاس جاؤ جس حکیم کے پاس جاؤ اس کی تشخیص الگ، تجویز الگ، دوائیں الگ، بلکہ خود طبیں[۱] بھی الگ الگ ہیں، فروع تو فروع اصول بھی الگ الگ ہیں، کسی طب میں علاج بالضد ہے کسی میں علاج بالمثل، غرض اتنا اختلاف ہے کہ خدا کی پناہ، مگر ہم کسی کو نہیں دیکھتے کہ اس اختلاف سے یہ نتیجہ نکالے کہ ڈاکٹروں اور طبیبوں کو مطلقاً چھوڑ دے اور بیماری میں علاج ہی نہ کرے، بلکہ دیکھا جاتا ہے کہ ذراسی پھانس بھی لگ جائے یا خفیف ساز کام بھی ہو جائے تو ڈاکٹر اور حکیم کی تلاش ہوتی ہے، اور اختلاف اطباء سے متاثر نہیں ہوتے، اور یہ نہیں کرتے کہ کسی کا بھی علاج نہ کریں خود کو اپنے ہی حال پر چھوڑے رکھیں، بلکہ ڈاکٹر اور طبیب کو ڈھونڈتے ہیں، اور یہ کام بھی کسی اناڑی اور عطائی سے نہیں لیتے، بلکہ اس کے لئے بھی ہوشیار اور کارکردہ معالج کو تلاش کرتے ہیں اور کوئی نہ کوئی مل جاتا ہے، ایک پھانس کے لگ جانے میں تو یہ حالت ہوتی ہے، اور دین کے بارہ میں یہ حکم لگادیا کہ چونکہ علماء میں اختلاف ہے لہذا سب کو چھوڑ دو، اس سے ثابت ہوتا ہے کہ ان کے نزدیک دین اتنا بھی مہتم بالشان نہیں جتنی ایک پھانس کا لگنا، مگر ان لوگوں کو چھوڑیئے اس وقت ان سے خطاب نہیں، ان کی نسبت تو بس یہ کہنا کافی ہے۔

فسوف تری إذا انكشف الغبار أفرس تحت رجلک ام حمار[۲]

آنکھیں بند ہوتے ہی معلوم ہو جائے گا کہ تمام عمر کس خبط[۳] میں گذر گئی جس کا اب کچھ تدارک نہیں ہوسکتا۔

محقق تلاش کرنے کا طریقہ

اس وقت خطاب ان لوگوں سے ہے جو دین کی پرواہ رکھتے اور محقق اور مصلح کی تلاش بھی کرتے ہیں مگر طریقہ معلوم نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور وجہ سے ان کا تردد رفع نہیں ہوتا، ایسے لوگوں کو میں مقصود کے پانے کا طریقہ مکرر بتاتا ہوں، اور وہ وہی ہے جو اوپر قریب ہی بیان کر چکا ہوں کہ چند جگہ کا انتخاب کرو، کیونکہ دنیا خالی نہیں نہ کبھی خالی ہوگی، پھر تھوڑا وقت اور پیسہ خرچ کرو اور ہر ہر جگہ ایک ایک ہفتہ رہو، مگر یہ شرط ہے کہ خالی الذہن ہو کر رہو، نہ کسی کے معتقد ہو نہ مخالف، اور وہاں کی ہر ہر حالت میں غور کرتے رہو، دن بھر وہاں کے حالات دیکھو اور باتیں سنو، اور رات کو غور کرو اور

---

[۱]۔ مثلاً طب یونانی، ایلو پیتھک، ہومیو پیتھک وغیرہ۔ [۲]۔ جب گرد وغبار ہٹے گا تو پتہ چلے گا کہ تم گھوڑے پر سوار ہو یا گدھے پر؟۔ [۳]۔ بے وقوفی۔

سوچو، اگر طلب صادق ہے تو حق واضح ہو جائے گا، اور صاف معلوم ہو جائے گا کہاں مصری ہے کہاں تنکے، کہیں تصنع اور بناوٹ ملے گی، کہیں جعلسازی اور فریب ہوگا، کہیں ''پیراں نمی پرند و مریداں می پرانند''[۱] کا ظہور ہوگا، مگر کہیں سچی اور کھری بات بھی ہوگی، اگر طلب میں خلوص ہے تو کھرے کھوٹے میں تمیز کر لینا کچھ مشکل نہ ہوگا، اس طریق سے کوشش کرو اور حق تعالیٰ سے دعا بھی کرتے رہو، صرف اپنی کوشش پر بھروسہ نہ کرو، ہدایت حق تعالیٰ کے کرم پر موقوف ہے۔

اور اس کے حاصل کرنے کا طریقہ عجز و نیاز ہی ہے، دعاء کا مغز یہی عجز و نیاز ہے کوئی اپنے علم و فہم و ذہانت سے ہدایت نہیں پاتا ہے، بڑے بڑے عقلاء گمراہ ہو چکے ہیں اور اب بھی موجود ہیں، ہدایت جس کو ہوئی ہے حق تعالیٰ کے فضل ہی سے ہوئی ہے، اس واسطے کوشش کے ساتھ عجز و نیاز و دعا کی بھی سخت ضرورت ہے، یہ طریقہ ہے حق کے حاصل کرنے کا اس سے ضرور حق مل جاتا ہے۔

مصروف لوگوں کی اصلاح کا طریقہ

یہاں تک الحمد للہ اکثر طبقات کی اصلاح کے طریقے بیان میں آ گئے، اب صرف ایک فرقہ وہ رہ گیا جن کو نہ علم ہے نہ فرصت نہ ہمت، اگرچہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا سے زیادہ ضروری دین ہے جس کو ہر مسلمان مانتا ہے، پھر کیا وجہ ہے کہ دنیا کے لئے علم بھی حاصل کر لیا جائے اور فرصت بھی نکال لی جائے اور ہمت بھی پیدا ہو جائے، اور دین کے لئے کچھ بھی نہ ہو سکے، مگر خیر میں کسی درجہ میں ان کے ان عذروں کو قبول ہی کئے لیتا ہوں، اور ان کے لئے بھی طریق اصلاحِ قلب کا بتاتا ہوں، وہ یہ ہے کہ کسی اہل علم[۲] سے ایک نصاب تجویز کرا لیا جائے، جس میں ضروریات دین ہوں، اور تمام اجزاء دین کا بیان ہو، عقائد کا بھی اور عبادات کا بھی اور معاملات کا بھی اور معاشرات کا بھی اور اخلاق کا بھی، مگر عام فہم اور سلیس ہو، علمی نکات اور دقیق باتیں اس میں نہ ہوں، پھر یہ ناخواندہ لوگ اس کو سنا کریں اور سننا بھی روزمرہ نہیں صرف ہفتہ میں ایک بار اس طرح کہ سب لوگ جمع ہو جایا کریں اور گھنٹہ آدھا گھنٹہ کوئی پڑھ کر سنا دیا کرے، اور سنانے کے لئے یا تو ایک آدمی مستقل رکھ لیا جائے جس کے لئے بڑی تنخواہ کی ضرورت نہیں، پانچ، سات روپیہ میں ایسا آدمی مل سکتا ہے جو معمولی اردو پڑھ سکے وہ کافی ہے۔

۱: کہیں مرید خود تو نہیں اڑاتے (یعنی بلند دعوے نہیں کرتے)۔ مگر ان کے مرید انہیں اڑاتے ہیں یعنی مبالغہ کر کر کے ان کی شہرت بڑھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ۲: عالم۔

آپ نے دیکھا ہوگا کہ کھاتے پیتے لوگ اپنے گھر طبیب کو نوکر رکھتے ہیں تاکہ کنبہ کے بچوں کچوں کی اور محلّہ کی بلکہ قصبہ کی صحت کی نگرانی رکھے، یہ جسمانی طبیب ہے، اسی طرح محلّہ میں یا قصبہ میں ایک روحانی طبیب بھی رہے جو اصلاح دین کرتا رہے تو کیا حرج ہے، بلکہ روحانی طبیب کی ضرورت تو جسمانی طبیب سے بھی زیادہ ہے جیسا کہ ظاہر ہے۔ اگر پانچ، سات روپیہ میں بھی نہیں جمع ہوسکتے اور مستقل آدمی اس کام کے لئے نہیں رکھ سکتے تو مسجد کے امام ہی کے ذمہ یہ خدمت کردو کہ ہفتہ میں ایک دن وہ تجویز کردہ کتابیں سنایا کریں اور تم سب لوگ بیٹھ کر سنا کرو اور وقت بھی اگر دن کا نہ ملے تو رات کو سہی بعد نماز عشاء فرصت کا وقت ہوتا ہے، ہفتہ میں ایک دن یہ وقت بجائے قصّے بجانے کے دین کے کام میں صرف کرو۔

ہاں اتنا اور کہتا ہوں کہ جو کتاب سنائی جائے اس میں ترغیب وترہیب بھی ہو یعنی نیک اعمال پر ثواب کا بیان اور گناہوں پر عذاب کا بیان ہو اس کا بڑا اثر ہوتا ہے، یہ وہ تدبیر ہے جس سے کوئی اُمّی آدمی ا بھی ناواقف نہیں رہ سکتا، ہاں یہ ضرور ہے کہ دین کا خیال ہو، دنیا کے لئے کیا کیا محنتیں اٹھائی جاتی ہیں دین کے لئے کچھ تو کرنا چاہئے، اس سے زیادہ کیا سہولت ہوسکتی ہے کہ ہفتہ میں ایک دن تھوڑا سا وقت نکال لیا جائے۔

عورتوں اور بچوں کی اصلاح کا طریقہ

رہیں عورتیں تو ان کے لئے اور بھی سہولت ہے، وہ یہ کہ جو باتیں مرد باہر سنیں وہ گھر میں جاکر عورتوں کو سنادیا کریں، نہ اس میں ڈولی کا خرچ ہے نہ کسی گھربار کے کام کا حرج ہے، گھر میں وہ باتیں سناتے وقت بچوں کو بھی بٹھالینا چاہئے، بچوں کے کان میں جو بات پڑتی ہے وہ پتھر کی لکیر ہو جاتی ہے، البتہ اس کے ساتھ ذراسی نگرانی کی بھی ضرورت ہے وہ یہ کہ اس کا خیال رکھا جائے کہ گھر والے جو کچھ سنتے ہیں اس پر عمل بھی کرتے ہیں یا نہیں، تو خود بھی عمل کرو اور گھر والوں سے بھی کراؤ۔

خلاصہ

یہ طریقے ہیں اصلاح کے، واللہ اگر مسلمان چاہیں اور ان کو دین کا خیال ہو تو دین اس سہولت سے حاصل ہوسکتا ہے کہ دنیا کا کوئی کام بھی اس سہولت سے پورا نہیں ہوسکتا، اس سہولت کا

ا:۔ ان پڑھ شخص۔

خلاصہ یہ ہے کہ مرد ہفتہ میں ایک دن جمع ہوکر دین کی کتابیں سنیں اور گھر جا کر عورتوں کو سنائیں، کوئی مسئلہ پیش آئے تو علماء سے پوچھ لیں اگر یہاں حل نہ ہو تو ڈاک کا راستہ کھلا ہوا ہے جہاں سے چاہیں ایک ہفتہ کے اندر جواب منگا سکتے ہیں، گھر بیٹھے مولوی بن سکتے ہیں، اور جبکہ کچھ کرنا ہی نہ چاہیں اور دین کی ضرورت ہی ذہن میں نہ ہو تو پھر دنیا میں اس کا کچھ علاج نہیں، اس کا علاج تو بس آنکھ بند ہونے کے بعد ہوگا۔

ہمت پیدا کرنے کا طریقہ

یہاں تک تو علم کے حصول کی تدبیریں بیان کی گئیں، دوسری چیز تھی ہمت، سو وہ فعل اختیاری ا ہے، اس میں اختیار کے صرف کرنے کی ضروت ہے کسی خاص تدبیر کی ضرورت نہیں، جیسے کھانا کھانا کہ سامنے کھانا رکھو، ارادہ کرو، ہاتھ سے لقمہ اٹھاؤ، منہ میں رکھو، دانتوں سے چباؤ، اور نگل جاؤ، پیٹ بھر جائے گا، اس میں کسی مستقل تدبیر کی کیا ضرورت؟ البتہ اگر قوت اختیاریہ کو ہی صرف نہ کرو تو کھانا اگرچہ سامنے رکھا رہے مگر پیٹ میں ہرگز نہ جائے گا اور نہ پیٹ بھرے گا، غرض ہمت کی روح صرف قصد ہے۲ جو تدبیر سے مستغنی ہے، مگر میں تبرعاً اس میں بھی سہولت کے طریقہ بتائے دیتا ہوں جس سے وہ سہولت اور مزید ہو جاوے۔

سو ایک طریقہ تو ہمت حاصل ہونے کا صحبت ہے یعنی کسی کے پاس رہنا یہ عجیب چیز ہے، کیسا ہی کم ہمت آدمی ہو، لیکن جس فن کے آدمی کے پاس بیٹھے اس سے اس فن کی رغبت اور اس سے مناسبت اور ہمت عادۃ پیدا ہو ہی جاتی ہے، اچھے آدمی کے پاس بیٹھے تو اچھی باتوں کی رغبت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے اور برے آدمی کے پاس بیٹھے تو برائیوں کی رغبت اور ہمت پیدا ہو جاتی ہے اگر آدمی عقلمندوں میں رہے تو عقلمندی آجاتی ہے بیوقوفوں میں رہے تو بیوقوف ہو جاتا ہے، عورتوں میں رہے تو زنانہ پن آجاتا ہے، سپاہیوں میں رہے تو مردانگی اور جرات پیدا ہوتی ہے، اپاہجوں میں رہے تو احدی پن۳ پیدا ہوتا ہے، غرض صحبت کا اثر ضرور ہوتا ہے، بس جس میں ہمت نہ ہو دین کے حاصل کرنے کی، اس کو چاہیے کہ دینداروں کی صحبت اختیار کرے اور کچھ دیر کو ان کے پاس جا بیٹھا کرے ہمت پیدا ہو جائے گی یہ تدبیر ہے ہمت پیدا ہونیکی۔

۱:۔اختیاری کام۔ ۲:۔ارادہ۔ ۳:۔سستی کاہلی۔

وظیفوں سے ہمت کیوں پیدا نہیں ہوتی؟

اب لوگوں نے یہ طریقہ اختیار کیا ہے کہ پوچھتے ہیں کہ کوئی ایسا وظیفہ بتادو جس سے نماز کی اور دین کی ہمت پیدا ہو جائے، صاحبو! ہر کام کا ایک طریقہ ہوتا ہے، ہمت پیدا کرنے کا طریقہ وظیفے پڑھنا نہیں ہے بلکہ اس کا طریقہ صحبت اختیار کرنا ہے، اس پر بعض لوگ کہہ دیتے ہیں کہ اللہ کے نام میں بڑا اثر ہے، کیا تم اللہ کے نام میں اثر ہونے کے قائل نہیں، پس وظیفوں سے کیوں ہمت پیدا نہ ہوگی؟۔

میں کہتا ہوں تم اللہ کے نام میں بے سمجھے بڑا اثر ہونے کا قائل ہو تو کھانا مت کھاؤ، کوئی وظیفہ پڑھ لیا کرو پیٹ بھر جایا کرے گا، بات یہ ہے کہ افعال اختیار یہ میں بلا قوت اختیار یہ صرف ۱؎ کئے کام نہیں ہوتا، اور قوت اختیار یہ صرف کرنے کا ارادہ پیدا ہونے میں آسانی ہونے کا موثر ذریعہ صحبت ہے، باقی ذکر اور وظیفے بھی اس میں معین ہو جاتے ہیں لیکن ہر چیز کا ایک درجہ ہوتا ہے۔

ذکر کا درجہ

ذکر کا صحبت کے ساتھ وہی ذرجہ ہے جو مدد کا مسہل کے ساتھ، بعض مرض کا علاج مادہ کے تنقیہ ۲؎ کرنے سے ہوتا ہے اس لئے مسہل دیا جاتا ہے مثلاً ''سنا'' یا ''املتاس'' وغیرہ پلایا جاتا ہے، لیکن اگر کبھی مسہل ۳؎ کا پوری طرح عمل نہیں ہوتا تو تکمیل عمل کے لئے مدد دیجاتی ہے، مثلاً عرق بادیان پلایا جاتا ہے، مسہل کو اور مدد کو دونوں کو تنقیہ مادہ میں من وجہ ۴؎ دخل ہے، لیکن ان دونوں میں اصل مسہل ہے اور مدد معین کے درجہ میں ہے، تو اگر کوئی مسہل تو پیئے لیکن اس کی مدد کے لئے عرق بادیان وغیرہ نہ پئے تو اس کا کام تو جیسے تیسے چل ہی جائے گا اور مادہ کا تنقیہ ہو جائے گا گو دیر میں ہو، لیکن اگر کوئی صرف مدد کی چیز یعنی بادیان وغیرہ تو پی لے اور ''املتاس'' یا ''سنا'' وغیرہ جو اصل مسہل ہے وہ نہ پئے تو پھر کچھ بھی کام نہ چلے گا، اسی طرح اصلاح کے لئے اصل چیز ہمت اور قصد ہے، اور ہمت پیدا ہونے کے لئے ذریعہ سہولت کا صحبت ہے اور اس کے ساتھ تھوڑا ذکر بھی بطور مدد ہو تو مفید ہے لیکن محض ذکر کافی نہیں۔

اس وقت ذکر کے متعلق عام غلطی شائع ہو رہی ہے، اور بعض مشائخ بھی اس غلطی میں مبتلا ہیں، اس میں افراط وتفریط ۵؎ ہو رہی ہے بعض تو ذکر کو بالکل بے سود سمجھتے ہیں اور طالبین کو صرف

۱؎:۔اختیاری کاموں میں ہمت اور محنت خرچ کئے بغیر۔ ۲؎:۔مادہ جسم سے نکالنا۔ ۳؎:۔پیٹ صاف کرنے کی دوا۔ ۴؎:۔ خراب مادہ نکالنے میں کچھ نہ کچھ اثر ہے۔ ۵؎:۔زیادتی اور کمی۔

مجاہدوں میں ڈال دیتے ہیں، اور ایسی ایسی محنتیں لیتے ہیں کہ صحت خراب ہو جاتی ہے، اور دماغ بے کار ہو جاتا ہے، حقوق ضائع ہوتے ہیں، پھر طالب پریشان ہو کر سب کام چھوڑ کر بیٹھ رہتا ہے، اور بعض لوگ ذکر ہی کو کافی سمجھتے ہیں اور وظیفہ وظیفہ بتائے جاتے ہیں، مدتیں گذر جاتی ہیں اور ان کو کچھ نفع نہیں ہوتا، بات وہی ہے کہ اصل چیز قصد و ہمت[۱] ہے، اور اس کا مؤثر ذریعہ صحبت ہے، اور ذکر معین[۲] ہے، اور لوگوں نے وظیفوں کو اس قدر بڑھا دیا ہے کہ جو آتا ہے وظیفے ہی پوچھنے آتا ہے، نہ نماز کی تصحیح[۳] کی ضرورت سمجھتے ہیں نہ زکوٰۃ کے مسائل معلوم کرنے کی، نہ اصلاح معاملات[۴] کی، اور معاملات کی، اور معاشرات کو تو آج کل دین سے خارج ہی مان لیا گیا ہے۔

جہالت کے وظیفے نقصان دہ ہیں

غرض شریعت کے علم وعمل کے لئے کسی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی بس بڑی دوڑ یہ ہے کہ وظیفے پڑھا کرو۔

ایک مہمان میرے یہاں تشریف لائے، ہاتھ میں ہر وقت تسبیح چلتی رہتی تھی، آپ نے جماعت کی نماز پڑھی، قعدہ اولیٰ کے بعد امام کھڑا ہوا تو وہ نہ اٹھے، سب کو تعجب ہوا، بعد سلام کے پوچھا یہ آپ نے کیا کیا، کہنے لگے میں مسافر ہوں قصر نماز پڑھی ہے، بہت افسوس ہوا ان کی جہالت پر میں نے کہا ارے ظالم! اس تسبیح کو تو طاق میں رکھ اور میرا بہشتی زیور ہاتھ میں لے اور اپنے ارکان اسلام کو درست کر اس کے بعد اٹھانا، یہ حالت ہو رہی ہے، اگر مشائخ کی تعریف کی جاتی ہے تو یہی کہ فلاں صاحب کسی سے بات تک بھی نہیں کرتے ہر وقت تسبیح ہی پڑھتے رہتے ہیں، اور جہاں یہ نہیں ہے بلکہ مہمانوں نے بات چیت کرنا ہے، طالب علموں کو پڑھانا ہے، گھر والوں سے ملنا چلنا ہے، اور ان کے دین کی نگرانی کرنا ہے تو ان کو کہا جاتا ہے کہ یہ تو دنیا دار ہیں، اللہ والے نہیں ہیں، اللہ والے کو غیر اللہ سے کیا علاقہ۔

کمال اتباع شریعت کا نام ہے

صاحبو! سب سے بڑے اللہ والے حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، حضور ﷺ کی سوانح اٹھا کر دیکھو، حضور کے مشاغل کیا تھے حضورؐ کی کتنی بیبیاں تھیں، کتنے مکان تھے، کتنے خادم تھے، کتنے سواری

---

[۱]: ارادہ اور ہمت۔ [۲]: مددگار۔ [۳]: نماز درست کرنے۔ [۴]: معاملات درست کرنے۔

کے جانور تھے، کیا حضور بس تسبیح لئے مسجد ہی میں بیٹھے رہتے تھے یا لوگوں سے ملتے جلتے، بات چیت بھی کرتے تھے، حضور تو مسلمانوں کے مکانوں پر بھی جاتے تھے، مریضوں کی عیادت کرتے، جنازوں کی نماز پڑھتے، دفن میں شرکت فرماتے تھے، کیا یہ سب کام دنیا داری کے ہیں؟ خیر یہ تو جہالت کی باتیں ہیں کہ ہر وقت تسبیح گھماتے رہنا ہی کمال ہے، ور بلا اس کے کمال ہوتا ہی نہیں، صاحبو! کمال ہوتا ہے اتباع شریعت سے، ہر حالت میں، بولنے چالنے میں، کھانے پینے میں، لینے میں دینے میں، ملنے جلنے میں، اور یہ سب باتیں جبھی حاصل ہوسکتی ہیں جب شریعت کا علم ہو، تو علم مقدم ہوا تسبیح گھمانے اور وظیفے گھونٹنے پر، اسی بناء پر میں نے ان مہمان صاحب سے کہا کہ یہ جو تسبیح ہر وقت تمہارے ہاتھ میں رہتی ہے، اس کی ضرورت نہیں، نماز درست کرو اس کے مسئلے پڑھو یا پوچھو۔

محقق کی صحبت کا خاص فائدہ

غرض آج کل بعض لوگ اس مذاق کے ہیں کہ ذکر اور وظیفوں ہی کو کافی سمجھتے ہیں، اور بعض اس مذاق کے ہیں کہ ذکر اور وظیفوں کو بیکار سمجھتے ہیں، یہ دونوں باتیں غلط ہیں، صحیح یہ ہے کہ اصل چیز علم اور ہمت ہے، اور ذکر اس کا معین ہے، اس نفع کے لئے ضرور کرنا چاہئے، ذکر سے قلب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے حدیث میں ہے انا جلیس من ذکرنی یعنی حق تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ''میں اس شخص کا ہمنشین ہوں جو میرا ذکر کرتا ہے''، اس سے زیادہ کیا فضیلت ہوسکتی ہے کہ ذکر سے حق تعالیٰ کے ساتھ ہمنشینی حاصل ہوتی ہے، اب شاید کوئی کہہ دے کہ جب ذکر سے صحبت مع اللہ حاصل ہوتی ہے تو اور کس چیز کی ضرورت رہی، پھر وہی بات لوٹ آئی کہ اصل چیز ذکر ہے، اور اللہ کی مصاحبت حاصل ہونے کے بعد اور کسی کی صحبت کی ضرورت کیا رہی۔

بات یہ ہے کہ ایک چیز بے قاعدہ ہوتی ہے اور ایک باقاعدہ، صرف ذکر سے صحبت مع اللہ[۱] ضرور حاصل ہوگی مگر بے قاعدہ، اور کسی محقق کی صحبت میں رہنے سے بھی مصاحبت مع اللہ[۲] حاصل ہوگی اور باقاعدہ، اور یہ وہ ذکر ہوگا، جس سے مصاحبت مع اللہ معنوں میں حاصل ہوگی۔

اس کی مثال سمجھو کہ ایک بادشاہ ہے اس سے قرب کا ہر شخص متمنی[۳] ہے اور اس کا قرب بہت سے منافع کو مشتمل ہوتا ہے، لیکن قرب دو طرح کا ہوتا ہے، ایک باقاعدہ اور بے قاعدہ، باقاعدہ تو وہ

۱:۔ د ۲:۔ تعلق مع اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت وعظمت کا تعلق۔ ۳:۔ اس کے قریب ہونے کی ہر شخص تمنا کرتا ہے۔

ہے جو ان لوگوں کو حاصل ہے جن سے بادشاہ راضی ہے، یہ تو مفید ہے، یہ قرب وہ ہے جس کے لئے قرب صوری کی بھی ضرورت نہیں، یہ اس شخص کو بھی حاصل ہے جو بادشاہ سے منزلوں دور رہتا ہے، مثلا ایک عامل[۱] ہے جو بادشاہ کی طرف سے کسی علاقہ پر مامور ہے اور خیر خواہ اور کارگذار ہے اور بادشاہ اس سے راضی ہے، اس کو گو قرب صوری حاصل نہیں مگر قرب معنوی حاصل[۲] ہے، دور بیٹھے ہی بادشاہ اس کو انعامات اور تمغے اور خطابات عطا کرتا ہے۔

اگر اس شخص کو قرب معنوی کے ساتھ قرب صوری بھی حاصل ہو جائے تو کیا کہنے ہیں، مثلاً بادشاہ اس کو دربار میں حاضری کی اجازت دے کسی تقریب میں بلائے تو کیا لطف ہوگا، سلامی دی جائے گی اور فوج سے استقبال کرایا جائے گا، اور کیا کیا ہوگا، یہ قرب تو باقاعدہ ہوا اور دور بیٹھے بھی حاصل ہے اور اس کے ساتھ قرب صوری بھی حاصل ہو جائے تو سونے پر سہاگہ کہنا چاہئے۔

رضا حاصل نہ ہونے کی صورتیں

اور ایک قرب بے قاعدہ ہے، وہ وہ ہے جس میں رضا بادشاہ کی حاصل نہیں، اور اس میں پھر دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ رضا تو حاصل نہیں مگر سخط یعنی غصہ بھی نہیں، اور ایک یہ کہ رضا ہونے کیساتھ غصہ اور عتاب بھی ہے، اول کی مثال وہ تماشائی ہیں جو مثلا بادشاہ کی سواری نکلنے کے وقت راستوں پر کھڑے ہو جاتے ہیں کہ وہ بھی بادشاہ سے قریب ہیں، مگر نہ ان پر بادشاہ کی کوئی عنایت ہے نہ ناراضی ہے، قرب ان کو بھی حاصل ہے مگر ایسا قرب ہے کہ نہ مفید ہے نہ مضر، اور دوسرے قرب کی مثال وہ قرب ہے جو ایک مجرم کو حاصل ہے، مشکیں بندھا ہوا بادشاہ کے سامنے کھڑا ہے کہ وہ بہت ہی قریب ہے اور عجب نہیں کہ سب سے زیادہ قرب اسی کو حاصل ہو، مگر یہ قرب کس کام کا جس کے ساتھ موت کو بھی قرب ہے، خدا بچائے ایسے قرب سے، یہ تینوں قسم کے قرب قرب ہی کے تو افراد ہیں، مگر مطلوب قرب وہی ہے جو اس عامل کو حاصل ہے اور درمیانی قرب بھی غنیمت ہے مگر اخیر کا قرب تو پناہ مانگنے کی چیز ہے۔

حقیقی قرب

خلاصہ یہ ہے کہ قرب جو رضا کے ساتھ ہو وہی حقیقی قرب ہے اور وہی مفید ہے، اور جو قرب

۱: گورنر۔ ۲: یعنی صورتا بہ ظاہر قریب نہیں مگر دل سے قریب ہے۔

ناراضی کے ساتھ ہو وہ حقیقت میں قرب ہی نہیں ہے بلکہ بعد ہے اور ڈرنیکی چیز ،تو اب سمجھ لیجئے کہ رضا الٰہی ۱ کا ہے سے حاصل ہوتی ہے ،صرف اعمال سے ، جب اعمال برے ہیں تو رضا حاصل نہیں ، پھر اگر قرب ہوا بھی تو وہ قرب باقاعدہ نہ ہوگا بلکہ بے قاعدہ ہوگا ،پس میں مانتا ہوں کہ ذکر سے مصاحبت مع اللہ حاصل ہوتی ہے ،لیکن جب اعمال درست نہیں تو یہ مصاحبت چنداں مفید نہیں ، کیونکہ اعمال درست نہ ہونے کی وجہ سے رضا حاصل نہیں اور بلا رضا کے قرب کا حاصل میں بتا چکا ہوں کہ وہ ہے جو مجرم کو بھی حاصل ہے ، ہاں اعمال درست ہوں اور اس کے ساتھ ذکر بھی ہو تو قلب میں نورانیت پیدا ہوتی ہے اور اس سے جو قرب ہوتا ہے ، وہ قرب حقیقی ہے اسی کو میں نے قرب باقاعدہ کہا ہے۔

اعمال کی اصلاح میں صحبت کے اثرات

اور اعمال کی درستی میں بڑا دخل ہے نیک صحبت کو۔اسی واسطے کہا ہے

ہر کہ خواہد ہم نشینی با خدا گو نشیند در حضور اولیاء ۲

اور کہا

صحبت نیکاں اگر یک ساعت است بہتر از صد سالہ زہد و طاعت است ۳

اور کہا

صحبت صالح ترا صالح کند صحبت طالح ترا طالح کند ۴

اس شعر میں ترغیب بھی ہے اور ترہیب ۵ بھی ، نیک صحبت کے اثر کا بیان بھی ہے اور بد صحبت ۶ کے اثر کا بھی ، اس کا بہت اہتمام رکھنا چاہیئے کہ صحبت اچھی ہے یا بری ، کیونکہ آج کل اچھوں کی صورت میں راہزن ۷ بہت ہیں ، جو خود بھی گمراہ ہیں اور یہ بھی خیال رکھنا چاہیئے کہ اگر کہیں بری صحبت میں غلطی سے جا پھنسے تو اس کو چھوڑ دینا چاہیئے مگر چھوڑنا چاہیئے ، لطافت ۸ کے ساتھ دل شکنی ۹ نہیں کرنی چاہیئے ، دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوا ہے کفار کو چھوڑنے کا مگر کس طرح واھجرھم ھجرا جمیلا ۹ یعنی ''ان کو چھوڑ دیجئے خوبی کے ساتھ''، یہ معاملہ کفار کے ساتھ ہے اس سے سبق لینا چاہیئے

۱:۔اللہ تعالیٰ کی رضا۔ ۲:۔ جو اللہ تعالیٰ کا قرب چاہتا ہے اسے کہو کہ وہ اولیاء کے پاس حاضر رہے۔ ۳:۔اللہ والوں کی صحبت ایک گھنٹہ بھی ہو تو وہ سو سال کی عبادت سے بہتر ہے۔ ۴:۔نیک کی صحبت تمہیں نیک بنا دے گی۔ اور برے کی صحبت تمہیں بدکار بنا دے گی۔ ۵:۔امید بھی دلائی گئی ہے مگر ڈرایا بھی گیا ہے۔ ۶:۔اچھی صحبت کے اثر کا بھی بیان ہے اور بری صحبت کے اثر کا بھی۔ ۷:۔ڈاکو۔ ۸:۔نرمی کے ساتھ۔ ۹:۔ بلا وجہ دل نہیں توڑنا چاہیئے۔ ۹:۔سورۃ المزمل ،۱۰

کہ مسلمان کو اگر چھوڑنا ہو تو کس طرح چھوڑنا چاہیے، بس نہایت نرم الفاظ میں عذر کردے کہ میں اب آپ سے تعلق نہیں رکھنا چاہتا اور اس کے ساتھ کسی قسم کی بے ادبی نہ کرے اور ایذاء[1] نہ دے یہ حق کہ ہے صحبت کا۔

صحبت کے ضروری ہونے کی دلیل

اور صحبت نیک کی تاثیر اور ضرورت کے متعلق ایک نکتہ سمجھنے کے قابل ہے، وہ یہ کہ ہمیشہ سے قانونِ قدرت اور عادتِ الٰہی یہی رہی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو بھیجا اور صحیفے اور کتابیں نازل فرمائیں جن سے گمراہوں کو ہدایت ہوئی اور حق و باطل میں امتیاز ہوگیا، حالانکہ ایک صورت یہ بھی تو ہوسکتی تھی کہ صرف صحیفے اور کتابیں اتار دی جاتیں، ان میں احکام ہوتے ان پر لوگ عمل کرتے اور ارشادات خداوندی کا امتثال[2] ہو جاتا، مگر ایسا کبھی نہیں ہوا، بلکہ صحیفے اور کتابیں اتارنے کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کو بھی مبعوث[3] فرمایا، اس میں کون سی بات بڑھ گئی، وہی ایک چیز بڑھ گئی جس کا نام صحبت ہے، اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ صحبت موقوف علیہ ہے اصلاح کے لئے۔ اسی معنی کو مولانا کہتے ہیں۔

بے عنایات حق و خاصان حق اندریں رہ کے توان بردن سبق[4]

توجہ کے متعلق ایک غلط فہمی

عنایت بمعنی توجہ و تعلیم ہے جو حاصل ہے صحبت کا، اس توجہ کے لفظ پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ توجہ کے متعلق کچھ ضروری بیان کیا جاوے اور یہ لفظ توجہ اہل طریق میں بہت مستعمل ہے اور اس کو آج کل بڑا کمال سمجھا جاتا ہے، کہتے ہیں فلاں ایسے بزرگ ہیں کہ ایک نظر جس پر ڈالدی وہ مسخر ہوگیا بلکہ ولی کامل ہوگیا، اور اکثر طالبین اسی توجہ کی درخواست کرتے ہیں کوئی کہتا ہے مجھ سے نماز پڑھی جاتی، ایسی توجہ ڈالئے کہ میں پکا نمازی ہو جاؤں، کوئی کہتا ہے مجھ سے بدنظری کا مرض نہیں چھوٹتا ایسی توجہ کیجئے کہ پھر میری نظر بے موقع اٹھ ہی نہ سکے، اور معلوم نہیں کیا کیا، اسی قسم کی درخواستیں ہوتی ہیں، حاصل ان سب کا یہ ہے کہ خود کچھ کرنا نہ پڑے، سب کرنا کرانا پیر صاحب ہی کے ذمہ ہے۔

صاحبو! کوئی یہ درخواست نہیں کرتا کہ ایسی توجہ کیجئے کہ بلا کھائے پیٹ بھر جایا کرے بلا نکاح

---

[1]۔ تکلیف نہ پہنچائے۔ [2]۔ ارشادات خداوندی کی اطاعت ہو جاتی۔ [3]۔ یعنی بھیجا۔ [4]۔ اللہ تعالیٰ اور اللہ والوں کی توجہ کے بغیر تم اس میدان میں کیسے آگے بڑھ سکتے ہو؟۔

اولاد ہو جایا کرے، جب پیر صاحب کی توجہ سے سب کچھ ہو سکتا ہے تو بلا کھائے پیٹ بھی بھر سکتا ہے اور بلا نکاح اولاد بھی ہو سکتی ہے پھر یہ درخواست کیوں نہیں کی جاتی، بات یہ ہے کہ پیٹ بھرنے کی اور اولاد کے ہونے کی ضرورت اور وقعت تو قلب میں ہے، لہذا ان کے لئے ہر ممکن کوشش کی جاتی ہے اور کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا جاتا، اور اصلاح قلب اور نماز روزہ وغیرہ اور اجتناب عن المعاصی[۱] کی ضرورت اور وقعت ہی قلب میں نہیں ہے لہذا یہ حیلے بہانے تراشے جاتے ہیں، اور اگر کسی نے ذرا سا سہارا دے دیا کہ ہاں دعا کریں گے یا توجہ کریں گے تو بس خوئے بدرا بہانہ بسیار[۲]، اس امید دلانے پر اطمینان ہو گیا اور فراغت ہو گئی کہ بس سب کچھ آپ سے آپ ہو رہے، صاحبو! اگر توجہ متعارف سے اصلاح ہو جایا کرتی تو انبیاء علیہم السلام سے زیادہ کون اس کام کو کر سکتا تھا، اور ان سے زیادہ کون شفیق[۳] ہو سکتا تھا مگر ان حضرات نے کبھی اس سے کام نہیں لیا مصیبتیں اٹھائیں جہاد کئے برے برے الفاظ سنے مگر یہ نہیں کیا کہ توجہ ڈال کر سب کے قلوب مسخر کر لیتے اور بس سب کا تزکیہ ہو جاتا، حالانکہ اس سے یہ فائدہ ہوتا کہ ان حضرات کو بھی سہولت ہوتی مصیبتیں نہ اٹھانی پڑتیں اور طالبین کو تو بہت ہی آسانی ہوتی کہ کچھ کرنا ہی نہ پڑتا۔

توجہ کی حقیقت

آپ غور کر سکتے ہیں کہ کوئی بات تو ہے جو ایسا نہیں کیا، اور وہ حضرات کیا کرتے، حق تعالیٰ ہی نے ان کے واسطے اس کو تجویز نہیں کیا، کیونکہ وہ اپنی طرف سے کچھ بھی نہیں کرتے تھے بس وہی کرتے تھے جو وحی کے ذریعہ سے ان کو امر[۴] کیا جاتا تھا، اب سمجھ میں آ گیا ہو گا کہ توجہ بالمعنی المتعارف[۵] غیر سنت ہے، اس لئے میں نے شعر مذکور (یعنی، بے عنایات حق و خاصان حق الخ) میں عنایت کی جو تفسیر توجہ و تعلیم کے ساتھ کی ہے اس توجہ کو معنی متعارف پر محمول نہ کیجئے گا بلکہ التفات[۶] اور دلسوزی کے معنی لیجئے، اور یہ التفات اور دلسوزی عادۃ جبھی ہوتی ہے جب کہ ان کے پاس رہا جائے اسی لئے میں نے اس کا حاصل صحبت کو بتلایا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں کوئی توجہ کے متعلق یہ شبہ نہ کرے کہ توجہ بالمعنی المتعارف کا مل تو بہت سے بزرگوں سے منقول ہے اور میں نے اس کو غیر سنت کہہ دیا، بات یہ ہے کہ توجہ بالمعنی المتعارف بزرگوں سے بیشک منقول ہے اور معمول رہا ہے مگر سنت تو نہیں، تو غیر سنت کا اتنا درجہ بڑھانا یعنی اسی کو کافی سمجھ لینا اور

---

[۱]:۔ گناہوں سے بچنے کی۔ [۲]:۔ بری طبیعت کے لئے تو تھوڑا سا بہانہ بھی کافی ہو جاتا ہے۔ [۳]:۔ شفقت والا۔ [۴]:۔ حکم۔ [۵]:۔ وہ توجہ جو لوگوں میں مشہور ہے۔ [۶]:۔ توجہ۔

اسی کو معیار کمال سمجھ لینا اور جس کو یہ حاصل نہ ہو اس کو ناقص سمجھ لینا یہ عظیم غلطی ہے نہ وہ کافی ہے، ورنہ انبیاء علیہم السلام اسی سے کام لیتے نہ وہ کمال ہے کیونکہ بے دینوں کو بھی حاصل ہے، بہت سے جوگی بھی اس کا ملکہ[1] رکھتے ہیں، پس وہ چیز مسلمان کے لئے کیا کمال ہو سکتی ہے جس کے لئے اسلام کا ہونا بھی شرط نہیں اور بزرگوں نے جو اس سے کام لیا ہے تو بطور تقویت کے لیا ہے اصل چیز تعلیم ہے، بعض دفعہ کسی کو کچھ تعلیم کیا جاتا ہے اور وہ محنت کرتا ہے مگر ضعف استعداد سے اس کو خاص نفع جو کسی مصلحت سے مطلوب ہے، نہیں ہوتا تو اس توجہ سے اس پر خاص اثر ڈالا جاتا ہے جس سے کامیابی ہونے لگتی ہے مگر وہ نفع خاص خود ہی مطلوب نہیں وہ بھی درجہ معین میں ہے۔

اس توجہ کی مثال روٹی کا چولھے میں سینکنا ہے کہ روٹی کی تکمیلِ تیاری میں اس کو بھی دخل ہے لیکن یہ دخل فی الجملہ[2] ہے نہ یہ کہ صرف سینکنا روٹی کی تیاری کے لئے کافی ہے، چنانچہ یہ کافی نہیں کہ کوئی کچے آٹے کو صرف سینک کر روٹی تیار کرلے، بلکہ آٹے کو گودھنا پڑے گا اور روٹی بڑھا کر گرم توے پر اس کو پکانا ہوگا پھر چولھے میں سینکنا ہوگا اس سے روٹی تیار ہوگی، اور وہ توے ہی پر سینک دی گئی تو پھر چولھے میں سینکنے کی ضرورت ہی نہیں، اسی طرح اصلاح تو ہوتی ہے علم و عمل سے مگر کبھی اس اصلاح میں قوت پیدا کرنے کے لئے ضرورت ہوتی ہے توجہ متعارف کی، اور اس وقت اس سے بھی کام لیا جاتا ہے ہر چیز کو اپنے مرتبہ پر رکھنا چاہئے، یہ حل ہے اس شبہ کا کہ بزرگوں سے توجہ متعارف منقول ہے، اب میں سابق کی طرف عود کرتا ہوں میں صحبت کی برکات کا بیان کر رہا تھا دلائل سے ثابت ہوگیا کہ صحبت اہل اللہ کی عجب چیز ہے، اس سے ہمت پیدا ہوتی ہے جو اصلاح میں خاص موثر ہے، یہاں ایک تفصیل تھی آیت کے ایک جزو ان فی ذلک لذکری لمن کان لہ قلب کی اب آیت کا دوسرا جزو رہ گیا یعنی او القی السمع وھو شھید جس کا ترجمہ یہ ہے کہ ''یا اس شخص کو نفع ہوگا قرآن سے جس نے قرآن کو سنا توجہ کے ساتھ کان لگا کر''۔

آیت میں تکرار کا شبہ اور اس کا جواب

اس تقابل پر بنظرِ ظاہر میں یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ کان لگا کر سننا یہ بھی ایک ذریعہ علم ہی کا ہے، تو معنی یہ ہوئے کہ جس کو علم ہو اس کو نفع ہوگا قرآن سے اور لمن کان لہ قلب میں بھی یہی مضمون تھا، جیسا آپ نے اس کا حاصل سنا کہ جس قلب میں علم و عزم ہو الخ تو اس دوسرے جملہ میں باعتبار علم

---

[1]۔ کمال۔ [2]۔ کسی درجہ میں۔

کے بلکہ ظاہراً تکرار ہوگیا، اس شبہ کا حل یہ ہے کہ معلومات دو قسم کی ہوتی ہیں، ایک وہ جو بِدوں سنے سمجھ میں آسکتی ہیں، اور ایک وہ جو بِدوں سنے سمجھ میں نہیں آسکتیں، اول کی مثال مسئلہ وجود صانع ہے کہ یہ سننے پر موقوف نہیں، دنیا میں کوئی بیوقوف سے بیوقوف بھی ایسا نہیں جو فعل کے لئے فاعل کی ضرورت نہ سمجھتا ہو، اور دوسری کی مثال مسئلہ معاد ہے اور کیفیت حشر ونشر و جنت و نار ہے کہ اس کا علم بلا سماع کے نہیں ہوسکتا، تو لمن کان لہ قلب متعلق ہے قسم اول کے۔ معنی یہ ہوئے کہ جس کا قلب سلیم ہو یعنی اس میں عقل سلیم سے استعداد صحیح بات کے سمجھنے کی ہو چنانچہ صاحب جلالین نے قلب کی تفسیر عقل سے کی ہے، اور القی السمع متعلق ہے قسم دوم کے۔ معنی یہ ہوئے کہ جو باتیں مدرک بالعقل نہیں جن کو سمعیات کہتے ہیں ان کے متعلق یہ عادت ہو اس شخص کی کہ غور سے سنے، خواہ مخواہ عناد نہ کرے، جیسے بعض کفار نے کہہ دیا تھا کہ قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا إلیہ وفی آذاننا وقر ومن بیننا وبینک حجاب، یعنی ''جس بات کی طرف آپ ہم کو بلاتے ہیں اس طرف سے ہمارے دل غلافوں کے اندر ہیں اور ہمارے کانوں میں ڈاٹ لگی ہوئی ہے اور ہمارے اور آپ کے درمیان ایک پردہ پڑا ہوا ہے''، مطلب یہ کہ تمہاری دعوت کو قبول کرنا تو کہاں ہم تمہاری بات سننا بھی نہیں چاہتے۔

یہ عناد ہے تو جس شخص میں یہ عناد نہ ہوگا بلکہ غور سے سنے گا قرآن کو، تو اس کو بھی نفع ہوگا اور قرآن جو باتیں سمعیات کی قسم سے بتائے گا وہ اس کی سمجھ میں آجائیں گی کیونکہ وہ باتیں سب حق ہیں، عناد سے ان پر پردہ پڑ جاتا ہے، جب عناد نہ ہوگا، تو ان کی واقعیت قلب میں بیٹھتی چلی جائے گی، تو حاصل یہ ہوا کہ جس میں ایسا قلب ہو کہ عقلیات میں صفت سلامت رکھتا ہو اور بات کو صحیح سمجھتا ہو (اور یہ حاصل ہے جزو اول کا) اور سمعیات میں قرآن کو کان لگا کر توجہ سے سنے عناد نہ کرے، تو اس کو نفع ہوگا قرآن سے۔ اب جملہ او القی السمع میں تکرار نہ رہا تقابل ہوگیا۔

ایک منطقی شبہ اور اس کا جواب

اب ایک شبہ اور رہا کہ اوپر جو قلب کی صفت بیان کی گئی اس میں کسی علم کی تخصیص نہیں تھی،

ا:۔ کسی درجہ میں۔ ۲:۔ پیدا کرنے والے کا موجود ہونا۔ ۳:۔ کام کے لئے کام کرنے والے۔ ۴:۔ میدان محشر میں اکٹھے ہونا اور جنت دوزخ۔ ۵:۔ بغیر سنے۔ ۶:۔ وہ باتیں جن کا سننے سے تعلق ہے۔ ۷:۔ زبردستی کی دشمنی۔ ۸:۔ سورۃ حٰم السجدۃ، ۵ ۹:۔ درست ہونا۔ ۱۰:۔ یعنی صاف ستھرا دل ہو۔ ۱۱:۔ یہ علمی منطقی شبہ ہے اس لئے اس کی تسہیل نہیں کی گئی کیونکہ یہ صرف علماء سے متعلق ہے۔ ۱۲م

اور تقابل کا مدار تخصیص ہے تو تعمیم میں پھر تقابل نہ رہا، جواب یہ ہے کہ تقابل بھی کافی ہے پھر یہ تقابل تضاد کا نہیں بلکہ مانعۃ الخلو ہے کیونکہ دونوں صفتیں ایک شخص میں جمع ہوسکتی ہیں، اور صحت حکم کے لئے ہر واحد کافی ہے (کما سیاتی) جو شان ہوتی ہے مانعۃ الخلو کی، چنانچہ شروع وعظ کے ذرا بعد دل گردہ کی مثال سے ذرا پہلے مانعۃ الخلو ہونے کی تصریح ہے (ثم رایت بعد سنین فی روح المعانی ما یقارب ھذا باختلاف العنوان مع الحکم بکونہ مانعۃ الخلو واللہ الحمد ولھذا التقابل وجوہ اخری محتملۃ) [1] اب ان متقابلین میں جوامر مشترک ہے اور وہ امر مشترک روح ہے شرائط کی وہ قلب سلیم ہے، کیونکہ عناد نہ ہونا بھی صفت قلب ہی کی ہے۔

صرف قلب سلیم کو فائدہ ہوگا

تو مدار آخر قلب ہی پر ٹھہرا تو یہ معنی ہوئے کہ جس شخص میں ایسا قلب ہو جس کو قلب کہا جاسکتا ہے کہ عقلیات کے متعلق بھی سلیم ہو اور سمعیات کے متعلق بھی سلیم ہو، اس کو نفع ہوگا قرآن سے اور چونکہ یہ سب آثار قلب سلیم کے لوازم سے ہیں تو بواسطہ ملزوم کے ان سب لوازم میں بھی تلازم ہوگا، تحقق ملزوم کے وقت تو تلازم عقلی اور صرف لازم کے تحقق کے وقت تلازم عرفی، اس لئے ہر واحد کے تحقق کو صحت حکم کے لئے کافی کہیں گے (یہ بیان ہے سیاتی کا جو ابھی گذرا) خلاصہ یہ کہ قرآن نصیحت ہے قلب سلیم کے لئے، تو قلب کو سلیم بنائیے پھر دیکھئے قرآن سے کیا کیا چیزیں حاصل ہوں گی، جب قلب سلیم ہوگا تو قرآن سے اس میں صفت علم بڑھے گی، اور اس میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہوگی، اسی کے بارہ میں کہا ہے

بینی اندر خود علوم انبیاء بے کتاب و بے معید و اوستا [2]

---

[1] حاشیہ از حضرت تھانویؒ:۔ ان وجوہ میں سے میں نے جس وجہ کو بیان القرآن میں اختیار کیا ہے، اتمام فائدہ کے لئے اس کو ملخصا یہاں نقل کر دینا مناسب اور مفید سمجھتا ہوں، ''اس میں اس شخص کے لئے بڑی عبرت ہے جس کے پاس (فہیم) دل ہو (یا اگر فہیم زیادہ نہ ہو تو کم از کم یہی ہو کہ) وہ (دل سے) متوجہ ہو کر (بات کی طرف) کان ہی لگا دیتا ہو (اور سن کر اجمالا حقانیت کا معتقد ہو کر اتباعا لاھل الفھم اس بات کو قبول کر لیتا ہو۔الخ)۔ توضیح مزید جدید و مفید:۔ پہلی شان محقق کی ہے اور دوسری مقلد کی یعنی تذکر کے لئے یہ شرط ہے کہ مخاطب محقق ہو یا مقلد۔ فقط۔

اشرف علی ۴ر جمادی الثانیہ ۱۳۶۰ھ۔

[2] ۔ اپنے اندر تم انبیاء علیہم السلام کے علوم محسوس کروگے بغیر کسی کتاب بغیر مددگار اور بغیر استاذ کے۔

یعنی وہ علوم پیدا ہوں گے کہ تمام علوم ان کے سامنے گرد نظر آئیں گے اور ہر چیز کی حقیقت منکشف ہوگی، وہ علوم ہونگے جن کو علوم کہنا صحیح ہے سفسطی[1] اور اوہام نہ ہوں گے دنیا کے عقلاء ان کے سامنے سر جھکائیں گے، اور اس علم کی برکت ہمت کی تزاید[2] کی بھی یہ کیفیت ہوگی کہ کسی کا خوف اس کے دل میں نہ رہے گا دنیا بھر ایک طرف اور وہ ایک طرف۔

موحد چہ در پائے ریزی زرش چہ شمشیر ہندی نہی بر سرش
امید و ہراسش نباشد زکس ہمیں است بنیاد توحید و بس[3]

نہ کسی کے خوف سے حق سے وہ منحرف نہ ہوگا نہ کسی لالچ سے وہ حق کو چھوڑے گا۔

سبق آموز حکایت

اور ہمت کی قوت کی وہ حالت ہوگی جو بہلول دانا ایک بزرگ سے نقل کرتے ہیں کہ انہوں نے ان بزرگوں کو دیکھا کہ بہت خوش خوش بیٹھے ہیں، پوچھا کہئے کیا حال ہے؟، کہا اس شخص سے زیادہ خوش کون ہوسکتا ہے کہ سارے جہاں میں کوئی کام اس کے ارادہ کے خلاف نہ ہوتا ہو، پوچھا یہ کیسے ہوسکتا ہے، کہا یہ تو مسلم[4] ہے کہ ہر کام حق تعالیٰ کے ارادہ سے ہوتا ہے، سو جس شخص نے اپنے ارادہ کو حق تعالیٰ کے ارادہ میں فنا کر دیا ہو تو ہر کام اس کے ارادہ کے موافق ہی ہوگا، تو یہ کہنا صحیح ہوا کہ کوئی کام اس شخص کے ارادہ کے خلاف نہیں ہوتا پھر ایسے شخص کے پاس غم کا کیا کام، اس کی حالت تو حق تعالیٰ کے ساتھ یہ ہوتی ہے۔

زندہ کنی عطائے تو ور بکشی فدائے تو
دل شدہ مبتلائے تو ہر چہ کنی رضائے تو[5]

اور اس کی حالت یہ ہوتی ہے

ناخوش تو خوش بود بر جان من دل فدائے یار دل رنجان من[6]

---

[1]: بے وقوفی۔ [2]: ہمت بھی زیادہ سے زیادہ ہوتی جائے گی۔ [3]: موحد کے پاؤں میں سونا بکھیر دو، یا تیز تلوار اس کے سر پر رکھ دو۔ اسے کسی سے نہ امید ہوگی نہ کسی کا خوف، اور بس یہی توحید کی بنیاد ہے۔ [4]: طے شدہ۔ [5]: زندہ کرے تو تیری عطاء، مار ڈالے تو ہم تجھ پر فدا۔ دل تو آپ کے ساتھ لگ گیا ہے۔ اب جو آپ کریں وہی درست۔ [6]: اے دشمن اب تیری ناراضگی میرے لئے خوشی کا باعث ہے کیونکہ میرا دل اب دوست پر فدا ہو چکا ہے۔

پھراس کے پاس غم اور پریشانی کا کیا کام۔

غم و پریشانی کب ہوتی ہے

غم اور پریشانی تو ہمیشہ مقصود کے فوت ہونے سے ہوتی ہے اور جس کا مقصود ہی وہ ہے جوحق تعالیٰ کا مقصود ہے تو اس کے مقصود فوت ہونے کا کوئی احتمال ہی نہیں، مثلاً ایک شخص نوکری چاہتا ہے، تعلیم حاصل کی، روپیہ خرچ کیا سفارشیں بہم پہنچائیں، مگر نوکری نہیں ملی، تو اس کو رنج ہوگا یہ رنج کیوں ہے؟ اس واسطے کہ مقصود فوت ہوگیا، اگر مقصود فوت نہ ہوتا اور نوکری مل جاتی تو رنج نہ ہوتا بلکہ خوشی ہوتی۔

اسی طرح کسی نے کیمیا بنانا چاہی، استادوں کے نخرے اٹھائے گھر بار چھوڑا، امیر سے فقیر ہوگئے تب ایک نسخہ ملا اور بہزار دقت[۱] اس کو مہیا کیا، اور چڑھایا، جب آنچ ختم ہوئی، اور اس کو اتارا تو وہاں کچھ بھی نہیں، ایک تاؤ کی کسر ہی رہی، ایسی صورت میں اس شخص کو کیا کچھ رنج ہوگا، یہ رنج کیوں ہے، اس واسطے کہ مقصود حاصل نہ ہوا، غرض رنج جبھی ہوتا ہے جب مقصود حاصل نہ ہو، اور جسکا مقصود ہر وقت حاصل ہی ہو اس کے پاس رنج کا کیا کام؟۔

جس کا مقصود اللہ ہو اسے کوئی غم نہیں

جس کا مقصود وہی ہے جو اللہ کا مقصود ہے وہاں فوت مقصود کا احتمال ہی نہیں بلکہ اس سے آگے جس کو خود اللہ ہی مقصود ہو تو اللہ کو تو نہ فنا ہے نہ تغیر ہے اس کو پریشانی اور رنج سے کیا واسطہ تندرست ہے، تب اس کا مقصود حاصل ہے، بیمار ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے، غنی ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے، فقیر ہے تب اس کا مقصود حاصل ہے، غرض اس کا مقصود ہاتھ سے جا ہی نہیں سکتا، پھر رنج وغم کیسا۔

سو ایسے قلب میں جو حالت ہمت کی ہوگی ظاہر ہے۔ یہ ہے قلب، جس کو قلب کہنا چاہئے، یہ قلب محل ہوتا ہے تجلیات لامتناہیہ کا اور مہبط ہوتا ہے انوار الٰہیہ[۲] کا اسی کی نسبت کہا گیا ہے۔

آئینہ سکندر جام جم است بنگر تا بر تو عرضہ دارد احوال ملک دارا[۳]

یہ قلب اس آئینہ کی طرح ہو جاتا ہے جو بہت صاف ہے، اور تمہارے سامنے رکھا ہوا ہے، اس میں وہ چیزیں صاف نظر آتی ہیں جو تمہاری نظر کے سامنے ہیں، بلکہ پس پشت[۴] ہیں، اس شعر میں

۱:۔ ہزار مشکلوں سے۔ ۲:۔ ایسے دل پر اللہ تعالیٰ کی تجلیات مسلسل برستی رہتی ہیں۔ اور انوار الٰہی ایسے دل پر اترتے رہتے ہیں۔ ۳:۔ تمہارے پاس سکندر کا آئینہ اور جمشید کا پیالہ ہے تاکہ دارا کی بادشاہت کے سب (جاری ہے)

سکندر اور دارا سے مراد وہ بادشاہ نہیں جن میں کسی وقت میں لڑائی ہوئی تھی جس کا ذکر سکندر نامہ میں ہے، بلکہ دو مخالف مراد ہیں، جن کو تشبیہاً سکندر اور دارا کہہ دیا ہے، اس وجہ سے کہ ان دونوں میں سخت مخالفت ہوئی تھی، سکندر تم ہو اور دارا وہ ہے جو سب کو دار پر لے جا رہا ہے، اور یہ وہ ذات شریف ہیں جن کو سب جانتے ہیں ان کا نام ابلیس، آپ میں اور ابلیس میں بھی غایت درجہ[۱] کی مخالفت ہے، جیسے سکندر اور دارا میں تھی، تو شعر مذکور کا مطلب یہ ہوا کہ تمہارے اندر ایک آئینہ سکندر یا جام جم موجود ہے، اس میں دیکھو اور غور کرو، اس میں ملک دارا یعنی ابلیس کے حالات نظر آئیں گے، یعنی ابلیس کے تلبیسات[۲] اور مکر وفریب کا انکشاف ہو جائے گا تو ان سے بچ سکو گے، یہ اسی قلب کی نسبت کہا ہے جس میں صفات قلب موجود اور قلب کہے جانے کے قابل ہو، جیسا کہ آپ نے طویل تقریر میں سنا۔

قلب سلیم بلا تکلف خیر وشر کو پہچان لیتا ہے

واقعی اگر قلب میں صفت سلامت پیدا ہو جائے تو ایسا دقیقہ رس ہو جاتا ہے کہ بے تکلف خیر و شر کا ادراک کر لیتا ہے، جیسے حسِ ذائقہ جو زبان میں ہے کہ منہ میں چیز رکھتے ہی فوراً بتاتا ہے کہ یہ نمکین ہے یا میٹھی، نہ سوچنے کی ضرورت ہے نہ مقدمات کی ترتیب، اور استدلال کی دنیا ایک طرف ہے اور حسِ ذائقہ ایک طرف، تو بات وہی صحیح ہوگی جو حس ذائقہ نے بتائی ہے، اسی طرح اہل دل کا دلِ حق باطل کو اول ہی وہلے میں پہچان لیتا ہے کہ یہ حق ہے اور یہ باطل، اور اتنا حق ہے اور اتنا اس میں باطل ملا ہوا ہے، ابھی استدلال کی بھی نوبت نہیں آئی کہ ان کے دل نے حکم لگا دیا، بعض اوقات اہل استدلال ان سے معارضہ[۳] کرتے ہیں، اور ممکن ہے کہ وہ اس وقت اس کا جواب بھی نہ دے سکیں مگر غور کرنے کے بعد خود معارض[۴] ہی کو دلیل بھی مل جائے گی، اور ان اہل استدلال کو ساکت ہونا پڑے گا، اور ثابت ہو جائے گا کہ ان کے دل کا حکم لگا دینا صحیح تھا۔

ایک بزرگ کا قصہ ہے کہ خلوت میں تھے اتفاقاً کفار اور مسلمانوں میں مقابلہ ہوا ان کو جوش اٹھا کہ چلو جہاد کے لئے، اس موقع پر کوئی غیر محقق ہوتا تو فوراً کھڑا ہو جاتا، اور سمجھتا کہ بڑا کام کیا، اور بڑی ہمت کی، کیونکہ جہاد جانبازی کا کام ہے، اس سے زیادہ ہمت کا کام کون سا ہوگا، مگر محقق کا کام یہ ہے کہ ہر کام کو سوچ کر کرے، اور غور کرے کہ یہ کام حق تعالیٰ کے حکم کے موافق ہے یا نہیں، چنانچہ

(بقیہ) احوال تمہارے سامنے رہیں۔ ۴: پیٹھ پیچھے۔

۱: انتہائی درجہ کی۔ ۲: دھوکے بازیاں۔ ۳: مقابلہ۔ ۴: مقابلہ کرنے والے۔

جہاد جیسے کام میں بھی انہوں نے جلدی نہیں کی کہ ایسا نہ ہو اس میں کوئی مخفی غائلہ ا؎ ہو، بہت سوچا لیکن اطمینان نہ ہوا، بس حق تعالیٰ سے دعا کی کہ اے اللہ مجھے اس کے بارہ میں شرح صدر عطا فرما دیجئے، فوراً سمجھ میں آیا کہ یہ خیال نفس کا ہے، رہا یہ کہ نفس نے ایسے عمل کی ہمت کیسے کی؟ جس میں سراسر تکلیف ہے حتی کہ جان کا اندیشہ ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ نفس کو ہر وقت ذکر شغل میں، مراقبہ میں قسم قسم کی ریاضت ۲؎ میں رکھتے تھے، یہ ہر وقت کی مصیبت تھی نفس نے کہا جہاد میں جائیں گے، ایک دفعہ قتل ہو جائیں گے، تھوڑی دیر کی تکلیف ہو کر ختم ہو جائے گی، ہر وقت کی مصیبت سے یہ اھون ۳؎ ہے، اس واسطے جہاد کی تلقین کی۔ جب یہ سمجھ گئے تو نفس سے کہا کہ جہاد فرض کفایہ ہے اور یہ فرض عین ہے ظاہر ہے کہ فرض عین زیادہ مؤکد ۴؎ ہے فرض کفایہ سے، لہذا میں اسی کو اختیار کرتا ہوں اور تجھے اسی میں رکھوں گا اور زیادہ رگڑوں گا۔

یہ فریب اور مکر ہیں شیطان کے، ان کا سمجھنا ہر شخص کا کام نہیں، ان کو وہی سمجھ سکتا ہے جس کے قلب میں پوری پوری صفت سلامت اور حق کے پہچاننے کا ایسا احساس پیدا ہو گیا ہو جیسے زبان میں قوت ذائقہ ہے کہ منہ میں رکھتی ہے حکم لگا دیتی ہے کہ یہ چیز کڑوی ہے اور یہ میٹھی، اگرچہ دلائل اور شواہد اس کے خلاف ہوں، مثلاً ایک شخص نے ہمارے سامنے قند پانی میں گھول کر شربت بنایا ظاہر ہے کہ یہ شربت میٹھا ہی ہوگا، لیکن جب زبان تک پہنچا تو تلخی پائی گئی، اب اس وقت دلائل وشواہد کا حکم تو یہ ہے کہ میٹھا ہونا چاہئے کیونکہ اس میں قند ہے اور پانی ہے، کڑوی کوئی چیز نہیں، اور وہ شخص بھی معتبر ہے اس نے کوئی اور چیز ملائی بھی نہیں ہے لیکن زبان جو کہ ماؤف نہیں ہے، اس کے خلاف حکم کرتی ہے اور اب فرمایئے کس کا حکم معتبر ہوگا؟ ظاہر ہے کہ زبان ہی کا حکم معتبر ہوگا، اور دلائل وشواہد میں غور کیا جائے گا کہ اس میں غلطی ہو گئی تھی، غرض دلائل وشواہد میں تاویل کی جائے گی یا ان کو غلط کہا جائے گا، لیکن زبان کے حکم کو غلط نہ کہا جائے گا، یہی حالت اصحاب قلب کے قلب کے حکم کی بھی ہوتی ہے کہ اول وھلے میں جو حکم انہوں نے لگا دیا گو اس وقت دلیل نہ بیان کر سکیں، بلکہ بادی النظر ۵؎ میں دلیل اس کے خلاف بھی موجود ہو لیکن حکم صحیح وہی ہوگا جو انہوں نے لگایا، اور تامل سے بعد میں دلیل بھی مل جائے گی، چنانچہ ان بزرگ کے دل میں کھٹکا پیدا ہوا اور جہاد جیسی چیز کو دل نے قبول نہیں کیا اور آخر میں اس میں نفس کا مکر ۶؎ ہی ثابت ہوا۔

ا؎: چھپا ہوا دھوکہ۔ ۲؎: محنتوں۔ ۳؎: یہ ہلکی صورت ہے۔ ۴؎: یعنی فرض عین کی تاکید فرض کفایہ سے زیادہ ہے۔

۵؎: بظاہر دیکھنے میں۔ ۶؎: چال

نفس شیطان سے بھی بڑا دشمن ہے

شیطان کے اور نفس کے عجیب عجیب مکر وفریب ہیں، اوران دونوں میں سے نفس کا مکر زیادہ بڑھا ہوا ہے کیونکہ شیطان اول تو چلتا پھرتا رہتا ہے، ممکن ہے کہ کسی وقت انسان کے پاس موجود نہ ہو، اوراس وقت انسان اس سے بچا رہے، لیکن نفس تو ہر وقت انسان کے اندر ہی موجود ہے یہ ہر وقت کا مار آستین ۱؎ ہے شیطان سے تو کسی وقت آدمی بچ بھی جائے لیکن اس سے بچنا بہت مشکل ہے اس لئے ہر وقت تیقظ ۲؎ کی اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے، اس نے بڑے بڑوں کو دھوکے دیئے ہیں، پھر خود شیطان ہی کو کس نے غارت کیا، اسی نفس نے جو کہ اس کا قرین ۳؎ ہے شیطان کو سجدہ کا حکم ہوا لیکن اس کے نفس نے سوجھایا کہ بڑی ذلت ہوگی تو آتشی ہے اور آدم خاکی ۴؎، آگ کو خاک پر شرف حاصل ہے آگ لطیف ہے اور خاک کثیف، آگ نورانی ہے اور خاک ظلماتی ۵؎، لہذا یہ قلب موضوع ۶؎ ہے کہ تو آدم کو سجدہ کرے، چنانچہ اس نے سجدہ نہیں کیا اور غارت ہوا، تو نفس وہ چیز ہے جس نے شیطان کو بھی غارت کیا، نفس شیطان سے بھی زیادہ چالاک ہے، شیطان کو بھی دھوکہ دے دیتا ہے، نفس کو وہ چالاکیاں آتی ہیں جن کا پتہ بھی نہیں چلتا، بڑے بڑوں کو اس نے ہلاک کیا ہے، پھر آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ایسا دشمن جو چالاک بھی ہو کیسا خطرناک ہوگا، اسی لئے محققین نے نفس کو زیادہ دشمن سمجھا ہے اور اسی سے ہوشیار رہنے کی زیادہ تاکید کی ہے مولانا فرماتے ہیں

؎ اے شہاں کشتیم ما خصم بروں ماند خصمے زوبتر دراندروں ۷؎

کشتن ایں کار عقل و ہوش نیست شیر باطن سخرہ خرگوش نیست ۸؎

نفس کے بڑے بڑے گھات ہیں، جن سے وہ انسان کو ہلاک کرتا ہے، بسا اوقات یہ معصیت ۹؎ پر ایسا رنگ چڑھاتا ہے کہ وہ طاعت ۱۰؎ معلوم ہونے لگتی ہے پھر کیسے کوئی اس کے مکر سے بچے، نفس کے مکروں پر تنبہ ۱۱؎ جبھی ہوسکتا ہے کہ قلب میں نورانیت ہو، اور ایسی صحیح حس حق و باطل کے پہچاننے کی پیدا ہوگئی ہو جیسے زبان میں ہے، کڑوا اور میٹھا مزا پہچاننے کا، جب قلب ایسا ہوجائے گا تو

۱؎:۔ دھوکا۔ ۲؎:۔ آستین کا سانپ۔ ۳؎:۔ بیدار اور خبردار رہنے کی ضرورت ہے۔ ۴؎:۔ ساتھی۔ ۵؎:۔ یہ تو آگ سے بنا ہے اور آدم مٹی سے۔ ۶؎:۔ یہ تو الٹ بات ہے۔ ۷؎:۔ باہر کے بڑے بڑے دشمنوں کو ہم نے مار ڈالا۔ مگر اندر کے اس دشمن نے ہمیں خراب کردیا۔ ۸؎:۔ اس کا مارنا عقل و ہوش کا کام نہیں کہ باطن کا شیر فرمانبردار خرگوش کی طرح نہیں ہے ۹؎:۔ گناہ۔ ۱۰؎:۔ نیکی۔ ۱۱؎:۔ نفس کے مکروفریب سے آدمی جبھی واقف ہوسکتا ہے۔

اس کو قرآن میں وہ چیزیں ملیں گی جو بیان میں نہیں آسکتیں، اب بیان ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ نورانیت قلب اور توفیق خیر عطا فرمائیں۔

بیان کا عنوان اور اس کی وجہ تسمیہ

میں اس بیان کا نام جلاء القلوب تجویز کرتا ہوں کیونکہ اس میں دل کی صفائی ہی کا بیان ہوا ہے، اور ایک لقب بھی تجویز کرتا ہوں 'جام جمشید''، کیونکہ ''جام جمشید'' کے متعلق مشہور ہے کہ اس میں دنیا کی خبروں کا انعکاس ہوا کرتا تھا، اس میں دل کی صفائی کا بیان ہوا ہے، اس سے دل ایسا ہو جائے گا کہ اس مین حق کا انعکاس ہونے لگے گا، اور اتفاقی بات ہے کہ ابھی ایک شعر زبان پر آیا تھا[۱] جس میں ''جام جم'' کا لفظ تھا، اس سے یہ لقب پیدا ہوا، نیز اس لقب میں حافظ صاحب (نواب جمشید علی خان صاحب میزبان و مالک مکان) کا نام بھی آ گیا۔

---

[۱]: وہ شعر یہ تھا۔

آئینہ سکندر جام جم است بنگر تا بر تو عرضہ دارا احوال ملک دارا

اختتامی سطور از مولانا حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری رحمۃ اللہ علیہ (خلیفہ حضرت تھانوی قدس سرّہٗ)

کاتبِ وعظ احقر محمد مصطفیٰ بجنوری مقیم میرٹھ محلہ کرم علی عرض کرتا ہے کہ اس سفر میں تین وعظ ہوئے سب سے پہلا یہ وعظ مسمّیٰ بہ ''جلاء القلوب ملقب بجام جمشید'' اور اس سے اگلے دن بمقام کاٹھہ متصل باغپت وعظ ''رجاء الغیوب ملقب بصبح امید'' اور اس سے اگلے دن بمقام میرٹھ وعظ ''دواء العیوب ملقب بہ شام خورشید''، تینوں کے نام مقفیٰ ہیں نیز القاب بھی اور تینوں کی وجہ تسمیہ نہایت معقول ہے، ''جلاء القلوب'' کی وجہ تسمیہ اور لقب کی مناسبت تو ابھی بیان ہوئی، اور کاٹھہ میں وعظ مستورات کے مجمع میں تحتِ آیت ان الذین یتلون کتاب اللہ و اقاموا الصلوٰۃ و انفقوا مما رزقناھم سرا و علانیۃ یرجون تجارۃ لن تبور ہوا تھا جس میں رجا کا مضمون غالب تھا، اور خود آیت ہی میں ''یرجون'' کا لفظ موجود ہے نیز آیت میں جو وعدے ہیں وہ آخرت کے ہیں، جو عالم غیب ہے اس واسطے ''رجاء الغیوب'' کیا ہی برمحل نام ہوا، نیز وعظ کا وقت صبح کا تھا، اس وجہ سے ''صبح امید'' کیا ہی چسپاں لقب رہا اور میرٹھ میں وعظ تحت آیت وجاء کم النذیر ہوا جس کا خلاصہ یہ تھا کہ نذیر کی تفسیر بعض علماء نے بڑھاپے سے کی ہے، لہٰذا بوڑھوں کو زیادہ ضرورت اپنی اصلاح کی ہے، اور اس میں امراض اور ان کے علاج مذکور ہوئے، لہٰذا ''دواء العیوب'' اسم با مسمّیٰ ہوا، اور اتفاق سے یہ وعظ شام کے وقت ہوا تھا، جس وقت آفتاب کا غروب قریب تھا اور بوڑھاپا عمر کی شام ہے، لہٰذا ''شام خورشید'' لقب نہایت مناسب رہا، اور اس میں ایک لطیفہ یہ بھی ہوا جس کی طرف حضرت والا کو بھی خیال نہیں تھا کہ جب لقب ''شام خورشید'' تجویز ہوا تو احقر نے عرض کیا کہ خورشید علی خان، نواب جمشید علی خان صاحب کے والد ماجد مرحوم کا نام تھا، تو اس سلسلہ میں دونوں نام آگئے، تو حضرت والا نے مسرت ظاہر فرمائی، چونکہ یہ سفر بفرمائش نواب صاحب موصوف ہوا تھا اس واسطے بقاعدہ للاکثر حکم الکل تین وعظوں میں سے دو میں اس خاندان کے نام آجانا گویا کل میں آجانا ہے، یہ بھی لطف سے خالی نہیں۔

معذرت

بعد ختم وعظ ''شام خورشید'' حضرت والا نے یہ بھی فرمایا تھا کہ کاش یہ تینوں وعظ ایک ساتھ ہی چھپیں، لیکن بعض موانع قویہ کی وجہ سے یہ نہ ہو سکا، وہ دونوں وعظ یعنی ''صبح امید'' اور ''شام خورشید'' تیار ہو کر عرصہ ہوا شائع ہو چکے، اور یہ وعظ مسمّیٰ بہ ''جام جمشید'' سب سے آخر میں تیار ہوا، افسوس ہے کہ حضرت والا کی خواہش پوری نہ ہو سکی، تاہم یہ ہو سکتا ہے کہ اہل مطابع تینوں وعظوں کو

اب یکجا کردیں[1]، فالحمد لله الذی بعزته وجلاله تتم الصالحات، ناظرین سب سے پہلے حضرت واعظ صاحب مدظلہ کی درازی عمر وصحت وقوت و بقاء فیوض کے لئے دعا کریں، اس کے بعد کاتبین وعظ کے لئے اور سب سے آخر میں احقر کے لئے اور احقر کے والدین کے لئے دعا کریں۔

ربنا اغفر لنا ولإخواننا الذی سبقونا بالإیمان ولاتجعل فی قلوبنا غلا للذین امنوا ربنا إنک رؤف الرحیم، ربنا تقبل منا إنک انت السمیع العلیم.

---

[1]: الحمدللہ کہ اب تقریبا پینسٹھ سال بعد یہ تینوں وعظ ادارہ اسلامیات سے بحمدللہ یکجا شائع ہو رہے ہیں مخدومنا و مشفقنا حضرت نواب عشرت علی خان قیصر صاحب مدظلہم العالی کی برکت اور توجہ اور خواہش کے مطابق ان تینوں مواعظ کی یکجا اشاعت کی صورت پہلی بار عمل میں آئی اور احقر محمود اشرف غفراللہ لہ کو بھی اس خدمت میں اپنا حصہ لگانے کی سعادت نصیب ہوئی ہے، اللہ تعالیٰ حضرت تھانوی قدس سرہ، حضرت حکیم مصطفیٰ رحمۃ اللہ علیہ اور جملہ خدمت کنندگان کو اپنی بارگاہ سے جزائے خیر عطا فرمائیں اور حضرت نواب صاحب مدظلہم کا سایۂ شفقت تادیر سلامت بہ عافیت رکھیں۔ آمین۔

احقر محمود اشرف غفراللہ لہ۔ یکم ربیع الاول ۱۴۲۴ھ۔

باغپت ضلع میرٹھ میں کئے گئے تین اہم مواعظ میں سے ایک اہم وعظ

رَجاءُ الغیُوب

المعروف بہ

صبحِ اُمید

از حکیم الأمت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

ناشر

ادارہ اسلامیات کراچی ۔ لاہور

این	متی	کم	کیف	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنا ہوا	کس طرح ہوا	کیا مضمون	کس نے لکھا	سامعین کی تعداد	متفرقات
کاٹھہ ضلع میرٹھ مکان زنانہ شیخ محمد حسن صاحب	۳؍ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ وقت صبح	دو گھنٹہ ۳۵ منٹ	کرسی پر بیٹھ کر	امید کے صحیح معنی	حکیم محمد مصطفیٰ صاحب بجنوری مقیم میرٹھ محلہ کرم علی	مرد تخمینا ۴۰۔ باقی مستورات	×

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبۂ ماثورہ۔ امابعد۔ فقد قال اللّٰہ تعالیٰ:۔ ان الذین یتلون کتاب اللّٰہ واقاموا الصلوۃ وانفقوا مما رزقنھم سراً وعلانیۃ یرجون تجارۃ لن تبور لیوفیھم اجورھم ویزیدھم من فضلہ انہ غفور شکور۔[۱]

مضمون آیت کی اہمیت

اس آیت میں حق تعالیٰ جل شانہ وعم نوالہ[۲] نے بندوں کی ایک بڑی غلطی کو بیان فرمایا ہے اس میں ابتلاء عام ہے۔ عوام تو کیا، پڑھے لکھے بھی اس میں مبتلاء ہیں یہ بھی حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ اس وقت یہی آیت ذہن میں آئی۔ اس میں نہایت ضروری مضمون ہے یوں تو دینی مضامین سب ہی ضروری ہیں لیکن ضرورت، ضرورت میں فرق ہوتا ہے۔ بعض مضامین ایسے ہوتے ہیں جنکی طرف سے ذہول[۳] ہے ان کے یاددلانے کی خاص ضرورت ہوتی ہے لیکن ان سے بھی زیادہ ضروری وہ مضامین ہیں جن میں غلطی بھی واقع ہو چنانچہ یہ مضمون اسی قبیل[۴] سے ہے۔ اس واسطے بہت زیادہ ضروری ہوا۔

میں پہلے اس غلطی کو بیان کرونگا اسکے بعد طریقِ تصحیح کی تعیین کرونگا، پھر اس طریق کی تحصیل[۵] کا طریقہ بتاؤں گا اور سب اجمالاً اس آیت کے ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائے گا۔ حاصل ترجمہ کا یہ ہے کہ جو لوگ کتاب اللہ پڑھتے ہیں اور نماز درست رکھتے ہیں اور مال کو ظاہر و پوشیدہ خرچ کرتے ہیں ان کو ایک تجارت کی امید ہے جو کبھی خسارہ نہ دے گی۔ تجارت سے مراد ظاہر ہے کہ تجارت آخرت ہے آگے اس کے نتیجہ کا بیان ہے کہ حق تعالیٰ انکو ان کے اجر پورے پورے دیں گے بلکہ اپنی طرف

---

[۱] ترجمہ: جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے ہیں اور نماز کی پابندی رکھتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے پوشیدہ اور علانیہ خرچ کرتے ہیں وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ماندنہ ہوگی تاکہ ان کو ان کے اجر تیں پوری دیں اور ان کو اپنے فضل سے اور زیادہ دیں۔ بیشک اللہ بڑا بخشنے والا، بڑا قدر دان ہے (سورۃ الفاطر، ۳۰) [۲] جنکی شان اونچی اور جن کے احسانات سب پر عام ہیں [۳] غفلت [۴] قسم [۵] حاصل کرنے کا

سے اور زیادہ دیں گے کیونکہ حق تعالی غفور اور شکور ہیں۔

لیوفیھم میں لام عاقبت ہے جیسے مشہور مثال ہے'' سرق لیقطع ''یعنی فلاں نے چوری کی تا کہ ہاتھ کاٹا جائے۔ یہ معنی نہیں کہ اس غرض سے چوری کی بلکہ لام عاقبت ہے یعنی چوری کا انجام قطع ہے اسی طرح اجور کا پورا پورا ملنا اور نفع زائد ہونا، یہ انجام ہے اس تجارت کا خواہ اس تجارت میں اس انجام کا قصد بھی نہ ہو البتہ خود تجارت کا قصد ضرور شرط ہے خواہ من حیث التجارۃ نہ ہو من حیث العمل ہی ہو۔ یہ حاصل ترجمہ ہے اس آیت کا اسکو سن کر معلوم ہو گیا ہو گا کہ اللہ تعالی نے اس میں ایک تجارت کی امید کا طریقہ بتلایا ہے یعنی تجارتِ آخرت کے نفع کی امید کا طریقہ بتلایا ہے کہ کب امید رکھنا چاہیے۔

آخرت کی کامیابی کی امید کب رکھنی چاہئے

آیت سے صاف نکلتا ہے اس امید کا مستحق وہ شخص ہے جو کہ ان اعمال مذکورہ کو ادا کرے کہ تلاوت کتاب اللہ کرے یعنی کتاب اللہ پڑھے۔ پڑھنا صرف الفاظ کے ادا کرنے کو نہیں کہتے بلکہ معنی یہ ہیں کہ الفاظ ادا کرنے کے ساتھ کتاب اللہ کا علم بھی حاصل کرے جیسے محاورات میں کہتے ہیں کہ ہم نے قانون پڑھا ہے اسکے معنی یہ کوئی نہیں سمجھتا کہ قانون کے الفاظ زبان سے ادا کئے ہیں بلکہ مطلب یہ ہوتا ہے کہ ہم نے قانون کا علم حاصل کیا ہے اسی طرح قرآن بھی چونکہ قانونی کتاب ہے اور قانون بھی قانونِ الٰہی تو اس کے پڑھنے کا بھی یہی مطلب ہے کہ اس کا علم حاصل کیا جائے محض الفاظ کا ادا کرنا مراد نہیں مگر اسکا یہ مطلب نہیں کہ قرآن کے الفاظ کا ادا کرنا موجبِ ثواب نہیں گو عقل کا یہی فتوی تھا کہ تلاوت قرآن پر بدوں علم وفہم[۱] کے ثواب نہ ہوتا کیونکہ قانونی کتاب کے الفاظ یاد کر لینا عرفاً وعقلاً مقصود نہیں بلکہ اسکا سمجھنا اور اسکے موافق عمل کرنا مقصود ہوتا ہے مگر حق تعالی نے اپنی کتاب میں اس فتوی عقلی کے خلاف محض تلاوت الفاظ پر بھی ثواب رکھا ہے اور یہ انکی رحمت وعنایت ہے مگر بقرینۂ سیاق وسباق[۲] یہاں صرف تلاوت مراد نہیں بلکہ علم کتاب مراد ہے۔

قرینہ[۳] یہ ہے کہ یہاں تلاوت کے ساتھ اعمال کا بھی ذکر ہے اور عمل کا ترتب علم ہی پر ہوتا ہے پس معلوم ہوا کہ یہاں تلاوت سے مراد علم کتاب ہے جیسا ابھی مذکور ہوا کہ علم، عمل ہی پر مرتب ہوا کرتا ہے محض تلاوت پر مرتب نہیں ہوتا چنانچہ آگے عمل ہی کا ذکر ہے یعنی ''اور نماز کی پابندی کرے''

---

[۱] سمجھ [۲] آگے پیچھے کی علامت سے [۳] علامت

مراد جملہ عبادات جسمانی ہیں جن میں نماز زیادہ مہتم بالشان ہے تخصیص ذکر بوجہ اہتمام کے ہے، حصر مراد نہیں ا۔ ''اور مال خرچ کرے'' اس میں جملہ عبادات مالیہ آگئیں اور جن لوگوں نے اسکی تفسیر زکوۃ سے کی ہے ان کی مراد زکوۃ کا مہتم بالشان ہونا جیسا کہ اوپر ذکر صلوۃ کا منشأ بھی مہتم بالشان ہونا ہے۔ ایسے شخص کو امید رکھنی چاہئیے ایک تجارت کی جو کبھی خسارہ نہیں دے گی اور اسپر پورا پورا اجر ملے گا مع انعام کے۔ ترجمہ سے آیت کا ماحصل سمجھ آگیا ہوگا اور تھوڑے غور سے اس غلطی کا بھی علم ہو گیا ہوگا جس میں آجکل عام ابتلاء ہے۔

امید کے معنی میں ایک غلطی

حاصل اس غلطی کا یہ ہے کہ آپ نے عام طور سے ہر شخص کی زبانی یہ کلمہ سنا ہوگا اور یہ بات فی نفسہ صحیح بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے امید رکھنا چاہئے یہ امر عقائد میں داخل ہے اور امید نہ رکھنے والا کافر ہے مگر اسکو سمجھنے میں مسلمانوں نے اتنی بڑی غلطی کر رکھی ہے کہ اس کے نتیجہ کو دیکھ کر میں تو یہ کہوں گا کہ مسلمانوں کا بیڑا ہو گیا ہے۔ اس مضمون کا غلط مطلب ذہن میں آنے سے ایک دلیری ہو گئی کہ مسلمانوں کو نہ فسق ۲ کی پرواہ رہی، نہ رشوت سے احتراز رہا، نہ ظلم سے باک ۳ رہا۔ اول تو ان اعمال پر تنبہ ۴ ہی نہیں، لوگ یہی نہیں سمجھتے ہیں کہ ہم کوئی برا کام کر رہے ہیں اور اگر تنبہ بھی ہوا تو کچھ پرواہ ہی نہیں۔ سب کام کرتے ہیں اور جو کبھی گناہ کا خیال آگیا یا کسی خیر خواہ نے ٹوک دیا تو جواب میں کہہ دیتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ غفور، رحیم ہیں۔ میں ان سے یہ پوچھتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ کا غفور رحیم ہونا تم کو کہاں سے معلوم ہوا یقیناً یہی کہا جائے گا کہ قرآن سے۔ میں کہوں گا کہ جس آیتِ قرآن سے اللہ تعالیٰ کا غفور رحیم ہونا ثابت ہے اسمیں کوئی قید بھی ہے یا نہیں کہ کس کے واسطے غفور، رحیم ہیں اگر اس میں عموم کلی ہے تو بس کفار بھی سہل چھوٹے، وہ بھی کفر وغیرہ جو چاہیں کریں کیونکہ اللہ تعالیٰ غفور رحیم ہے۔ مسلمان اسکے جواب میں ضرور یہی کہے گا کہ کفار کیلئے غفور، رحیم نہیں۔ دیکھئے اتنی قید تو لگی یہ قید بھی قرآن ہی سے لگی میں کہتا ہوں اور بھی قیدیں ہیں مطلق گنہگاروں کیلئے یہ بشارت درجہ مزعومہ ۵ میں نہیں ورنہ اعمال کی تو اساس ہی منہدم ۶ ہو جائے۔

امید کے صحیح طریق کی عقلی دلیل

نیز کوئی موقع مجھے دکھلایا بھی تو جائے جہاں مؤمنین کیلئے بلا کسی قید کے اسکا حکم ہے، اسکے

ا نماز کو خاص طور سے ذکر کیا گیا کیونکہ نماز اہم عبادت ہے مگر صرف نماز مراد نہیں بلکہ ساری جسمانی عبادات مراد ہیں ۲ گناہ ۳ ڈر ۴ کی طرف توجہ ۵ اس درجہ کی نہیں جس درجہ کی لوگ سمجھتے ہیں ۶ بنیاد ہی ختم ہو جائے

طول[1] کا موقع نہیں، سب لوگ قرآن شریف پڑھتے ہیں۔ جس آیت میں یہ لفظ غفور، رحیم پاویں اسکے سیاق، سباق کو پورا دیکھیں اگر معنی نہ سمجھتے ہوں تو ترجمہ کو دیکھیں انکو کچھ قیود ضرور ملیں گی۔ میں یہ بھی کہتا ہوں کہ یہ غلطی صرف شرعی نہیں بلکہ عقلی بھی ہے۔ قرآن کی قیود سے قطع نظر بھی کر لی جائے تو ذرا سے تأمل وغور[2] سے عقلاً یہ غلطی رفع ہو سکتی ہے۔

چنانچہ دیکھئے سب جانتے ہیں کہ ملازمت سے پہلے امیدواری کی ضرورت ہے اور یہ بھی معلوم ہے کہ امیدواری میں کیا ہوتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ امید کا اعتقاد جما کر بیٹھ جائیں بلکہ امیدواری کا کام کرتے ہیں اور اتنا ہی وقت صرف کرتے ہیں جتنا ملازم صرف کرتا ہے اور نخرے اس سے زیادہ اٹھانے پڑتے ہیں۔ اسکا عرصہ بعد نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ملازمت ملتی ہے۔ پھر اس ملازمت پر اجر ملنا متوقع ہوتا ہے گویا امیدواری ملنے کیلئے بھی کچھ خدمت کی ضرورت ہے جسکا حاصل یہ ہے کہ امیدوار بننے کیلئے کچھ قواعد کی ضرورت اور کوشش درکار ہے۔ نری امید جسکو تمنا کہتے ہیں کسی شمار میں نہیں۔ اگر کوئی اس تمنا میں رہے کہ گورنمنٹ مجھ کو ایک عہدہ دیدے اور باضابطہ امیدواری یا کوشش نہ کرے تو خود سمجھ لیجئے کہ یہ خیال کہاں تک صحیح ہے۔

افسوس ہے کہ انسانی گورنمنٹ سے امید رکھنے کیلئے تو کچھ قواعد اور شرائط اور پابندیوں کی اور جان کاہی کی ضرورت ہو جسکا نہ حق اتنا عظیم ہے، نہ اس سے اتنا عظیم اجر ملے گا اور احکم الحاکمین سے امید رکھنے کیلئے کسی قاعدہ اور شرط کی ضرورت نہ ہو اور نہ کسی قسم کی جان کاہی[3] اور محنت کی قید ہو جسکا حق بھی عظیم اور اس سے اجر بھی عظیم ملے گا اس بات میں ایسی بے حسی بلکہ فسادِ حس ہوا ہے کہ جب کسی سے کہا جائے کہ امیدوار بننے کیلئے بھی کچھ قواعد ہیں اور کچھ محنت کی ضرورت ہے تو کہتے ہیں واہ صاحب! جب محنت کر کے کچھ حاصل ہوا تو بخشش کیا ہوئی مگر افسوس ہے کہ دنیا کے کاموں میں امیدواری کے یہ معنی کسی نے بھی نہ سمجھے۔ دیکھئے ہم امیدواروں سے پوچھتے ہیں کہ آجکل آپ کس شغل میں ہیں تو وہ بہت قدرشناسی کے ساتھ کہتے ہیں میں امیدوار ہو گیا ہوں فلاں فلاں صاحب نے بڑی مہربانی اور کوشش کی اور مجھ کو امیدواروں میں داخل کر دیا اگر چہ یہ امیدواری بہت ہی معمولی ہو اور اسکے بعد کوئی ڈپٹی کلکٹری نہ ہی ملے مگر پھر بھی ان کوشش کرنیوالوں کے اور گورنمنٹ کے بڑے ممنون ہوتے ہیں کہتے ہیں بڑی مہربان گورنمنٹ ہے سب کی سن لیتی ہے حالانکہ ابھی ہزاروں نخرے اٹھائیں گے کام سیکھیں گے بہت سی ذمہ داریاں مول لیں گے ان سب کے بعد اگر ملازمت پر پہنچ گئے تو خیر ورنہ کوئی غلطی ہو گئی یا عمر زیادہ ہو گئی یا اور کوئی مانع پیش آ گیا تو چلئے رخصت، ایک بندے کی ملازمت

---

[1] لمبی بات [2] غور وفکر [3] جان مارنے

کی امید میں اتنے بکھیڑے کرنے پڑتے ہیں مگر اللہ میاں ایسے سستے ہیں کہ ان سے امید لگانے کیلئے کسی قاعدہ کی ضرورت نہیں۔

جس درجہ کا مقصود ہو ویسی ہی کوشش ہونی چاہئے

عجیب بات ہے عقل تو کہتی ہے کہ جس درجہ کا مقصود ہو ویسی ہی کوشش ہونی چاہئے۔ نائب تحصیل داری کیلئے جس کوشش کی ضرورت ہے، صدر اعلیٰ ہونے کیلئے اسی نسبت سے زیادہ کوشش کی ضرورت ہے۔ مزدور دو آنہ کمانا چاہے تو چار پیسہ سے دو چند محنت کرنا پڑے گی معلوم ہوا کہ عمل کی کمی زیادتی، مقصود کی کمی زیادتی کے اندازہ پر ہوا کرتی ہے کوئی ٹھیکہ لیتا ہے تو کام زیادہ اور جلد ہونے کی غرض سے وقت مقرر سے زیادہ خارج وقت میں بھی کام کرتا ہے اسکی بھی بنا۱ وہی ہے کہ جتنا اجر زیادہ چاہئے کام بھی زیادہ کرنا چاہیئے۔ اب دنیاوی اجر اور اخروی اجر کو ملا کر دیکھئے جو فرق دونوں میں ہو وہی دونوں کی کوشش میں ہونا چاہئے۔

سو دونوں میں ظاہر ہے کہ مقدار کا بھی فرق ہے اور باقی اور فانی ہونے کا بھی فرق ہے جسکے لحاظ سے دونوں میں کوئی نسبت ہی نہیں ہوسکتی پھر دونوں کی طلب میں بھی یہی نسبت ہونی چاہئے بس اس قیاس پر عقل کا مقتضا۲ تو یہ ہے کہ امید آخرت کیلئے عمر بھر کی سعی۳ بھی کافی نہ ہو مگر کیا کیجئے کہ نفس کی تعلیم کے ساتھ ہم نے عقلیات کی بحث کرنا ہی چھوڑ دی البتہ سارے سبقوں میں ایک امید کا سبق یاد کرلیا۔

ایک ڈپٹی اور درویش کی حکایت

ایک ڈپٹی کلکٹر نے ایک درویش سے کہا کہ وصول الی اللہ کا کوئی سہل طریقہ بتا دیجئے۔ درویش نے دوسری باتوں میں لگا لیا کہ گھر میں خیریت ہے، بال بچے اچھے ہیں، آجکل آپ کی کیا تنخواہ ہے، کیسے گزرتی ہے، مقدمات کی کیا حالت ہے؟ غرض ادھر ادھر کی باتوں میں انکو لگا کر اور بات ٹال کر پوچھا کہ کیوں ڈپٹی صاحب اول آپ کی کتنی تنخواہ ہوئی تھی اور اس تنخواہ سے پہلے کیا کیا کوشش کی تھی پھر کیونکر ترقی ہوئی اور اب آپ کا کیا درجہ ہے؟ ڈپٹی صاحب نے بڑی رغبت اور شوق سے سارا کچا چٹھا کہہ سنایا اور اپنی کارگزاریاں ظاہر کیں اور کہا سب سے پہلے کم درجہ کی تنخواہ ہوئی تھی اور درجہ سوئم کے اختیارات تھے پھر فلاں فلاں کوششوں سے تنخواہ میں ترقی ہوئی اختیارات میں بھی اضافہ ہوا فلاں فلاں کارگزاری سے بہت نیک نامی ہوئی اور درجہ اول کے اختیارات حاصل ہوئے

---

۱ بنیاد ۲ تقاضا ۳ کوشش

اب پچپن سال میں یہ پنشن ہوئی ہے درویش نے کہا قاعدہ یہ ہے کہ ادنی سے ترقی کر کے اعلی کی طلب ہوتی ہے اب آپ کو خدا طلبی کا جو خیال ہوا تو اسی وجہ سے ہوا ہوگا کہ خدا طلبی کو ڈپٹی کلکٹری سے اعلی سمجھا ہے۔ ڈپٹی صاحب نے کہا جی ہاں خدا طلبی سے اعلی اور کیا چیز ہوسکتی ہے۔ درویش نے کہا کہ ڈپٹی صاحب آپ ڈپٹی کلکٹری پر تو جسکو آپ خدا طلبی سے ادنی تسلیم کرتے ہیں اتنی طویل مدت میں پہنچے، حیا نہیں آئی کہ خدا طلبی میں سہولت اور عجلت ڈھونڈتے ہیں دیکھئے کیسا اچھا جواب ہے اور واقعی اور سچی تحقیق ہے ہمارے حاجی صاحب کا مصرع ہے ع

متاع جان جاناں، جان دینے پر بھی سستی ہے

واقعی غور کر کے دیکھیں تو اس مصرع میں مبالغہ ذرا بھی نہیں ہے کیا خدا تعالی کی قیمت جان ہو سکتی ہے؟ جان ہے کیا چیز مگر بات یہ ہے کہ خدا تعالی کی طرف سے کچھ نخرے نہیں کیے جاتے ہیں اور ادنی سے طالب کی سعی بھی ضائع نہیں فرماتے بلکہ یوں کہیے کہ بلا سعی مل جاتے ہیں اس واسطے ہمکو قدر نہیں رہی جیسے آفتاب کی روشنی کہ دن بھر ہمارے اوپر خود بخود پڑتی رہتی ہے۔ ہمیں اس کی خوشامدیں نہیں کرنا پڑتیں اس واسطے ہم کو اس کی ذرا بھی قدر نہیں بلکہ بعض دفعہ اس سے بھاگتے ہیں۔ آفتاب کی قدر جب معلوم ہوتی کہ دنیا میں اندھیرا ہوتا پھر ایک دفعہ آفتاب بطور تماشہ کے نکال دیا جاتا تو یہ حالت ہوتی کہ دنیا کی نظریں اسی طرف رہتیں اور لوگ اسکے عاشق ہو جاتے۔

اب بھی دیکھ لیجئے اگر ہفتہ بھر ابر رہتا ہے تو لوگ سورج کے دیکھنے کو ترس جاتے ہیں اور تمنائیں کرتے ہیں اور ذرا سا بھی کھل گیا کہتے ہیں شکر ہے آج کرن تو دیکھ پڑی اسی طرح حق تعالی نے اپنے انوار اور عطایا کو ایسا عام کیا ہے کہ لوگوں کو اس کی قدر نہیں رہی۔

اے گراں جان خوار دیدستی مرا زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا[1]

حق تعالی کی نعمتوں کی قدر اس وقت ہوتی ہے جبکہ ایک ذرا سی نعمت کو روک دیں۔ یہی ابر ہے کہ برستا ہے اور لوگ اس سے بھاگتے ہیں اور جب ابر کو روک دیتے ہیں تو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنا پڑتا ہے اور ایک قطرہ پانی کا کہیں سے بھی نہیں آسکتا جب کہ خدا تعالی کی ایسی نعمتیں بے بہا اور بے بدل ہیں اور یہ نعمتیں وہ ہیں جو دنیوی کہلاتی ہیں جنکو فرمایا متاع الدنیا قلیل[2] سو جو نعمتیں حق تعالی کی اعلی درجہ کی ہیں اور اس سے میری مراد بہشتی نعمتیں ہیں بلکہ وہ نعمتیں مراد ہیں جو دنیا ہی میں موجود ہیں اور بہشت تو ان کی ایک صورت ہے جو ایک خاص وقت میں ظاہر ہو جائے گی وہ نعمت

---

[1]: اے سستی کے مارے تو نے مجھے ہلکا سمجھا ہے جبھی تو نے مجھے بہت سستا خرید لیا ہے [2] ترجمہ: دنیا کا تمتع چند روزہ ہے (سورۃ النساء، ۷۷)

معرفت حق اور قرب حق اور رضائے حق ۱؎ ہے جس کو خود فرمایا ہے ورضوان من اللہ اکبر ۲؎ جسکے واسطے مختصر لفظ وصول الی اللہ یا خدا شناسی ۳؎ ہے سو یہ نعمت جبکہ دنیا و مافیہا ۴؎ سے بھی بڑھ کر ہے تو جتنی محنت کہ تمام دنیا کی طلب میں ہو اس سے زیادہ اس کیلئے ہونی چاہئے۔ اور ڈپٹی کلکٹری تو بیچاری دنیا کی ایک ذراسی فرد ہے اس کیلئے اتنی محنتیں اور امید واریاں کی گئیں تو خدا طلبی کیلئے کتنی چاہیں ذرا تو انصاف چاہئے جسطرح ڈپٹی کلکٹری کی امید واری کی گئی تھی اسطرح یہاں کیوں نہیں ہوتی۔ میری تقریر سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ڈپٹی کلکٹری کی طلب بلکہ دنیا کی طلب اور خدا تعالی کی طلب میں تو کوئی نسبت اور کوئی توازن ہی نہیں اسکو اسکے ساتھ ذکر کرنا ہی بیجا سا ہے۔

مقتضائے عقل ۵؎ تو یہ تھا کہ اس تفاوت ۶؎ کے ہوتے ہوئے خدارسی ۷؎ امید واروں سے کبھی بھی حاصل نہ ہو سکے مگر خیر حق تعالی نے اپنی رسائی ۸؎ کو ایسا آسان کر دیا کہ ہم حق تعالی کی رسائی کو اور دنیا کی حصول کو کسی درجہ میں قیاس تو کر سکتے ہیں اور یہ کہہ سکتے ہیں کہ جیسے یہاں امید واری کی ضرورت ہے ویسے وہاں بھی ضرورت ہے گو دونوں امید واروں میں مشاکلت صوری ۹؎ ہی ہے مگر اتنا تو سمجھ آ گیا کہ کچھ کرنے کی ضرورت ہے باقی کام بنانا حق تعالی کی طرف سے ہے لیکن کم سے کم وہ صورت تو امید واری کی ہونا چاہیے جو دنیا کی طلب کیلئے ہے یہاں اس صورت کو کیوں بدل دیا مگر دنیا کے معاملہ میں تو یہ صورت سب کو یاد ہے اور حق تعالی کے معاملہ میں صرف یہ یاد رہ گیا کہ امید رکھنا چاہئے۔

طفیلی شاعر کی حکایت

کسی نے طفیلی شاعر سے پوچھا جسکو کھانے کا بہت شوق تھا کہ احکام قرآن میں سے تمہیں سب سے زیادہ کیا حکم پسند ہے؟ اور دعاؤں میں کونسی دعا؟ کہا مجھے احکام میں تو کلوا واشربوا ۱۰؎ پسند ہے اور دعاؤں میں سے ربنا انزل علینا مائدۃ من السماء ۱۱؎ یہی حالت ہماری ہے کہ تمام تعلیماتِ قرآن میں سے امید کی تعلیم پسند آ گئی مگر اس اختراع ۱۲؎ سے ہمارے کیا ہوتا ہے اس سے

۱؎ اللہ تعالی کی معرفت یعنی پہچان، اللہ تعالی کا قرب اور اسکی رضا ۲؎ ترجمہ: اور اللہ کی رضامندی سب سے بڑی چیز ہے (سورۃ التوبۃ، ۷۲) ۳؎ اللہ تعالی تک پہنچنا اور خدا تعالی کو پہچاننا ہے ۴؎ دنیا اور دنیا کی سب چیزیں ۵؎ عقل کا تقاضا ۶؎ فرق ۷؎ خدا تک پہنچنا ۸؎ اپنے تک پہنچنے کو ۹؎ ظاہری طور پر ایک جیسی ۱۰؎ کھاؤ اور پیو (سورۃ الاعراف) ۱۱؎ اے ہمارے پروردگار! ہم پر آسمان سے کھانا نازل فرمائیے (سورۃ المائدۃ، ۱۱۴) ۱۲؎ من گھڑت بات

احکام الٰہی کی حقیقت تو نہیں بدل سکتی جب حقائق منکشف ہوں گے تو معلوم ہوگا کہ کن غلطیوں میں عمر گزر گئی جس وقت ایک گناہ پر بھی جواب طلب کیا جائے گا کہ یہ کیوں کیا تو یہ جواب کہ آپ سے رحمت کی امید تھی کسی چھوٹے سے گناہ کیلئے بھی کافی نہ ہوگا۔

صاحبو! کیا ضرورت ہے کہ اس ناکافی جواب کی نوبت آوے دارالاعمال ہی میں اس غلطی کو کیوں نہ رفع کر لیجئے یہ تو لفظ امید کے استعمال میں غلطی کا بیان ہوا۔

بعض دیندار حضرات کی ایک غلطی

ایک غلطی میں وہ لوگ بھی مبتلاء ہیں جو امید کے موقع کو جانتے ہیں اعمال صالحہ کرتے ہیں اور معاصی سے بھی بچتے ہیں مطلب یہ کہ طلب کے صحیح طریق پر پڑے ہوئے ہیں لیکن اس غلطی میں وہ بھی مبتلاء ہیں کہ طلب خدا کے زمانہ کا اندازہ کرنے میں دنیا کی طلب پر بھی تو اس کو قیاس نہیں کر لیتے یعنی یہ نہیں سوچتے کہ مقصود دنیا کے حصول میں کتنا زمانہ صرف ہوتا ہے تو مقصود دینی جو اس سے بدرجہا اعزا ہے اس کے حصول کیلئے تو اس سے زیادہ زمانہ اگر صرف ہو تو خوشی سے صرف کرنا چاہئے دیکھئے آدمی دنیوی تعلیم میں محنت کرتا ہے اور برسوں جان مارنے کے بعد کسی امتحان میں پاس ہو جاتا ہے اور اب نوکری کی طلب کے قابل ہوتا ہے امیدواری کرتا ہے اور کبھی کامیاب ہو جاتا ہے۔

میں پوچھتا ہوں پاس ہونے سے کے دن بعد نوکری مل جاتی ہے دیکھا ہوگا کہ برسیں لگتی ہیں یہ کسی کو نہیں دیکھا کہ پاس ہوتے ہی اگلے دن نوکری مل جائے اگر کسی محکمہ میں ایسا ہے بھی تو وہ نوکری درحقیقت امیدواری ہی ہوتی ہے جو قابل شمار نہیں اسکو جو تنخواہ ملتی ہے وہ بطور وظیفہ کے ہے نوکری قابل شمار جب ہی سمجھی جاتی ہے جب کام سیکھ لے پھر کیا کسی کو آپ نے ایسا بھی دیکھا ہے کہ پاس ہونے کے بعد چار دن میں اگر نوکری نہ مل گئی ہو تو شکایت کرتا پھرتا ہو بلکہ پاس ہونے کے بعد صرف امیدواری کیلئے بھی ایک معتد بہ[۲] وقت سوچ لیا جاتا ہے کہ اتنے عرصہ میں اگر نوکری مل جائے تو کچھ شکایت کا موقع نہیں اس سے پہلے ملنا تو خرق عادت[۳] سمجھا جاتا ہے اور اس سے تاخیر البتہ اکثر ہو جاتی ہے لیکن بددلی پھر بھی نہیں ہوتی اور حاکم سے خفا ہو کر پھر بھی نہیں رہتے۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ حق تعالیٰ کی طلب میں اس برتاؤ کا عشر عشیر بھی کہیں ہے۔

---

۱ عزت والا ۲ اچھا خاصہ ۳ عام عادت کے برخلاف

لوگ کہتے ہیں کہ شیخ کامل نہیں ملتا

بہتیرے[1] تو ایسے بھی ہیں کہ طلب بھی نہیں کرتے بلکہ یہ شکایت ان کی زبان پر ہے کہ ہم طالب خدا کہیں مگر کوئی رہبر شیخ کامل ہم کو نہیں ملتا حالانکہ کبھی شیخ کی تلاش میں گھر سے باہر بھی نہیں نکلے اتنا بھی نہیں کیا کہ جیسے اسکول میں جا کر جگہ کی تحقیق کر کے بھرتی ہوا کرتے ہیں کسی شیخ کی خبر سن کر بطور امتحان ہی اس کے پاس گئے ہوتے معلوم نہیں اس کا کیا مطلب ہے کہ کوئی شیخ کامل نہیں ملتا کیا شیخ ان کے دروازے پر آ کر ان کو گھسیٹ کر لے جائیں اول تو ایسا ہو نہیں سکتا اور اگر کوئی شیخ بالفرض ایسا کرے تو ان ہی کا اعتراض پہلے یہ ہوگا کہ یہ کامل کہاں سے آیا کامل ہوتے تو گھر بیٹھتے نہ پچتے۔ تماشا ہے کہ شیخ کی تلاش میں گھر سے نہ نکلیں اور اگر شیخ گھر پر آوے تو وہ شیخ نہیں اس کا کیا مطلب ہے سوائے اس کے کہ شیخ کی ضرورت نہیں۔

صاحبو! یہ یاد رکھئے کہ ایک معمولی کیمیا گر بھی جس کو چار پیسہ کی کیمیا آتی ہو کسی کے در پر نہیں جاتا بلکہ اچھے اچھے اس کے پاس جاتے ہیں اور وہ منہ بھی نہیں لگاتا شیخ تو بڑی چیز ہے وہ تمہیں گھر بیٹھے بدوں تلاش کئے اور خاک چھانے کیونکر مل جائے گا کیمیا گر کا منتہائے کمال یہ ہے کہ سونا چاندی بنادے یا بنانا بتادے اور سونا چاندی کیا چیز ہے وہی مٹی کے اجزاء ہیں جو تھوڑے دن میں مٹی میں مل جائیں گے جب اس کے استغناء کی یہ حالت ہے تو اس کے استغناء کی تو کیا حالت ہوگی جو خدا تک پہنچاتا ہے اور ناچیز کو چیز اور نجس کو طاہر[2] اور ظلمانی کو نورانی اور فانی کو باقی بناتا ہے ع

چہ نسبت خاک را با عالم پاک[3]

وہ تو دنیا بھر کے خود کیمیا گروں کو بھی منہ نہیں لگائے گا اس سے کوئی صاحب یہ نہ سمجھیں کہ وہ متکبر ہوتا ہے خوب سمجھ لیجئے کہ اس کو تکبر کی ہوا بھی نہیں لگی ہوتی کیونکہ وہ شیخ ہوا کیسے ہے؟ عبودیت[4] حاصل کرنے اور تکبر کو مٹانے ہی سے تو ہوا ہے اسکا تو پہلا قدم یہی ہے کہ اپنے آپ کو خاک سے بھی کمتر سمجھتا ہے مگر بات یہ ہے کہ تکبر اور چیز ہے اور استغناء اور چیز، استغناء کے معنی ہیں غیر اللہ کی طرف اپنی حاجت نہ لے جانا اور تکبر کے معنی ہیں اپنے آپ کو بڑا سمجھنا۔ کامل اپنے آپ کو بھنگی چمار سے کبھی بڑا نہیں سمجھتا لیکن اپنی حاجت کو کسی بڑے سے بڑے بادشاہ کے پاس بھی نہیں لے جاتا کیونکہ ان کی نظر میں ایک کے سوا کوئی بڑا نہیں اسکی نظر میں صرف ایک ذات حق تعالیٰ ہے اور وہ

---

[1] بہت سے لوگ [2] ناپاک کو پاک [3] مٹی کو جہان پاک سے کیا نسبت [4] بندگی

اسکو کافی ہے آپ نے کہیں دیکھا ہے کہ بادشاہ کا مقرب غلام کسی گداگر اور محتاج کے سامنے اپنی حاجت لیجاتا ہو اسکو تو بادشاہ سے ایسی خصوصیت حاصل ہے جو اس کے تمام مہمات[۱] کیلئے کافی ہے بادشاہ کے سوا تمام مخلوق اسکی نظر میں گداگر اور محتاج ہے تو جس شخص کو حق تعالی سے خصوصیت حاصل ہو اسکی نظر میں سلاطین دنیا[۲] حاجت روا کیونکر ہو سکتے ہیں۔

مصنوعی شیوخ کی ڈانٹ ڈپٹ کا انداز

جب تکبر اور استغناء میں فرق ظاہر ہو گیا تو اس دھوکہ کا راز بھی کھل گیا جو آجکل کے متصنع[۳] شیوخ نے پھیلا رکھا ہے کہ ہر شخص کو ڈانٹ ڈپٹ کرتے ہیں اور کسی سے سیدھے منہ بات بھی نہیں کرتے بلکہ گالیاں دیتے ہیں اور جتنی دوردبک[۴] کرتے ہیں اتنا ہی لوگ ان کو کامل سمجھتے ہیں یہ عجیب چلتی ہوئی ترکیب ہے۔ تعجب یہ ہے کہ آجکل کے نئے تعلیم یافتہ بھی اس چال میں آجاتے ہیں۔ اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو بخوبی واضح ہو جائے گا کہ وہ استغناء کی محض نقل ہے اور واقع میں تکبر ہے لیکن اثر اس میں اس وجہ سے ہے کہ ایک واقعی مؤثر چیز کی نقل ہے جیسے پولیس کے سے کپڑے پہن کر کہیں چھاپا جا ماریں تو ان کو دیکھ لوگ مرعوب ہو ہی جائیں گے اس صورت میں افسوس تعلیم یافتوں پر زیادہ ہوگا اگر وہ صرف انکی وردی کو دیکھ کر ان کو واقعی پولیس سمجھ لیں اور اتنی بات بھی نہ دیکھیں کہ ان کا چھاپا مارنا یہ فعل ہی بتلا رہا ہے کہ یہ پولیس کے آدمی نہیں ہیں۔ کیونکہ پولیس کا کام تو چھاپہ مارنے سے حفاظت ہے نہ کہ الٹا چھاپا مارنا ایسے ہی یہ موٹی بات ہے کہ شیخ کا کام تو تہذیب، اخلاق اور تربیت ہے جب وہ خود ہی بیجا ڈانٹ ڈپٹ کرتا ہے تو دوسروں پر اس کا کیا اثر ہوگا سوائے اس کے کہ وہ بھی یہی سیکھیں گے یہ تو بعینہ ڈاکہ ڈالنا ہے۔ ظاہری ڈاکو، مال کے ڈاکو ہوتے ہیں اور شیوخ، ایمان اور قلب کے ڈاکو ہیں۔ شیخ خود بندہ ہوتا ہے اور دوسروں کو بندہ بنانے والا ہوتا ہے پس اس میں تمیز کرنا کچھ مشکل نہیں کہ وہ شیخ واقعی شیخ ہے یا متصنع۔

مصنوعی شیخ اور واقعی شیخ کو پہچاننے کا طریقہ

بس یہ دیکھ لو کہ اس کے پاس رہنے سے عبودیت حاصل ہوتی ہے یا نہیں یا خود اس کے خفیہ حالات میں عبودیت غالب ہے یا نہیں۔ بنائی ہوئی بات چھپ نہیں سکتی، یہ نہیں ہوسکتا کہ کوئی بنظر غور دیکھے اور تصنع ظاہر نہ ہو جائے غرض بڑی شکایت اس بات کی ہے کہ کبھی اس تلاش کیلئے بھی گھر سے

---

[۱] اہم باتوں [۲] دنیا کے بادشاہ [۳] مصنوعی پیر۔۔۔ [۴] دور کرتے اور دھمکاتے ہیں

قدم نہیں نکالا نہ کچھ وقت صرف کیا اور نہ کچھ مال ہی صرف کیا میں کہتا ہوں کہ آجکل تو اس قدر سہولتیں ہیں کہ اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئی ہوں گی۔ سفر بہت آسان ہے وقت بھی تھوڑا لگتا ہے دام بھی تھوڑے خرچ ہوتے ہیں لوگوں میں ہم نے یہ خبط تو دیکھا ہے کہ ذرا سی جڑی بوٹی کی تحقیق کیلئے بڑے بڑے سفر کرتے ہیں اور اس کو بڑا فخر سمجھتے ہیں اور نہ کرنے والوں کو کہتے ہیں کہ ان کی طبیعت میں جمود ہے تحقیقات کا مادہ ہی نہیں اسی وجہ سے ترقی نہیں ہوتی بعضوں کو یہاں تک بھی دیکھا کہ جب ملازمت سے چھٹی اور تعطیل ہوتی ہے تو تبدیل آب و ہوا اور تفریح طبع کیلئے شملہ یا منصوری یا نینی تال جاتے ہیں اور اس میں بڑی رقم خرچ کرتے ہیں تو فضول کا تو اہتمام اور ضروری دین کا اس سے عشر عشیر بھی نہیں۔

صاحبو! اب میں تو اس پر کیا فتوی لگاؤں آپ خود ہی اس فعل کے نیک و بد ہونے کا فیصلہ کر لیجئے میں اس لئے فتوی نہیں لگا سکتا کہ فتوی دینے میں مجھے اس کا ثبوت دینا پڑے گا کہ شملہ جانا اور نینی تال جانا جائز ہے اور فقہ میں کوئی جزئیہ ایسا ہے نہیں جو میں آپ کے سامنے پیش کر کے آپ کو مجوج[1] کر دوں اور اگر قواعد سے فتوی دیا جائے تو اس کو مانتا کون ہے مگر میں آپ سے ایک مثال فرض کر کے پوچھتا ہوں کہ جس شخص کو کھانے کی ضرورت ہو اور وہ کھانا نہ کھائے بلکہ اس کے بجائے تفریح کیلئے بازار میں ٹہلتا پھرے اور سرمایہ وہاں فضول اشیاء میں فناء کر دے تو کیا اس تفریح پر آپ کوئی فتوی لگا سکتے ہیں دنیا بھر کے مفتی اکٹھے ہو جائیں تو بازار میں ٹہلنے کی ممانعت صراحۃً ثابت نہیں کر سکتے اگر اس نے یہی عمل رکھا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اس عمل کا انجام یہ ہوگا کہ وہ بھوک کے مارے مر جائے گا اس کی وجہ کیا ہے حالانکہ اس نے کوئی ناجائز فعل نہیں کیا دونوں فعل ظاہر میں شرعاً جائز تھے کھانا بھی اور بازار میں پھرنا بھی مگر پھر بھی اس فعل کے مذموم[2] ہونے کی وجہ اگر ہو سکتی ہے تو یہی ہو سکتی ہے کہ دونوں فعل اگرچہ مباح تھے لیکن ان میں ترتیب کی ضرورت تھی ضروری کو اول اور غیر ضروری کو بعد میں رکھنا چاہئے تھا۔

جائز کاموں میں ترتیب بھی ضروری ہے

اس شخص نے اس ترتیب کا خیال نہیں کیا اس واسطے ہلاک اس پر مرتب ہو گیا اس کو چاہئے تھا کہ پہلے کھانا کھاتا اس کے بعد بازار میں ٹہلتا اور زائد رقم اس میں صرف کرتا بلکہ اگر وقت یا سرمایہ نہ

---

[1] مغلوب کردوں [2] برے

بچتا تو اس کام کو حذف ہی کر دیتا یہ بہت سی موٹی سی بات ہے اس میں کسی کے فتوی دینے اور سمجھنے کی ضرورت نہیں موٹی سے موٹی عقل کا آدمی بھی اس کے خلاف نہیں کہے گا۔

اس نظیر کے بعد جڑی بوٹی کی تحقیقات کیلئے سفر اور تفریح کیلئے سفر کرنے پر میں آپ ہی سے فتوی پوچھتا ہوں کہ مولوی تو الگ ہیں وہ کوئی صریح فتوی اس پر نہیں دیں گے کیونکہ آپ ان سے دلیل مانگیں گے کہ قرآن وحدیث میں یا کسی اور کتاب میں کہاں لکھا ہے کہ جڑی بوٹیوں کی تحقیقات کیلئے یا تفریح طبع کیلئے سفر نہ کرو غرض ہم تو اس تقدیم دنیا علی الدین ؎۱ کے متعلق فتوی لگانے سے عذر کر دیں گے لیکن آپ ہی فرمایئے کہ آپ کے پاس اس عقلی فتوی سے بچنے کی کیا ترکیب ہے جو اس شخص پر لگایا تھا جو اس تقدیم دنیا علی الدنیا کا مرتکب ہو رہا ہے یعنی جو کھانا نہیں کھاتا اور بازار میں ٹہلتا پھرتا ہے وہاں آپ کا فتوی یہ ہوگا کہ اس نے دو کاموں میں ترتیب ملحوظ نہیں رکھی اس واسطے نتیجہ اس کا ہلاک ہوا۔

اسی طرح یہاں بھی دو کام ہیں ایک جڑی بوٹیوں کی تحقیق اور تفریح کیلئے سفر کرنا اور ایک شیخ کی تلاش کیلئے سفر کرنا ان دونوں میں یہی ترتیب ہونی چاہئے یا نہیں یہ بات تو ماننی پڑے گی کہ ترتیب ہے کیونکہ مسلمان بحیثیت مسلمان ہونے کے یہ کبھی نہیں کہہ سکتا کہ دین کی اصلاح ضروری اور مقدم نہیں اس وقت مخاطب سب مسلمان ہی ہیں ان کے سامنے اس پر دلیل وغیرہ لانے کی کچھ ضرورت نہیں کہ اصلاح دین، اصلاح دنیا سے مقدم ہے۔

جب یہ مسلم ہوا تو اب میں پوچھتا ہوں کہ تحقیقات اور تفریح طبع کیلئے سفر کرنے والوں پر یہ فتوی کیوں نہیں عائد کیا جاتا کہ انہوں نے ترتیب کا خیال نہیں رکھا اور کیا کوئی برا نتیجہ اس پر مرتب نہ ہوگا جیسا کہ اس شخص پر ہوا تھا جو بھوک کے وقت کھانا چھوڑ کر بازاروں میں ٹہلتا پھرتا تھا۔ ضرور مرتب ہونا چاہئے اس پر اگر ہلاک جان کا ترتب ہوا تھا تو اس پر ہلاک ایمان کا ترتب ہونا چاہئے کیونکہ کھانا محافظ جان ہے اور شیخ محافظ ایمان۔ ذرا تو انصاف چاہیے ہم گو ضابطہ کا فتوی نہ دیں لیکن آپ ہی کا فتوی موجود ہے۔

پیش کہ آورم ز دستت فریاد   ہم پیش نواز دست تو میخواہیم داد ؎۲

---

۱ دنیا کو دین پر مقدم کرنا ۲ آپ کے ہاتھ کی فریاد کس کے پاس لے کر جاؤں؟ آپ کے سامنے آپ ہی سے انصاف چاہتا ہوں

شیخ کو تلاش کرنے کی شرعی دلیل

عقلی فتویٰ سمجھا دینے کے بعد اب میں تبرعاً شرعی فتویٰ بھی بیان کرتا ہوں کیونکہ اس نظیر کے سمجھنے کے بعد اب شرعی فتویٰ بھی سمجھ میں آجائیگا سو یاد رکھئے کہ گو شریعت میں تحقیقات کیلئے سفر کی اور منصوری، شملہ پر جانے کی صراحتہً ممانعت نہیں مگر فقہاء نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ الأهم فالأهم کی رعایت واجب ہے[۱] جسوقت جو کام اہم ہو اس وقت اس کام کا کرنا واجب اور جو شئے اس میں مخل ہو اس کا ترک واجب ہے، چنانچہ اگر نماز کا وقت ہو، جماعت تیار ہو اور اس وقت ایک کافر آپ سے کہے کہ مجھے مسلمان کرلو تو اسوقت اس کو مسلمان کرنا واجب ہے اور جماعت ترک ہو جائے تو اس کی پرواہ نہ کی جائے گی حالانکہ جماعت بھی شرعاً واجب ہے، اسی طرح اگر ایک شخص حج نفل کا ارادہ کرتا ہو اور اندیشہ یہ ہے کہ سفر میں نمازیں قضاء ہوں گی اس کیلئے حج نفل کی اجازت نہیں تو جب شریعت نے الأهم فالأهم کے قاعدہ کا اتنا لحاظ کیا ہے کہ اہم کی وجہ سے دوسرے واجب اور نفل کا ترک واجب کردیا تو بتلایئے کہ اصلاح دین جب اہم اور مقدم ہے اور شملہ، منسوری کا سفر اس میں مخل ہو رہا ہے اور مصلح کے پاس جانے سے مانع ہے کیونکہ اس مدت تعطیلی[۲] کے سوا کوئی وقت فراغ کا آپ کے پاس نہیں تو اس حالت میں یہ سفر آپ کیلئے کیونکر جائز ہوگا اور ترک اہم کی وجہ سے یہ مباح کیوں ممنوع نہ ہو جائے گا۔

افسوس کہ جتنی سہولتیں آجکل شیخ کی تلاش میں ہیں اتنا ہی لوگوں نے اس کو دشوار کرلیا ہے وہ اس طرح کہ ارادہ ہی نہیں کرتے۔ میں کہتا ہوں کہ کوئی تعطیل[۳] تو اس کام میں صرف کی ہوتی پھر میں یہ شکایت خوشی سے سنتا کہ آجکل شیخ کامل کا کال ہے اور کوئی میسر نہیں آیا حالانکہ ایک دفعہ کی تلاش میں میسر نہ آنا بھی کافی عذر نہیں ایک ایک جڑی بوٹی کی تلاش میں لوگوں نے عمریں کھپا دی ہیں مگر خیر کسی درجہ میں تو عذر ہو جاتا مگر اب تو یہ بھی نہیں کیا جاتا یعنی ایک سفر کی بھی توفیق نہیں ہوتی۔

شیخ کی تلاش کا آسان طریقہ

بلکہ اس سے بھی زیادہ سہولت یہ ہے کہ جس شخص کی طرف خیال ہو اسکی تصانیف اور اقوال دیکھئے سفر کی بھی حاجت نہیں میں سچ عرض کرتا ہوں کہ اگر آپ طلب کی نظر سے اور تحقیق کی نظر سے دیکھیں گے تو متصنع اور غیر متصنع کا حال فوراً ہی کھل جائے گا۔ غرض کچھ تو کیجئے شکایت تو اس بات کی ہے

---

[۱] یعنی جو جتنا زیادہ ضروری ہے، اسے اتنا مقدم کیا جائے [۲] چھٹی کا وقت [۳] چھٹی

کہ کچھ بھی نہیں کرتے کبھی شیخ کی طرف طلب کی نگاہ بھی نہیں اٹھائی اور شکایت کرنے لگے کہ کوئی کامل ملتا ہی نہیں یہ تو عام لوگوں کی غلطی ہے اور میں نے کہا تھا کہ اس میں خواص بھی مبتلاء ہیں۔

خواص کی ایک بیجا شکایت اور اس کا جواب

ان کی سنئے کہ اگر کسی کو تلاش سے یا بلا تلاش کوئی شیخ مل بھی گیا تو اب ان کو یہ شکایت ہوتی ہے کہ اتنے دنوں سے ہم ان سے تعلق رکھتے ہیں اور کوئی بات بھی حاصل نہیں۔ اول تو تعلق باقاعدہ نہیں رکھتے، تعلق صرف ہاتھ میں ہاتھ دینے کا نام رکھا ہے بعض ایسے مرید ملتے ہیں جو مصافحہ کرتے ہیں اور شکایت کرتے ہیں کہ آپ نے پہچانا نہیں میں کہہ دیتا ہوں کہ تم نے اپنے کو پہچنوایا ہی نہیں جواب ملتا ہے کہ چار برس ہوئے جب آپ سے بیعت ہوئے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ میرے پاس مریدوں کی ایک فہرست رہتی ہے اور صرف رہتی ہی نہیں بلکہ میں اس کو رٹتا بھی رہتا ہوں بلکہ مریدوں کے فوٹو بھی رکھتا ہوں کہ جب کوئی سامنے آیا، پہچان لیا۔

صاحبو! ایسا تعلق، تعلق نہیں ہے بلکہ دل لگی ہے جو کسی درجہ میں بھی کارآمد نہیں سو ایک تو تعلق کی یہ گت ہے اور بعض لوگ تعلق بھی باقاعدہ رکھتے ہیں، خط و کتابت بھی رکھتے ہیں اور آتے بھی ہیں، رہتے بھی ہیں، ذکر و شغل بھی کرتے ہیں مگر چار دن میں ہی یہ شکایت ہوتی ہے کہ دل میں کچھ رونق پیدا نہیں ہوئی ''کے آمدی و کے پیر شدی''[۱] بندۂ خدا دل میں رونق اتنی جلدی کیسے حاصل ہو سکتی ہے وہ کون سا کام ہے جو چار دن میں آ سکتا ہے علاوہ بریں میں کہتا ہوں کہ رونق ہے کیا چیز اللہ کی طلب مقصود ہے یا دل کی رونق اگر ساری عمر بھی رونق حاصل نہ ہو تو ضرر نہیں۔ رونق تو بازار میں بھی حاصل ہو جاتی ہے اور ناجائز مجمعوں میں تو بہت ہی کچھ حاصل ہوتی ہے اگر رونق کی طلب تھی تو وہاں جانا چاہئے تھا یہاں تو ویرانی ہی ویرانی ہے گو وہ ویرانی بھی اور قسم کی ہے۔

مترس از محبت کہ خاکت کند　　کہ باقی شوی چوں ہلاکت کند[۲]

طالب کیلئے کیفیات کی طلب خطرناک ہے

طالبین کو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ کیفیات کے پیچھے نہ پڑیں اس میں بہت دھوکہ ہوتا ہے بعض

---

[۱] کب آئے اور کب پیر ہوئے [۲] محبت سے یہ مت ڈرو کہ وہ تمہیں خاک کر دے گی۔ جب تم خاک ہو جاؤ گے تو ہمیشہ کیلئے باقی ہو جاؤ گے۔

وقت آدمی کسی کیفیت سے بہت مسرور ہوتا ہے اور انجام اس کا یہ ہوتا ہے کہ اسی کو مقصود سمجھنے لگتا ہے پھر اگر وہ جاتی رہے تو مایوس ہوتا ہے اور اگر وہ نہ جائے تو تمام عمر اسی کا ہو رہتا ہے حالانکہ یہ خفی شرک ہے کیونکہ کیفیت کوئی بھی ہو غیر اللہ ہے اور طالب اللہ کا ہونا چاہئے نہ کہ غیر اللہ کا یہ بڑا دھوکہ ہے اس سے آدمی بلا اعانت شیخ کامل[۱] کے بڑی مشکل سے بچتا ہے جس کا مقصود کیفیات ہوتے ہیں ان کے جاتے رہنے کے وقت ان کو ایسا صدمہ ہوتا ہے جیسے اپنا کوئی محبوب مر گیا۔ دیکھئے حق تعالی تو فانی نہیں جو طالب اللہ کا ہے اس کو یہ وقت کبھی پیش نہیں آتا کیونکہ اس کا محبوب تو موجود ہے اس کی اگر تمام کیفیات بھی سلب ہو جاویں تو وہ یہ کہے گا ؎

روزہا گر رفت گو رو باک نیست　　　　تو بماں اے آنکہ جز تو پاک نیست [۲]

جو لوگ چار دن میں شکایت کرنے لگتے ہیں حقیقت میں ان کی نظر مقصود پر پڑی ہی نہیں اگر نظر پڑی ہوتی تو دو حال سے خالی نہیں یا تو وہ مقصود حاصل ہو چکا ہے تب یہ شکایت کس بات کی اور اگر حاصل نہیں ہو چکا ہے تب بھی شکایت کا موقع نہیں اس واسطے کہ مقصود جتنا ذی وقعت[۳] ہوتا ہے اتنی ہی وصول میں دیر لگتی ہے اور شکایت کا موقع نہیں ہوتا اگر حق تعالی پر نظر پڑی ہے تو ان کی وقعت کے سامنے کوئی مدت بھی دیر میں داخل نہیں پھر جلدی کرنا کیا معنی۔

بس یا تو مقصود کی وقعت[۴] ہی ان کے ذہن میں نہیں یا مقصود پر نظر ہی نہیں پہنچی۔ کیفیات کے دھیان میں لگنے کے یہ نتائج ہیں ایسی جلدی جب ہی ہوتی ہے جب کہ مقصود متعین نہ ہو یا اسکی عظمت ذہن میں نہ ہو۔ دیکھئے ڈپٹی کلکٹری کیلئے کتنی مدت کی ضرورت تھی جسکو اس مدت میں کامیابی ہو جاوے تو وہ اس کو دیر میں کامیابی نہ کہے گا پھر حیرت ہے کہ خدا مطلوب اور دیر کیلئے آمادگی نہیں کہ ادھر رات کو اللہ اللہ کیا اور صبح تک معراج کا فرشتہ نہ آگیا تو کہتے ہیں کہ ساری محنت اکارت ہے یہ تو وہی قصہ ہوا کہ **اذا صلی یومین انتظر الوحی**[۵]

چنانچہ ہماری بستی محلہ خیل میں ایک شخص جاہل تھے بہت عابد، زاہد، تہجد گزار، پابند صوم وصلوۃ تھے لوگوں کو ان کی طرف میلان بھی تھا اور کہتے تھے کہ وہ بزرگ آدمی ہے ایک شخص نظام الدین نام کا ان ہی کے محلہ میں رہتا تھا وہ مسخرہ تھا اور ان سے بدعقیدہ تھا جب لوگ یہ کہتے کہ یہ بزرگ آدمی

---

[۱] شیخ کامل کی مدد کے بغیر [۲] سارے دن ہی گزر جائیں تو گزر جائیں کچھ ڈر نہیں۔ ہاں آپ رہ جائیں کیونکہ آپ کے سوا کوئی پاک نہیں [۳] اونچے مرتبہ والا [۴] قدر [۵] دو دن نماز پڑھی اور وحی کا انتظار شروع کر دیا

ہیں تو وہ کہتا کہ جاہل کی کیا بزرگی؟ لوگ اسکو برا بھلا کہا کرتے تھے ایک روز اس نے تماشہ کیا جب وہ عابد صاحب تہجد کیلئے اٹھے تو یہ چھت پر جا بیٹھے اور بہت باریک آواز میں انہیں پکارا انہوں نے کہا کون؟ جواب دیا میں ہوں جبرئیل خدا تعالی کی طرف سے پیغام لایا ہوں کہ اب تم بوڑھے ہو گئے اور موسم بھی سردی کا ہے رات کو اٹھ کر وضوء کرتے ہو بہت تکلیف ہوتی ہے ہم کو شرم آتی ہے جاؤ ہم نے تمہیں اب نماز معاف کر دی یہ سن کر بیحد خوش ہوئے اور خوب پاؤں پھیلا کر سوئے یہاں تک کہ صبح کی نماز میں بھی نہیں آئے لوگوں نے یہ سمجھا کہ کچھ طبیعت خراب ہو گی یا آنکھ لگ گئی ہوگی اسلئے نہ آئے ہوں گے لیکن وہ دوسرے وقت بھی نہ آئے یہانتک کہ کئی وقت گزر گئے تب محلہ کے آدمی مزاج پرسی کیلئے گئے۔ جا کر دیکھا ہٹے کٹے بہت خوش چارپائی پر لوٹ مار رہے ہیں۔

لوگوں نے کہا میاں جی کیسا مزاج ہے؟ کہنے لگے بہت اچھا ہوں۔ کہا نماز کو کیوں نہیں آتے؟ تو بہت اینٹھ کر بولے کہ بھائی بہت نماز پڑھی اب خدا نے سن لی ہے اور جو غرض تھی نماز سے وہ حاصل ہو گئی ہے اب میرے پاس فرشتہ آنے لگا پرسوں یہ پیغام لایا تھا کہ اب نماز معاف کر دی گئی ہے۔ وہ مسخرہ جو دور بیٹھا تھا دیکھ رہا تھا قہقہہ مار کر ہنسا اور کہا دیکھ لی جاہل کی بزرگی۔ لوگوں نے کہا ظالم تو نے غضب کر دیا۔ یہ تو ایک جاہل کا قصہ ہے جسکو سن کر اسکو بہت ہی خفیف نظر سے دیکھا جاتا ہے مگر صاحبو! تعجب ہے کہ ہم اسکا تو مضحکہ[۱] بناتے ہیں لیکن اپنے حالات دیکھیں تو وہ بھی اس ہی جیسے ہیں کہ چار دن میں انتظار کرنے لگے حق تعالی کے ملنے کا بتلائیے فرق کیا ہے ہماری اس حرکت میں اور اس جاہل کی حرکت میں بلکہ یہ حرکت اور زیادہ خفیف ہے اس واسطے کہ اس نے تو تمام عمر کی عبادت پر اس ترقی کو مرتب سمجھا اور ہم چار ہی دن کے ذکر پر اس کے منتظر ہوں تو اس کا معراج کا انتظار اتنا مستبعد[۲] نہ ہوا جتنا کہ ہمارا ہے یہ کیسی غلطی ہے ایک تو یہ غلطی ہے۔

ایک اور غلطی

اور دوسری غلطی یہ ہے کہ بعض دفعہ کوئی چیز غیر مطلوب پیدا ہو گئی مثلاً بدن میں حرارت پیدا ہو گئی یا دل میں حرکت بڑھ گئی تو اپنے آپ کو کامل سمجھنے لگے۔ خوب کان کھول کر سن لیجئے کہ ذکر پر جو نتیجہ موعود ہے وہ یہ ہے فاذکرونی اذکرکم[۳] بس اسی کا وعدہ ہے یہ ضرور مرتب ہوتا ہے اسکے سوا کسی بات کا وعدہ نہیں کوئی بات پیدا ہو یا نہ ہو بلکہ پیدا ہونا بعض اوقات خطرناک ہوتا ہے۔ غرض نتیجہ

۱: مذاق اڑاتے ہیں ۲: ۔ دور ۳: ۔ (ان نعمتوں پر) مجھ کو یاد کرو میں تم کو یاد رکھوں گا۔ (البقرۃ،۱۵۲)

کے تو مرتب ہونے میں کچھ شبہ نہیں اور واقعی نتیجہ ہے بھی یہی اور یہی اس قابل ہے کہ اسپر دھیان لگایا جاوے باقی اسکے سوا دوسری کیفیات اور احوال چیز ہی کیا ہیں۔ کیا یہ تھوڑی بات ہے کہ ہماری یاد وہاں ہو اگر کسی کو ایک دفعہ کوئی معمولی حاکم یاد کرلے تو اس کے دماغ آسمان پر چڑھ جاتے ہیں پھر خدا تعالی کا یاد کرنا تو کتنی بڑی چیز ہے اور اس سے زیادہ کیا نتیجہ چاہئے۔ پھر جب موعود نتیجہ ا یہ ہے تو میں کہتا ہوں کہ اگر ذاکر ۲ کو کسی دلیل سے یہ ثابت ہو گیا ہو کہ یہ نتیجہ میرے ذکر پر مرتب نہیں ہوا تب تو شکایت کا موقع ہے لیکن اسکی کوئی دلیل نہیں بلکہ اس کے خلاف ثابت ہے کیونکہ یہ بات عقائد میں داخل ہے کہ خلف وعدہ ۳ نہیں ہوسکتا۔

فرشتہ حضور ﷺ پر آچکا اور وعدہ سنا گیا کہ جب کوئی ذکر کرے گا تو حق تعالی اس کا ذکر کریں گے نیز حدیث میں ہے من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی و من ذکرنی فی ملأ ذکرتہ فی ملأ خیر منہ یعنی جو مجھ کو چپکے چپکے یاد کرتا ہے میں اسکو چپکے چپکے یاد کرتا ہوں اور جو کوئی مجھ کو مجمع میں یاد کرتا ہے تو میں اسکو اس سے بہتر مجمع میں یاد کرتا ہوں۔ وہ بہتر مجمع کون ہے ارواح انبیاء علیہم السلام اور ملائکہ ہیں جب یہ وعدہ ہو چکا اور عقیدہ ہے کہ وعدے کے خلاف ہو نہیں سکتا تو ہر ذکر کے بعد یقیناً ثمرہ مرتب ہوتا ہے اور کیسا ثمرہ جو کہ تمام ثمروں سے اچھا اول تو حق تعالی کا یاد کرنا اور پھر بعض صورتوں میں ایسے مجمع میں جسکا ایک ایک فرد تمام دنیا سے افضل ہے۔

دیکھئے اگر کسی کو یہ خبر دی جائے کہ بادشاہ سلامت دربار خاص میں تمہارا ذکر کر رہے تھے تو اس کی کیا حالت ہو بلا مبالغہ انگرکھے کے بند ٹوٹ جائیں خواہ اس ذکر کا کوئی کارآمد نتیجہ بھی متفرع ۴ نہ ہو یعنی کوئی جاگیر یا کوئی منصب ملنے کی بھی امید نہ ہو صرف اس بات پر مرتے ہیں کہ بادشاہ نے یاد تو کیا حالانکہ بادشاہ ہم ہی جیسا ایک آدمی ہے اور دربار کا سارا مجمع بھی ہم ہی جیسے افراد کا مجموعہ ہے تمام دنیا کے بادشاہوں اور عظماء کو خدائے احکم الحاکمین اور انبیاءؑ اور ملائکہ سے کیا نسبت؟ شادی مرگ ۵ ہو جانا چاہئے جبکہ ہم سنیں کہ حق تعالی نے ہم کو یاد کیا ہے غرض وہ ثمرہ یہ ہے اور کتنی بڑی بات ہے مگر ہم لوگوں نے اپنی عقلوں کو کیسا مسخ کرلیا ہے کہ اسکو کسی شمار ہی میں نہیں لاتے اور ان ثمرات کا جو بالکل بے اصل ہیں (یعنی ثمرات اصلیہ کے سامنے) انتظار کرتے ہیں صاحبو! میں دل سوزی سے

ا جس نتیجہ کا وعدہ کیا گیا ۲ ذکر کرنے والے ۳ وعدہ خلافی ۴ برآمد ۵ خوشی میں مرجانا چاہیے

مشورہ دیتا ہوں کہ اگر کسی وقت ثمرات زائدہ کا دل پر تقاضا ہو تو یوں کہا کیجئے ۔

یا بم او را یا نیا بم جستجوئے میکنم حاصل آید یا نیاید آرزوئے میکنم ؎۱

بہر حال لوگوں کو ان زوائد میں ابتلاء ؎۲ ہو گیا ہے اور اصلی چیز کا پتہ نہیں ۔ اور اگر اصلی چیز کی خواہش بھی ہوتی ہے تو یہ چاہتے ہیں کہ مفت مل جائے ، کچھ کرنا نہ پڑے اور ناقص طلب پر اپنے آپ کو امیدوار سمجھتے ہیں ۔

آخرت کیلئے کوشش دنیا کی سی نہیں کی جاتی

مگر اس قسم کی امیدواری صرف آخرت ہی کے بارے میں ہے دنیا کی امیدواری کبھی اس طرح نہیں کرتے وہاں تو کوشش میں جان توڑ دیتے ہیں اور کوئی ایسا کرے کہ غلہ کی تمنا کرے اور کھیتی نہ کرے اور نہ اسکی سینچائی کرے اور اپنے آپ کو غلہ کا امیدوار رکھے تو ہر کس و ناکس بلا شبہ اسکو یہی کہے گا کہ پاگل ہے ، اسکا دماغ خراب ہو گیا ہے اور یوں کہتے ہیں کہ یہ غلط چال چلتا ہے نہ دانا بویا ، نہ پانی سینچا اور غلہ کا امیدوار بن بیٹھا اور اگر کسی نے ساری تدبیریں کر کے پھر کہا کہ کام تو سب کر لیا ہے اب خدا سے امید ہے اسکو لوگ کہیں گے کہ یہ صحیح چال ہے یا مثلاً ایک شخص اولاد چاہتا ہے اس کو ہر شخص مجنوں کہے گا حالانکہ اس شخص کے پاس ایک نظیر بھی اس کی ہے کہ بلا نکاح کے اولاد ہوئی ہے ۔ سب جانتے ہیں کہ آدم علیہ السلام بلا مرد و عورت کے پیدا ہوئے ، حضرت حواء بدوں عورت کے پیدا ہوئیں عیسی علیہ السلام بدوں مرد کے پیدا ہوئے جبکہ یہ نظیریں موجود ہیں تو کسی کو انکار اور اعتراض کا چنداں موقع نہیں مگر پھر بھی کہتے ہیں اسکو پاگل ہی ۔

امید کے صحیح معنی

تو اصل اس کی یہ ہے کہ سب مقاصد میں امید کے معنی جمع اسباب کے بعد توقع حصول نتیجہ ؎۳ ہیں مگر حیرت ہے کہ طلب خدا کے بارہ میں امید کے عجیب معنی گھڑے گئے ہیں کہ نہ تقوی کی ضرورت نہ طہارت کی ، نہ کسی اور چیز کی اور امید ایسی گہری کہ یقین سے بھی کسی درجہ میں بڑھی ہوئی کیوں صاحب کیا یہ بھی کوئی خاصیت ہے کہ امید کے ساتھ جب دنیا کا نام لگے تو اس میں بہت سے شرائط

؎۱ اسے پاؤں یا نہ پاؤں ، جستجو کر رہا ہوں ۔ پوری ہو یا نہ ہو آرزو کر رہا ہوں ؎۲ فضول باتوں میں پڑ گئے ہیں

؎۳ اسباب جمع کرنے کے بعد نتیجہ کی امید اور توقع رکھنا

ہوں اور جب آخرت کا نام لگے تو بالکل شرائط حذف ہو جائیں کوئی قید و شرط باقی نہ رہے۔

امید کے معنی میں نفس کا دھوکہ

دیکھ لیجئے یہ کس درجہ نفس کا دھوکہ ہے کبھی تو غور کرنا چاہئے کہ وہی ایک لفظ ہے ایک جگہ اس کے معنی کچھ ہو جاتے ہیں اور دوسری جگہ کچھ لغت میں تو کہیں نہیں لکھا کہ امید دو معنوں میں مستعمل ہے افسوس ہم نفس و شیطان کے سامنے ایسے بھولے بنے کہ جسطرح وہ چاہے بہکا لیتا ہے اس کے اقوال میں یہ بھی نہیں دیکھتے کہ یہ ایک لفظ کے دو معنی کس قاعدہ سے لیتا ہے۔

ایک طلب علم کی بوالہوسی کا قصہ

ایک طالبعلم تھے فاقہ کرتے تھے مگر دماغ میں ایک شہزادی سے نکاح کی سمائی ہوئی تھی کسی نے ان سے پوچھا کہ میاں کچھ امید بھی ہے کچھ آثار بھی ایسے ہیں جن سے امید پڑے؟ کہا جی ہاں آدھا سامان تو ہو گیا ہے آدھا باقی ہے۔ پوچھا وہ آدھا کیا ہے کہا میں تو راضی ہوں مگر وہ راضی نہیں یعنی نکاح میں دو جزو ہیں ایجاب وقبول میں تو ایجاب کیلئے تیار ہوں اس کا قبول کرنا باقی ہے بس ایسے ہی ہمارا سامان آخرت ہے کہ ہم تو جنت کیلئے تیار ہیں فقط ادھر کی منظوری باقی ہے صاحبو! نری باتوں اور خالی آرزوؤں سے کہیں کام چلتا ہے خوب یاد رکھو۔

عرفی گر بگریہ میسر شدے وصال صد سال میتواں بتمنا گریستن [۱]

اور حضرت علیؓ فرماتے ہیں

لو کان یدرک ھذا العلم بالمنی ما کان یبقی فی البریہ جاھل

فاجھدو لا تکسل و لا تک غافلا فندامۃ العقبی لمن یتکاسل [۲]

یہ سب نفس کے دھوکے ہیں کہ زندگی بھر ان ہی ابلہ فریبیوں [۳] سے آدمی کو کام سے روکتا ہے اور جب موت آگئی تو پلہ جھاڑ کر بے حیا الگ ہو گیا اور کہہ دیا ان اللہ وعدکم وعد الحق ووعدتکم فاخلفتکم یعنی سچی تو حق تعالیٰ ہی کی بات تھی میں نے جو کچھ وعدے کرر کھے تھے وہ

---

[۱] عرفی اگر صرف رونے سے ملاپ ممکن ہوتا تو اس آرزو میں سو سال رویا جا سکتا تھا [۲] اگر یہ علم محض آرزوؤں سے ملا کرتا تو دنیا میں کوئی جاہل باقی نہ رہتا۔ کوشش کرو، سستی نہ کرو، غفلت نہ کرو۔ سست آدمی کا انجام تو شرمندگی ہوتا ہے [۳] بے وقوفی کی باتیں

جھوٹے تھے آج اپنے ان سب وعدوں کے خلاف کر رہا ہوں اب جو ہو سکے میرا کرلو۔

کس قدر حسرت کا وقت ہوگا سو اس وقت سے پہلے ہی ہوش میں آجایئے اور اس دھوکے میں نہ رہئے کہ خواہ کوشش کریں یا نہ کریں، کام ہو ہی جائے گا آپ کو خدا تعالیٰ سے جو امید ہے، یہ امید غلط معنوں میں ہے اور ایک وقت میں اسکی غلطی کھل جائے گی عمل میں کوشش کیجئے اور اس کے بعد حق تعالیٰ سے امید رکھئے۔ ہاں کوشش کر کے یہ نہ سمجھئے کہ یہ ہماری کوشش سے حاصل ہوا بلکہ کوشش کے بعد جو نتیجہ ہوتا ہے وہ بھی فضلِ خداوندی ہی ہے۔

یہ کہنے کی گنجائش نہیں کہ حق تعالیٰ نے کیا دیا ہم نے کوشش بھی تو کی تھی کیونکہ یہ بھی تو ممکن ہے کہ کوشش کے بعد نتیجہ مترتب نہ ہو چنانچہ بہت سے اسباب، مسببات میں اس کا مشاہدہ بھی ہو جاتا ہے اور مسلمان کے تو عقیدہ میں داخل ہے کہ کوئی چیز موجود نہیں ہو سکتی جب تک حق تعالیٰ کا ارادہ نہ ہو تو کوشش کرنے کے بعد بھی نتیجہ کا وجود از خود نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کی مشیت سے ہوتا ہے۔

زیادہ تدبیر سے آدمی کو تدبیر پر بھروسہ ہو جاتا ہے

یہ خرابی انہماک فی التدبیر[1] کی ہے کہ اس پر بھروسہ ہو جاتا ہے اسی واسطے اجمال فی الطلب[2] کی تعلیم دی گئی ہے تاکہ تدبیر پر بھروسہ نہ ہونے پائے۔ لوگ کہہ تو دیتے ہیں کہ تدبیر میں کیا حرج ہے مگر حضرت آپ نے غور نہیں کیا جب سے تدبیر میں غلو ہوا ہے اس وقت سے لوگ فاعل حقیقی[3] بننے لگے ہیں ان کے حالات سے معلوم ہوتا ہے کہ فاعل حقیقی گو زبان سے کسی اور کو کہیں مگر یہ برائے گفتن ہے دل میں تدبیر پر اتنا بھروسہ ہے کہ اس کے بعد ترتب نتیجہ کیلئے مشیت ایزدی[4] کا خیال بھی کم آتا ہے حالانکہ تدبیر کے بعد کام بمشیت ایزدی[5] ہی ہوتا ہے دیکھو حق تعالیٰ ایک ایسے فعل کی نسبت جو ظاہراً تمہارا اختیاری معلوم ہوتا ہے کیا ارشاد فرماتے ہیں افرأیتم ما تحرثون ءانتم تزرعونه ام نحن الزارعون[6] یعنی اپنے بونے کو بھی تم نے دیکھا اسکو تم اگاتے ہو یا ہم۔ دیکھ لیجئے ظاہری نظر میں تو کھیت کا پیدا ہونا اور غلہ حاصل کرنا انسان کا اختیاری فعل ہے پھر اس پر یہ سوال کیسے ٹھیک ہے کہ اس کھیت کو تم تیار کرتے ہو یا ہم۔

---

[1] تدبیر میں بہت زیادہ محنت اور توجہ [2] مختصر تدبیر اختیار کر کے اللہ پر بھروسہ کرنا [3] اصل کرنے والا [4] نتیجہ حاصل ہونے کے بعد اللہ تعالیٰ کا خیال [5] اللہ تعالیٰ کے ارادہ [6]: سورۃ الواقعۃ ۶۳، ۶۴

کسی فعل پر نتیجہ مترتب ہونے سے اس فعل کی نسبت اپنی طرف کرنا صحیح نہیں

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ کسی فعل پر نتیجہ مترتب ہوتے دیکھ کر اسکی حقیقی نسبت اپنی طرف کرنا صحیح نہیں اور یہ واقعی بات ہے بے سوچے سمجھے کوئی کچھ کہہ دے لیکن غور کرنے کے بعد یہ بات اچھی طرح ثابت ہو جاتی ہے کہ تمہارا دخل ترتبِ نتیجہ میں سوائے اس کے اور کیا ہے کہ تم نے آلات و ذرائع کو استعمال کیا باقی ان کے استعمال پر نتیجہ کا ترتب اس میں تمہارے اختیار کو کیا دخل ہے تم تو کھیت میں دانہ پھینک کر اور غارت کر کے مٹی میں ملا کر چلے آئے تھے وہاں مٹی میں مل کر جو کچھ تغیرات ہوئے اسکا تمہیں علم تک بھی نہیں ہوتا اختیار تو کہاں سب کام اسکے اندر ہی اندر ہو کر سبز پتے کی صورت میں جب باہر نکل آیا تب تو تم کو یہ علم ہوا کہ اس دانہ کے سب کام ہو گئے بسا اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ کوئی دانہ نہیں جمتا اور آپکو خبر بھی نہیں ہوئی کہ وہ دانہ کہاں گیا غرض کسی قسم کا اختیار سوائے استعمال آلات کے آپکو نہیں، اگر کوئی کہے کہ ہم کو بعض چیزوں پر تو ہر طرح سے اختیارات ہیں دیکھو جب چاہیں بجلی بنا لیتے ہیں اور طرح طرح کی چیزیں بناتے ہیں تو میں یہ جواب دیتا ہوں کہ بجلی کا پیدا کرنا کیا تمہارے فعل سے ہوا؟ تم نے تو صرف یہ کیا کہ چند چیزوں کو ملا دیا اس کے بعد جو بجلی پیدا ہوئی اس میں تمہارے اختیار کو کچھ بھی دخل نہیں تمہیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ بجلی کیا چیز ہے یہ لوگ فلسفہ بھی نہیں جانتے۔

دیکھئے فلسفہ کا مسئلہ ہے القدرۃ تتعلق بالضدین یعنی قدرت کا تعلق ضدین کے ساتھ ہوتا ہے جیسے چلنا یا مٹھی بند کرنا کہ اسپر قادر اس شخص کو کہیں گے جسکے ارادہ کا تعلق مشی [۱] اور عدم مشی اور قبض اور بسط دونوں سے ہو سکے یعنی جب چاہے چلے اور جب چاہے نہ چلے اور جب چاہے مٹھی بند کرے اور جب چاہے کھول لے اسی بنا پر میں سوال کرتا ہوں کہ بجلی کا پیدا کرنا اگر تمہاری قدرت میں ہے تو یہ جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ اسکا وجود اور عدم دونوں تمہارے اختیار میں ہوں اب میں کہتا ہوں کہ آپ برق کے پیدا کرنے کیلئے آلات کو استعمال کیجئے اور یہ ارادہ کیجئے کہ برق پیدا نہ ہو۔ دیکھوں تو پیدا ہوتی ہے یا نہیں؟ وہ ضرور پیدا ہوگی۔

اس سے صاف ثابت ہو گیا کہ آپ کے اختیار میں صرف استعمال آلات ہے اور وجود برق [۲] آپ کے اختیار میں نہیں ورنہ ارادۂ عدم کے وقت نہ پیدا ہوتی یہ فلسفہ سے ثابت ہوا افسوس تو یہ ہے

---

[۱] چلنا [۲] بجلی کا وجود

کہ فلسفہ کو بھی لوگ پورا نہیں پڑھتے صرف نام سے آشنا ہو کر فلسفی بن جاتے ہیں۔ یہ گفتگو تو ایسی چیز میں ہوئی جو قلیل الوقوع ۱؎ ہے بجلی بنانا ہر شخص کو نہیں آتا اس کا اگر غیر اختیاری ہونا ثابت بھی کر دیا جائے تو کوئی شبہ کر سکتا ہے کہ یہ افعال غیر اختیاریہ کا ایک فرد ہوگا۔

اب ان افعال کو دیکھو جنکو آپ دن رات کرتے ہیں اور ان کی کثرت و تکرار ۲؎ کی یہ نوبت ہے کہ ہر وقت ان پر نتیجہ کا ترتب دیکھ کر خیالوں میں عام طور سے یہ بات جم گئی ہے کہ یہ افعال ہمارے اختیار میں ہیں اور کبھی اس بات کی طرف وہم بھی نہیں جاتا کہ یہ افعال ہمارے اختیاری نہیں ہیں مثلاً ترکاری بازار سے لے آنا ایک کام ہے جو نہایت ادنی درجہ کا اور معمولی کام ہے اور ہر روز کیا جاتا ہے اور اس معنی کو اختیاری بھی ہے کہ ہم چاہیں کریں، نہ چاہیں نہ کریں مگر میں کہتا ہوں کہ یہ بھی اس درجہ کا اختیاری نہیں جس درجہ کا سمجھے ہو۔

بیان اس کا یہ ہے کہ جو کام بھی ہم کرتے ہیں پہلے دماغ میں اس کا ایک خیال اور نقشہ آتا ہے مثلاً جب ہم کو ترکاری لانا ہے تو پہلے دماغ میں اس کا نقشہ اس طرح آتا ہے کہ فلاں ترکاری لانا ہے اور وہ فلاں بازار میں ملے گی اور اس بازار کا فلاں فلاں رستہ ہے اور اتنی قیمت اس کے واسطے لے چلنا، یہ سب باتیں ذہن میں آنے کے بعد ترکاری لانے کا کام انجام پاتا ہے اس قسم کے کام صبح سے شام تک صدہا دفعہ ہوتے ہیں اور ہر انسان کرتا ہے اور کبھی یہ خیال بھی نہیں جاتا کہ ایک ایک کام کیلئے اتنے بکھیڑے ہوتے ہیں مگر خدا نے عقل دی ہے اس کے ذریعہ سے سمجھ سکتے ہو۔

ارادہ کے بعد کسی چیز کا ذہن میں آجانا اختیاری نہیں

سو میں پوچھتا ہوں کہ ان سب افعال میں کونسا فعل آپ نے کیا اور کونسا از خود ہو گیا۔ ان سب کاموں میں سے جو کام کسی قدر آپ کے اختیار سے ہوا وہ صرف ارادہ ہے باقی ارادہ سے پہلے اس کی طرف التفات اور نقشہ ذہن میں آنا اور جتنے بھی کام تھے وہ سب بلا آپ کے اختیار کے ہوئے دلیل اسکی یہ ہے کہ اگر دماغ میں کسی چیز کا آجانا اختیاری ہے تو چاہئے کہ جو چیز آدمی سوچے فوراً سوچ کر سمجھ لے حالانکہ بعض چیزیں مدتوں تک سوچنے کے بعد آتی ہیں۔ موجدین کے حالات آپ لوگ جانتے ہیں کہ ان کا کام صرف یہ رکھا گیا ہے کہ سوچا کریں، برسوں سوچنے سے ایک کام کی ایجاد ہوتی ہے انکی اختیاری اتنی بات تو ہے کہ سوچا کریں اور اگر دماغ میں آجانا ہی سوچنے والے کا کام ہے تو پندرہ

۱؎ جسکا وجود کم ہے ۲؎ بار بار کرنے

برس کیوں لگائے اول ہی دفعہ میں کیوں دماغ میں نہ لے آیا اس واسطے آیت میں پوچھتے ہیں افرأیتم ما تحرثون ۱؎

کھیت کا تیار ہونا یا پانی کا برسنا ہمارے اختیار میں نہیں

اس آیت میں کئی سوال ہیں اول کھیتی کے متعلق پوچھتے ہیں اانتم تزرعونہ ام نحن الزارعون ۲؎ یعنی اس کھیتی کو تم اگاتے ہو یا ہم اگاتے ہیں۔ پھر فرماتے ہیں لو نشاء لجعلناہ حطاماً فظلتم تفکھون انا لمغرمون بل نحن محرومون ۳؎ اگر ہم چاہیں تو اس کو چورا چورا کریں یعنی اس میں دانہ ذرا بھی پیدا نہ ہو اور سب گھاس کوڑا ہی ہو جائے۔ پھر پانی کی نسبت فرماتے ہیں افرأیتم الماء الذی تشربون أ أنتم انزلتموہ من المزن ام نحن المنزلون ۴؎ یعنی جو پانی دن رات پیتے ہو اسی کو بتاؤ کہ بادلوں میں سے تم اس کو اتارتے ہو یا ہم اتارتے ہیں۔ اسی طرح آگ کی نسبت فرماتے ہیں یہ وہ چیزیں ہیں جنکو ہم دن رات استعمال کرتے ہیں اور جن کو ہم اختیاری سمجھتے ہیں۔ یہ سوال اس بات پر مبنی ہے کہ اختیاری سمجھنا غلط ہے اور یہ قاعدہ کچھ افعال دنیوی تک ہی محدود نہیں بلکہ اعمال اخروی میں بھی یہی ہے کہ ہمارے اختیار میں ارادہ ہے اسپر عمل کا وجود پھر عمل کی غرض کا متفرع ہونا ۵؎ یعنی جنت مل جانا ہمارے اختیار میں نہیں سوائے حق تعالیٰ کے فضل کے، اگرچہ یہاں محاورات میں یہ بات کہی جاتی ہے کہ جب ایک شخص نے نوکری کی اور مہینہ بھر تک کارگزاری اچھی رہی تو اب اسکی تنخواہ کام لینے والے کے ذمہ ہوگئی مگر دنیا کے کاموں میں تو یہ حکم اس واسطے صحیح ہے کہ کارگزاری کرنے والے نے اپنے ارادہ اور قدرت سے کام کیا تھا اور جسکی نوکری کی تھی اسکے اختیار و قدرت کو اسکے فعل میں کوئی دخل نہیں اور اعمال آخرت میں ایسا نہیں ہے گو ہم بظاہر حق تعالیٰ کے اجیر ہیں اور کارگزاری کرنے پر اپنے خیال میں اجر مانگ سکتے ہیں مگر دیکھنے کی بات یہ ہے کہ آیا ہمارے اختیار کو ان اعمال میں مستقل دخل ہے یا وہ اختیار بھی کام لینے والے ہی کا پیدا کیا ہوا ہے۔

سو گو بظاہر کوئی کہہ سکتا ہے کہ ہم نے اپنے اختیار سے اعمال کئے اور ہاتھ پیر ہمارے قبضہ میں ہیں لیکن میں کہتا ہوں کہ آپ کا اعضاء کو کام میں لانا آپ کے ارادہ پر موقوف ہے اور یہ ٹھیک ہے کہ آپ کے ارادہ کرنے کے بعد اعضاء کام کرنے لگتے ہیں لیکن خود یہ ارادہ حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہے تو بعد قطع وسائط ۶؎ کے یہی کہنا پڑے گا کہ آپ کے افعال حق تعالیٰ کے قبضہ میں ہیں اب آپ

۱؎ بھلا دیکھو جو کچھ تم بوتے ہو، اسے تم اگاتے ہو یا ہم اگانے والے ہیں۔ (سورۃ الواقعۃ ،۶۳) ۲؎ ۔الواقعۃ ،۶۴
۳؎ ۔الواقعۃ ،۶۵ ۴؎ ۔الواقعۃ ،۶۶ ،۶۷ ۔ ۵؎ اسپر مرتب ہونا ۶؎ درمیانی چیزوں کو ختم کرنے کے بعد

بتایئے کہ اگر ہم نے کچھ اعمال کئے جن کے بعد ہم جنت کے مستحق سمجھے جاتے ہیں ان میں ہماری کارگزاری کیا ہوئی اعمال بھی باری تعالی کی طرف سے ہو گئے جیسا کہ ابھی بیان کیا گیا اور جنت بھی حق تعالی کی طرف سے ملے گی پھر ہمارا نام بیچ میں کیسے آیا یہ محض فضل ہے مگر غلطی سے ہم لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے اعمال پر دخول جنت ضرور مرتب ہونا چاہئے اور نتیجہ ہمارے فعل کا اثر ہے۔

اعمال کے غیر اختیاری ہونے کی مثال

میں اسکی ایک مثال دیتا ہوں جس سے اعمال اور نتائج کا تعلق اچھی طرح واضح ہو جائے گا دیکھئے گھڑی کے چلنے میں اتنا دخل آپ کا ضرور ہے کہ اسکو کوک دیں لیکن کوکنے کے بعد اسکو چلایا کس نے ؟ یہ کوئی نہیں کہے گا کہ کوکنے والا چلا رہا ہے۔ کوکنے والے کا کام تو فزکو اینٹھ دینا ہے اب چلا رہی ہے فزکی طاقت ؎

عشق من پیدا و معشوقم نہاں [1]

علی ہذا آپ کے افعال میں گو ظاہراً یہ معلوم ہوتا ہے کہ آپ کر رہے ہیں مگر آپ کے تمام افعال کی انتہاء جا کر ارادہ پر ہوتی ہے اور ارادہ آپ کے قبضہ میں نہیں تو آپ کا کوئی فعل بھی آپ کے قبضہ میں نہیں ارادہ ڈالنے والے کا تو پتہ نہیں چلتا پھر جن افعال کی یہ حالت ہو ان پر اجر کا مترتب ہونا کیا کوئی کہہ سکتا کہ یہ افعال کا نتیجہ ہے اور ان افعال کو اس میں دخل تام [2] ہے حقیقت میں کچھ بھی نہیں بلکہ یہ سب کچھ بمشیت باری تعالی [3] ہے غرض اس تقدیر سے یہ ثابت ہوگئی کہ اسباب کے بعد بھی مسبب کا ترتب بقبضۂ خدا تعالی ہے اور جمع اسباب کے بعد بھی نتیجہ کا وجود یقینی نہیں اور اس سے جبر کا شبہ نہ کیا جائے اختیار کی نفی کرنا مقصود نہیں بلکہ مقصود یہ ہے کہ ایسا اختیار عبد [4] کو نہیں جس کے استعمال کے بعد وہ اپنے کو مستحق معاوضہ سمجھے۔ خلاصہ یہ کہ اس تحقیق کا مقتضا تو یہ تھا کہ ہم اعمال صالحہ کرنے کے بعد بھی دخول جنت کے امیدوار نہ ہو سکتے کیونکہ سبب اور مسبب میں لزوم کا علاقہ نہیں چہ جائیکہ اعمال بھی نہ کریں اور اپنے آپ کو امیدوار کہیں۔ یہ بھی محض خدا تعالی کا فضل اور محض عطاء ہی ہے کہ کچھ عمل ایسے بتلا دیے جن کے بعد اجر کا وعدہ ہے حالانکہ اس میں اور اجر میں کوئی علاقہ نہیں کیونکہ کسی کو مزدوری دینے کی ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ اس سے کوئی کام ایسا لیا جائے جسکی کام لینے والے کو ضرورت ہو مثلاً مزدور سے چھت پر مٹی ڈلوائیں تو اس کی مزدوری اس واسطے دی جائے گی کہ اس نے

---

[1] میری محبت تو نظر آتی ہے مگر محبوب چھپا ہوا ہے [2] مکمل دخل [3] اللہ تعالی کے حکم [4] بندہ

ایسا کام کیا جسکی ہم کو ضرورت تھی اور بعض وقت مزدوری یا انعام ایسے کام پر دیا جاتا ہے جسکی کام کرنے والے کو ضرورت تو نہیں لیکن وہ کام فی نفسہ اچھا ہے اور داد دینے کے قابل ہے جیسے کاریگر کوئی عمدہ چیز بنا کر امراء کے ہاں لے جاتے ہیں اور اس پر انعام ملتا ہے اس صورت میں رئیس کو اس کی ضرورت تو نہیں تھی مگر وہ اچھی چیز ہے اس لئے انعام دے دیا تاکہ کاریگر کو ایسی ایجادات کا شوق بڑھے۔ حق تعالی کے یہاں دونوں باتیں نہیں نہ حق تعالی کو کسی کام کی ضرورت ہے اور نہ کسی عمل میں ایسی ذاتی خوبی ہے جسکو دکھانے کیلئے وہاں پیش کیا جائے ہر چیز کا حسن و قبح حق تعالی کے فرمانے پر ہے کسی چیز کو دربار خداوندی میں پیش کر کے اپنے کو کسی مزدوری یا انعام کا مستحق کس طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ غرض اسکا مقتضاً تو یہ ہے کہ اگر ساری عمر بھی آدمی نیک اعمال کرے، تب بھی اس کو ایک پیسہ کا بھی مستحق نہیں سمجھا جا سکتا مگر حق تعالی کی عطاء ہے کہ بلا کسی وجہ کے چند کام بتلا دئے کہ ایسا کرو ہم اتنا اجر دیں گے۔

اعمال اور نتیجہ کی مثال

اسکی مثال ایسی ہوگئی کہ ایک مزدور کو بلا دیں اور یوں کہیں کہ تم بازار میں ٹہل آؤ، جتنے قدم جاؤ گے ہر قدم پر ایک روپیہ ملے گا اس صورت میں کیا کہا جا سکتا ہے سوائے اسکے کہ اس کے ساتھ سلوک کرنا ہی منظور ہے۔ اب میں یہ پوچھتا ہوں کہ اس مزدور کو کیا برتاؤ کرنا چاہئے کام پورا کرنا چاہئے یا نہیں اور کام کرنے کے بعد کیا اس کا یہ منہ ہے کہ مزدوری کا تقاضا کرے۔ ہرگز نہیں اور اگر اس صورت میں وہ کام بھی نہ کرے تب تو اسکو مزدوری کی امید میں رہنا نری حماقت ہے اور اگر کام کرے تو پوری مزدوری مانگنا یا اسکی امید رکھنا یہ بھی غلطی ہے اس مثال کو خوب یاد کر کے اپنا برتاؤ حق تعالی کے ساتھ دیکھ لیجئے جن کاموں پر نام نہاد کیلئے اعمال کا نام لگا کر حق تعالی نے اجر و ثواب کا وعدہ کر لیا ہے ان کو ہم کہاں تک پورا کرتے ہیں۔ ہرگز پورا نہیں کرتے لیکن اجر اور مزدوری کی امید بلکہ پوری سے بھی زیادہ لگا رکھی ہے۔

امید کے معنی میں غلطی

اور اس کا نام امید رکھا ہے اور سمجھ لیا ہے کہ یہی وہ امید ہے جسکی نسبت حدیث میں ہے الایمان بین الخوف والرجاء[1] اور جسکی نسبت وارد ہے کہ ناامیدی کام شیطان کا ہے۔ صاحبو!

---

[1] ایمان تو خوف اور امید کے درمیان ہے

ذرا غور سے کام لیجئے دنیا کے کاموں میں بھی کہیں اس قسم کی امید رکھی ہوتی اور کسی کے یہاں بلا کام کیے یا کم کام کر کے پوری مزدوری مانگنے کو پہنچے ہوتے مگر دنیا کے کاموں میں تو بیوقوف سے بیوقوف اور پاگل کو بھی اس قسم کا خیال نہیں آسکتا اور آخرت کے کاموں میں اچھے اچھے عقلاء بھی اس امید کو لئے بیٹھے ہیں اور لوگ انکو عقلمند کہتے ہیں یہ حالت تو ان لوگوں کی ہے جو نرے دنیا کے عقلمند ہیں اور دین سے ان کو کم تعلق ہے۔

اجرِ آخرت کا مدار محض عمل پر نہیں

میں ان لوگوں سے پوچھتا ہوں جو واقعی دین دار ہیں اور امید کو صحیح معنی میں سمجھے ہوئے ہیں کہ آپ لوگ اپنے کاموں میں دنیا کیلئے کے گھنٹے دیتے ہیں اور آخرت کیلئے کے گھنٹے۔ اگر دنیا کیلئے دس گھنٹے دیتے ہوں گے تو آخرت کیلئے ایک گھنٹہ بھی غالباً نہ ہوگا اب اجر کا حساب لگائیے تو اگر دس گھنٹے کے پچاس روپے ملتے ہوں تب ایک گھنٹہ میں پانچ روپے ملنے چاہیں لیکن پچاس روپے دس گھنٹے میں عام طور پر کہاں ملتے ہیں روپیہ دو روپیہ روز سے زیادہ دن رات میں بہت کم لوگوں کو ملتے ہوں گے اس حساب سے ایک گھنٹہ کی اجرت کچھ پیسے ہی ہوں گے اور یہ بھی جب کہ ایک گھنٹہ خالص اللہ کیلئے چھوڑا گیا ہو حالانکہ ہم لوگ ایسا بھی نہیں کرتے۔ جو گھنٹہ اللہ کے واسطے مقرر کرتے ہیں اس میں بھی دنیا کے قصوں میں دل پھنسا رہتا ہے اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر تمام عمر کا ثواب بڑے حساب جمع کرلو تو دس پندرہ روپے سے زیادہ نہ ہونا چاہئے مگر وہاں فضل کی یہ حالت ہے کہ ثواب کتنا ملے گا ما لا عین رأت و لا اذن سمعت و لا خطر علی قلب بشر جو نہ کسی آنکھ نے دیکھا، نہ کان نے سنا، نہ کسی آدمی کے دل پر اسکا خطرہ گزرا۔ دس پندرہ کی تو کوئی گنتی ہی نہیں، لاکھوں میں بھی شمار نہیں کیفاً وکماً بے شمار اجر ملے گا کہ اتنے بڑے نتیجہ کا ترتب ان اعمال پر جن کا اجر حساب سے دس پندرہ روپیہ سے زیادہ نہ تھا کوئی عقلمند نہیں کہہ سکتا اور عقل کبھی تسلیم نہیں کر سکتی کہ یہ ہمارے عمل کا نتیجہ ہے بلکہ محض فضلِ خداوندی ہے۔

عمل پر اجرِ آخرت مترتب نہ ہونے کی وضاحت

سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عمل کے بعد بھی یہ نتیجہ حاصل ہو جائے تو بڑی بات ہے اور محض فضل ہے چہ جائیکہ عمل بھی نہ کریں حق تعالیٰ نے اس غلطی پر متنبہ فرمایا ہے اس آیت میں ان الذین یتلون کتاب اللہ و اقاموا الصلوۃ و انفقوا مما رزقنھم سراً و علانیۃ یرجون تجارۃ لن تبور [1]

---

[1] بیشک جو لوگ کتاب اللہ کی تلاوت کرتے رہتے ہیں اور انہوں نے نماز قائم کی اور جو کچھ ہم نے انہیں عطا کیا تھا=

اسمیں یرجون کومترتب فرمایا ہے یتلون کتاب اللّٰہ وغیرہ پر معنی یہ ہوئے کہ جن لوگوں میں اول ان چیزوں کا وجود ہوتا ہے اور اسکے بعد امید کا وجود ہوتا ہے ان کی تجارت سودمند ہوتی ہے اور اگر امید اس سے پہلے ہوتو دھوکہ ہے اور امید کے معنی میں غلطی ہے یہ بات ضرور شرعاً ثابت و مسلم ہے کہ امید بھی ایک عبادت ہے اور امر مطلوب ہے۔

امید کی صحیح حقیقت

مگر حقیقت اسکی جمعِ اسباب ہے بعدازاں نتیجہ کی توقع نہ کہ محض توقع بلاجمعِ اسباب ۱ کیونکہ یہ تو خیالی باتیں ہیں۔

ہر آنکہ تخم بدی کشت و چشم نیکی داشت دماغ بیہودہ پخت و خیال باطل بست ۲

ایک دوسری آیت بھی اس طرز کی مدعا میں صریح ہے ان الذین امنوا والذین ھاجروا وجاھدوا فی سبیل اللّٰہ اولئک یرجون رحمۃ اللّٰہ ۳ حضور ﷺ فرماتے ہیں: الا ان سلعۃ اللہ غالیۃ الا ان سلعۃ اللہ ھی الجنۃ ۴ سن لو حق تعالیٰ کا سرمایہ بڑا گراں ہے سن لو کہ وہ سرمایہ جنت ہے پس جنت کی امید سے پہلے جنت کی قیمت بھی دیکھ لو جس کو اللہ اور رسول گراں فرما رہے ہیں، جس کے سامنے دنیا و مافیہا کو ہیچ فرماتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ تمام دنیا سے جنت کی قیمت زیادہ ہے سو ان ناتمام اعمال کو اسکی قیمت کیا کہہ سکتے ہیں ان اعمال پر اس کا مل جانا فضل ہی فضل ہے تو کیا ہم سے اتنا بھی نہ ہوگا کہ ان اعمال ہی کو ادا کرلیں۔ اتنی بڑی چیز کے واسطے جس کی قیمت تمام دنیا بھی نہیں ہوسکتی یہ اعمال کیا چیز ہیں ذرا غور اور انصاف کی ضرورت ہے۔ میری تقریر میں امید کے معنی کے متعلق غالباً شافی بیان ہو چکا البتہ یہ بات قابل انکار نہیں کہ محض ایمان پر بھی امید کا ترتب ہو سکتا ہے مگر یہ بھی ماننا پڑے گا کہ جس درجہ کی بنا ہوگی اسی درجہ کا مبنی ہوگا یعنی نفسِ ایمان پر فلاح کی امید، اگرچہ کامل نہ ہو اور ایمانِ کامل یعنی مقرون بالاعمال ۵ پر فلاح کامل کی امید۔ نکیر اس پر کیا جارہا

=اس میں سے چپکے اور علانیۃً (اللہ کے راستہ میں) خرچ کرتے ہیں، وہ ایسی تجارت کے امیدوار ہیں جو کبھی ٹھپ نہ ہوگی ۱ بغیر اسباب اختیار کئے امید رکھنا ۲ جس نے برائی کا بیج بویا اور نیکی کی امید رکھی، اس نے بے وقوفی کی تدبیر کی اور بے کار خیال جمایا ۳ حقیقۃً جو لوگ ایمان لائے ہوں اور جن لوگوں نے راہِ خدا میں ترکِ وطن کیا ہو اور جہاد کیا ہو، ایسے لوگ تو رحمتِ خداوندی کے امیدوار ہوا کرتے ہیں۔ (البقرۃ، ۲۱۸) ۴ خبردار! اللہ کا سامان مہنگا ہے، خبردار اللہ کا سامان جنت ہے ۵ وہ ایمان جس کے ساتھ اعمال بھی ہوں

ہے کہ بنا ضعیف پر کامل بنی کی امید۔ خوب سمجھ لو۔

اب سمجھئے کہ ہر چند اس آیت میں تین ہی عمل کا بیان ہے یتلون کتاب اللہ یعنی قرآن شریف کی تلاوت کرتے ہیں اور اقاموا الصلوۃ یعنی نماز پڑھتے ہیں و انفقوا یعنی مال خرچ کرتے ہیں مگر درحقیقت اس میں اشارہ ہے تمام عبادات اور شرائع کی طرف۔ بیان اسکا یہ ہے کہ عبادات دو قسم کی ہیں مالی اور بدنی اقاموا الصلوۃ میں اشارہ ہے عبادات بدنیہ کی طرف اور انفقوا میں اشارہ ہے عبادات مالیہ کی طرف اور نیز عبادات بدنیہ اور مالیہ دونوں دو قسم پر ہیں فرض اور نفل۔ آیت میں دونوں ہی داخل ہیں دیکھئے نہ صلوۃ میں قید ہے فرض کی نہ انفاق میں۔

نوافل کی فضیلت اور ترغیب

اور نوافل کو میں نے عبادت میں تصریحاً اس لئے داخل کیا ہے کہ اکثر ذہنوں میں اسکی کچھ حقیقت نہیں حالانکہ یہ غلطی ہے۔ لوگ نفل کو ایک زائد چیز سمجھتے ہیں خاص کر اہل علم اس غلطی میں زیادہ مبتلا ہیں کیونکہ طالب علموں کو شروع سے نفل کا حکم یہ بتایا جاتا ہے کہ جس کے کرنے میں ثواب ہو اور نہ کرنے میں کچھ گناہ نہ ہو۔ وہ سمجھتے ہیں کہ جب یہ بات ہے تو نفل نہ کرنے میں کیا حرج ہے یہاں تک بھی غنیمت تھا۔

اہلِ علم کی نفل کے بارے میں غلطی

مگر غضب یہ ہے کہ اسکا ترجمہ دوسرے لفظوں میں یوں کر لیا کہ نفل کوئی مہتم بالشان نہیں۔ چلئے چھٹی ہوئی گویا شریعت میں نوافل کا بیان ہی فضول ہے۔ خوب سمجھ لیجئے کہ نفل بیکار اور فضول چیز نہیں بلکہ متمم فرائض[1] ہونے کی وجہ سے ایک مہتم بالشان چیز ہے نیز ایک بڑی علامت ہے خاص محبت کی۔

میں اسکی ایک مثال دیتا ہوں فرض کرو ایک ملازم ہے جسکو کھانا پکانے کے واسطے رکھا گیا ہے اور وہ ایسا قانونی ہے کہ کھانا پکا کر چل دیتا ہے اور ایک دوسرا ملازم ہے کہ اسی کام کیلئے وہ بھی رکھا گیا ہے مگر اسکی یہ حالت ہے کہ جب کھانا پکا چکتا ہے تو آقا کو پنکھا جھلنے لگتا ہے اور بھی خدمت کر دیتا ہے ان دونوں میں کچھ فرق ہے یا نہیں؟ ضرور فرق ہے دوسرے آدمی کی قدر آقا کے دل میں یقیناً زیادہ ہو گی بلکہ اسکی ان زائد خدمتوں کی قدر بعض دفعہ اصل کام سے بھی زیادہ ہوتی ہے کیونکہ منصبی

---

[1] نوافل سے فرائض مکمل ہوتے ہیں۔

کام تو ضابطہ کی خانہ پری ہے اور نوکر سے زبردستی اور ٹھوک بجا کر لیا جاتا ہے اور یہ زائد خدمات، محبت اور خلوص کی دلیل ہیں محبت اور خلوص کا نتیجہ دوسرے کی طرف سے بھی محبت اور خلوص ہی ہوتا ہے تو اس دوسرے شخص سے آقا کو خاص محبت ہوگی اور بلفظِ دیگر یہ دوسرا نوکر محبوب ہوگا اور پہلا آدمی نوکر اور مزدور ہوگا یہ حقیقت ہے نفل کی۔

پس اسی طرح جو شخص احکام شرعی میں سے صرف فرائض کو ادا کرے، پانچ وقت کے فرض ہی پڑھے اور زکوۃ بقدر واجب ہی دیدیا کرے اور کوئی نفل نماز نہ پڑھے نہ کوئی نفل خیر خیرات کرے تو وہ ضابطہ کا نوکر ہے اس سے ٹھوک بجا کر کام لیا جائے گا اور ذرا سا بھی قصور ہوگا تو گرفت سے نہ چھوڑا جائے گا اور کسی طرح یہ نہیں کہا جائے گا کہ اسکو حق تعالی سے محبت ہے۔

کثرتِ نوافل علامتِ محبت ہے

صاحبو! محبت کی علامت سوائے اسکے کچھ نہیں ہے کہ آدمی نفل طاعات کی کثرت کرے پس نفل بھی اس مقصود کیلئے ضروری چیز ہوئی ہاں نوافل و فرائض کے درجات اس واسطے قائم کئے گئے ہیں کہ اگر کبھی دونوں میں تعارض آپڑے تو نفل کو فرض کے سامنے ترک کر دیا جائے مثلاً صبح کا وقت جا رہا ہو اور صرف اتنی گنجائش ہو کہ دو رکعت پڑھ لی جائیں تو اگر کسی کو یہ معلوم نہ ہو کہ صبح کی چار رکعتوں میں سے دو فرض ہیں اور دو غیر فرض تو ممکن ہے کہ دو سنتوں کو پہلے پڑھے اور اتنے میں وقت نکل جائے اور فرض قضاء ہو جاویں۔

اس واسطے علماء نے طاعات کے درجات کو مدوّن[1] کر دیا تاکہ ایسے وقت میں اول فرض کو ادا کیا جاوے اور قضاء کرنے کے گناہ سے آدمی بچ جائے۔ کیا اس سے کوئی یہ کہہ سکتا ہے کہ سنت فجر کوئی چیز نہیں؟ سنت فجر وہ چیز ہے جسکے واسطے حکم ہے کہ اگر گھوڑے بھی تمہارے اوپر کو اتر جائیں تب بھی اس کو مت چھوڑو۔ اب تو سمجھ میں آگیا ہوگا کہ نوافل کس درجہ کی چیز ہیں۔ میں نے یہاں بہت مختصر طور سے نوافل پر کلام کیا ہے نوافل کے فضائل سے کتابیں بھری پڑی ہیں۔

نوافل میں سب سے افضل تلاوت قرآن ہے

اب معلوم کیجئے کہ نوافل میں سے سب سے بڑھ کر تلاوتِ قرآن ہے اس طرح پر یتلون

---

[1] بیان کیا گیا

میں عبادت نفل کی طرف اشارہ ہو گیا اور اسمیں سے تلاوت کو اس لئے خاص کیا کہ نوافل میں سے یہ ایک بڑی فضیلت کی چیز ہے۔ کتاب اللہ کو پڑھنا کوئی معمولی بات نہیں۔ حق تعالی کے نزدیک بہت پسندیدہ ہے جسکا راز یہ ہے کہ یہ طبعی بات ہے کہ آدمی کو اپنا کلام سننے سے مسرت ہوتی ہے سو حق تعالی تاثر سے تو منزہ [1] ہیں لیکن انہوں نے اپنی رحمت سے ہمارے ساتھ ہمارے مذاق کے موافق معاملہ فرمایا ہے اور یہ کس قدر رحمت ہے بس جس طرح اگر ہماری تصنیف کردہ کوئی کتاب ہو اور اسکو کوئی پڑھے تو ہمکو اسکا سننا اچھا معلوم ہوتا ہے اور پڑھنے والے کے ساتھ ہم کو ایک خاص محبت ہو جاتی ہے اسی طرح حق تعالی کو تلاوت کے وقت قاری کی طرف خاص توجہ ہوتی ہے۔

حفاظ اور قراء کی فضیلت

یہاں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ حافظ و قاری حق تعالی کے ہاں کس قدر محبوب و معزز ہیں کیونکہ حق تعالی کے کلام کو پڑھنے والے اور اسکے محافظ ہیں۔ پھر جس شخص کے ساتھ حق تعالی کو محبت ہو اسکی عظمت کا کیا ٹھکانا ایک دنیا کا حاکم اگر کسی سے بات کر لیتا ہے تو اس کے دماغ آسمان پر پہنچ جاتے ہیں اور دیکھنے والوں کی نظر میں اسکی عظمت ہو جاتی ہے، کہتے ہیں یہ شخص حاکم کا منہ لگا ہوا ہے حالانکہ دنیا کیا اور اسکی حکومت ہی کیا؟ خدا تعالی کی شان تو بہت ارفع [2] ہے سو جس شخص کی خدا تعالی عظمت کریں اسکی عزت کا کیا ٹھکانا۔

صاحبو! سن لو اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ حفظ قرآن کتنی بڑی دولت ہے اسی طرح قراءت گو حفظ سے نہ ہو، خدا تعالی کے ساتھ ہم کلامی ہے۔ جس شخص کو حق تعالی سے کلام کرنے کی دولت نصیب ہو سکتی ہو اسکو تو کسی طرح ایسے موقع سے چوکنا زیبا نہیں اور اگر چوک گیا تو بڑے خسارے میں رہا۔ دیکھو کتنے کتنے سفر قطع کرنے پڑتے ہیں اور کتنا مال صرف ہوتا ہے اور کتنا وقت لگتا ہے جب جا کر ایک ادنی سے بادشاہ سے بات کرنا نصیب ہوتی ہے اور حق تعالی کے یہاں کسی وقت بندش نہیں کی۔

تلاوت قرآن حق تعالی سے ہمکلامی ہے

جس وقت جی چاہے حق تعالی سے بات چیت کر سکتا ہے پھر بادشاہوں سے بات چیت کرنے میں کس قدر بکھیڑے ہیں ذرا سی کوتاہی رہ جائے تو اسکا نتیجہ ناخوشی ہے اور یہاں کچھ بھی نہیں

---

[1]۔ پاک [2]۔ بالا و برتر

بلکہ کوئی شخص غلط بھی پڑھتا ہو تو اس کو رد نہیں کرتے قاری تو قاری ہیں ہی، کوئی الٹا سیدھا بھی پڑھے تو فی حرف دس نیکیوں کا وعدہ ہے۔

اٹک اٹک کر پڑھنے میں دو گنے ثواب کا وعدہ ہے

بلکہ یہاں تک بھی آیا ہے کہ جو شخص اٹک اٹک کر بھی پڑھے تو اسکے واسطے دو گنا ثواب ہے کیونکہ ایک تو پڑھنے کا ثواب، دوسرے اس مجاہدہ[۱] کا ثواب کہ اس سے قرآن چلتا نہیں اور وہ نفس پر جبر کر کے پڑھے جاتا ہے اور اصل اسکی وہی ہے جو اوپر مذکور ہوئی کہ قرآن بوجہ کلامِ حق ہونے کے حق تعالیٰ کو پسند ہے. جس طرح آپ کا کوئی فارسی کا دیوان ہو اور ایک ان پڑھ اسے پڑھے جس سے اس کا تلفظ بھی صحیح نہ ہو سکے مگر اس کی یہی وقعت آپ کے ذہن میں ہو جاتی ہے کہ اس کو ہم سے محبت ہے اور ہمارے کلام کی قدر کرتا ہے گو اس سے چلتا نہیں مگر بلا ذوق کے بھی پڑھ رہا ہے اسی طرح حق تعالیٰ کے یہاں قرآن کے پڑھنے والے کی عزت ہے یہاں سے تلاوت قرآن کی فضیلت سمجھ میں آ گئی ہو گی اور یہ اعتراض بھی رفع ہو گیا ہو گا جو آجکل تعلیم یافتوں کی زبان پر ہے جو بچوں کو قرآن نہیں پڑھواتے، کہتے ہیں طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ پڑھنا تو وہ ہے جو معنی سمجھ کر ہو بچوں کو اتنی سمجھ نہیں۔ پھر پڑھنے سے کیا فائدہ۔

اسکا جواب کہ بچوں کو طوطے کی طرح قرآن رٹوانے سے کیا فائدہ؟

خدا رحم کرے اے معترض! میں پوچھتا ہوں فائدہ کسے کہتے ہیں؟ کیا سارا فائدہ سمجھنے ہی میں منحصر ہے ہر گز نہیں بلکہ سمجھنا بھی ایک فائدہ ہے اور مصنف کو خوش کرنا بھی ایک فائدہ ہے بلکہ سمجھنے کا اخیر انجام بھی مصنف کو خوش کرنا ہی ہے کیونکہ طاعت میں غرض خوشنودیٔ حق تعالیٰ کے سوا اور کچھ بھی نہیں۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ بے سمجھے پڑھنے سے کیا فائدہ ان سے پوچھنا چاہئے کہ سمجھ کر پڑھنے سے کیا فائدہ۔ اسکا جواب شاید یہ دیں گے کہ سمجھ کر پڑھا جائے تو عمل ہو گا پھر ہم کہیں گے کہ عمل سے کیا فائدہ اخیر میں دو گھنٹے کے بعد یا چار گھنٹے کے بعد یہی کہنا پڑے گا کہ اس سے حق تعالیٰ خوش ہوں گے۔

آپ نے اتنی دیر کے بعد یہ نتیجہ نکالا اور ہم نے شروع سے یہی بات کہی تھی۔ غرض جو ہم نے کہہ دیا وہی آپ کو کہنا پڑا۔ انجام تو آپ کا بھی وہی نکلا۔ حیرت کی بات ہے کہ شروع سے آپ کی سمجھ

---

[۱] محنت کوشش

میں نہیں آیا اور گھوم گھام کر وہیں آئے کہ فائدہ کی حقیقت حق تعالی کو خوش کرنا ہے۔

پس جبکہ ہم خدا اور اس کے رسول کے کلام سے ثابت کر رہے ہیں کہ قرآن کا ہر طرح پڑھنا خوشنودی کا موجب ہے پھر اس سوال کا کیا معنی کہ بلا سمجھے پڑھنے کا کیا فائدہ اور دیکھئے اقلیدس[۱] مدرسوں میں پڑھائی جاتی ہے بعض طالب علموں کو اس سے مناسبت نہیں ہوتی اور بالکل نہیں سمجھتے مگر ایسا ہوا ہے کہ امتحان میں اقلیدس کے پرچہ میں وہی عبارت لکھ دی جو بلا سمجھے رٹ لی تھی اور پاس ہو گیا۔ تعجب کی بات ہے کہ اقلیدس کی عبارت کا رٹنا تو مفید ہو اور کتاب اللہ کا رٹنا مفید نہ ہو اور اسکی نسبت یہ کہا جائے کہ طوطے کی طرح رٹنا دماغ کو خراب کرنا ہے۔ صاحبو! اپنے دماغ کو درست کیجئے کہ یہ باتیں خللِ دماغ کی ہیں یا نہیں۔ یہ تو ضابطہ کی تقریر تھی۔

اہل درد کیلئے دوسرا جواب

اب دوسرے طریق سے خاص انکو خطاب کیا جاتا ہے جو اہل درد ہیں ان سے پوچھا جاتا ہے کہ کیا اللہ کا نام کسی عوض ملنے کے واسطے لیتے ہو۔ اگر کسی فائدہ کی تلاش ہے تو اس سے بڑھ کر کیا ہوگا کہ محبوب کو خوش کر رہے ہو جو لوگ اہل درد نہیں وہ اگر حق تعالی کو خوش بھی کرتے ہیں تو اس نیت سے کہ ہم کو کچھ ملے گا اگر آپ کو بھی کچھ ملنے ہی کی خواہش ہے تو گویا آپ کے یہاں بھی سارا دھندا پیٹ ہی کے واسطے ہے پھر اس حالت میں بندگی کا کیوں دعوی کرتے ہو بس آج سے بندۂ خدا ہونے کا نام نہ لیجئے، اپنے کو بندۂ شکم[۲] کہیے۔

یہ تو مطلق عوض[۳] کے انتظار میں کلام تھا مگر آجکل تو اس سے بڑھ کر مذاق عام ہو گیا ہے کہ فائدہ وعوض کو بھی منحصر رکھا ہے محض مال کے ملنے میں۔ کسب دنیا تو مال کیلئے تھا ہی مگر اب خدا کا نام بھی مال کیلئے ہو گیا اور جن لوگوں سے آپ نے یہ مذاق سیکھا ہے ان میں پھر بھی کچھ انصاف اور حقیقت شناسی کا مادہ موجود ہے اور اچھی بات کی قدر کرتے ہیں۔ ایک انگریز جنٹ سے انہی کی درخواست پر میری ملاقات ہوئی تھی انہوں نے سنا تھا کہ میں نے ایک تفسیر لکھی ہے پوچھا آپ نے قرآن شریف کی تفسیر لکھی ہے (شریف بھی کہا) میں نے کہا ہاں کہا آپ کو کتنا روپیہ ملا؟ میں نے کہا ایک پیسہ بھی نہیں کہا پھر کیا فائدہ ہوا اس کتاب کے لکھنے سے میں نے کہا مجھکو دو قسم کے فائدے ہوئے ایک دنیا کا اور ایک آخرت کا دنیا کا تو یہ کہ قوم کے ہاتھ میں ان کے کام کی کتاب آ گئی جس کا دیکھنا ان کیلئے موجب حظ[۴]

---

[۱] جیومیٹری کی ایک پرانی کتاب [۲] پیٹ کا بندہ [۳] عام بدلہ [۴] لطف کا باعث ہوگا

ہو گیا اور اس کو دیکھ کر میں مسرور ہوں گا اور آخرت کا فائدہ وہ ہے جسکو خوشنودی حکام کہتے ہیں اس کام سے سب حکام کے حاکم یعنی احکم الحاکمین کی خوشنودی کی امید ہے یعنی خدا تعالیٰ کی خوشنودی، اس بات سے اسپر بڑا اثر ہوا اور اس بات کی اس نے بہت قدر کی۔

دیکھئے جو دنیا طلبی میں امام ہیں ان کے نزدیک اچھی بات کی پھر بھی قدر ہے اور جوان کے مقلد ہیں ان کے نزدیک قرآن کا پڑھنا طوطے کی طرح رٹنا اور فضول ہے۔ افسوس لوگوں نے دین کو تو بہت دور ہی پھینک دیا ہے، دین کا فائدہ تو فائدہ کے افراد ہی میں سے نہیں رہا[۱] اور غیر قوموں کو دیکھئے کہ انکو اپنے مذہب کی کتنی قدر ہے وہ مذہب کیلئے کتنی کوشش کرتے ہیں حالانکہ وہ باطل ہے۔ اگر مسلمان ان سے آدھی بھی کوشش کریں تو بہت کچھ فائدہ ہو سکتا ہے کیونکہ وہ اپنی کوششوں سے ایک باطل بات کو حق کرنا چاہتے ہیں جو کبھی نہیں ہو سکتی اور مسلمان اگر کوشش کریں تو وہ کوشش حق کیلئے ہو گی۔

دونوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص ایک مردہ لاش کو کھڑا کرنے کی کوشش کرے، وہ اگر بہت کوشش کرے گا اور دوسروں کو ساتھ ملا لیگا تو اس سے زیادہ نہ ہوگا کہ وہ لاش درخت کے تنے کی طرح کھڑی ہو جائے گی لیکن جس وقت ذرا اس سے ہاتھ ہٹے گا فوراً گر جائے گی برخلاف اسکے کہ ایک دوسرا شخص ہے کہ وہ ایک زندہ اور تندرست شخص کو بیٹھے یا لیٹے سے کھڑا کرنا چاہتا ہو اس کیلئے ذرا سہارے کی ضرورت ہے۔ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ دین مردہ ہو گیا۔ صاحبو! دین نہ کبھی مردہ ہوا، نہ مردہ ہے، نہ مردہ ہوگا۔ ہاں کبھی وہ خود اپنے خدام و اعوان[۲] کا امتحان لینے کیلئے بیٹھا یا لیٹا بن جاتا ہے اس کیلئے ذرا سے سہارے کی ضرورت ہے وہ خود اپنی قوت سے کھڑا ہو جائیگا نہ کہ آپ کی قوت سے، البتہ کھڑا ہوگا آپ کا امتحان لینے کے بعد۔ جو جو شخص اسکی مدد کرے گا وہ اپنے واسطے کامیابی حاصل کرے گا نہ کہ اسپر کچھ احسان ہوگا کیونکہ وہ محتاج نہیں، اس بہانہ سے تمکو فائدہ پہچانا منظور ہے۔

مگر اب تو مصیبت ہے کہ سب کا مذاق روپیہ میں منحصر ہو گیا ہے خدا تعالیٰ کے کام کو بھی مفید جب ہی کہا جاتا ہے جب روپیہ ملے۔

ایک اہلکار نمازی کا قصہ

ایک عہدہ دار شخص بے نمازی تھا اور بیوی اسکی نمازی تھی بیوی سے کہنے لگا تو اتنے دنوں سے

---

[۱] یعنی یہ دنیا دار اس کو فائدہ ہی نہیں سمجھتے [۲] مددگار

نماز پڑھتی ہے تجھکو کیا فائدہ ہوا؟ کون سی دولت مل گئی؟ گویا فائدہ دولت اور روپیہ ہی کا نام ہے جیسے ایک صاحب کو یہ فائدہ بھی ملا کرتا تھا ایک اہلکار ایسے پکے نمازی تھے کہ صبح کی نماز پڑھ کر اشراق تک مصلی پر بیٹھے رہتے اور کسی سے نہ بولتے کیونکہ پیر صاحب نے وظیفہ میں بولنے کو منع کر دیا تھا۔ اہل مقدمہ اسی وقت میں آتے اور رشوتیں پیش کرتے، یہ زبان سے تو کچھ نہ کہتے کیونکہ وظیفہ میں خلل پڑے گا۔ انگلیوں سے اشارہ کرتے، دوسولوں گا یا پانچ سولوں گا۔ لوگ کہتے سولے لیجئے، یہ اشارہ سے کہتے نہیں اور دو انگلیاں اٹھا دیتے کہ دو سو ہی لوں گا۔ اہل غرض مجبور ہو کر وہی دے دیتے پھر آپ اشارہ کرتے کہ مصلی کے نیچے رکھدو، بس ان لوگوں کے نزدیک یہ ہے فائدہ۔ بس اب تو روپیہ ہی کچھ چیز رہ گیا ہے اسکے سامنے نہ حرام کچھ ہے، نہ خبیث کوئی چیز ہے۔ بس جس طرح ہو سکے روپیہ آنا چاہیے نماز بھی جب ہی پڑھیں گے جب روپیہ کی امید ہو۔

سودا شاعر اور ان کی بیوی کا قصہ

سودا شاعر کی بیوی نمازی تھی سودا نے کہا کہ تو نماز کیوں پڑھا کرتی ہے تجھے اس سے کیا ملتا ہے؟ اس نے کہا ہمیں جنت ملے گی۔ کہنے لگا جا بیوقوف تو وہاں بھی ان غریب، مسکین، ملانوں کے ساتھ ہی رہے گی اور ہم جہنم میں جائیں گے جہاں بڑے بڑے سلاطین اور امراء ورؤساءا ہوں گے جیسے فرعون، ہامان، شداد، نمرود، قارون وغیرہ۔

اس مسخرہ نے شاید یہ سمجھا کہ مساکین جنت میں جا کر بھی مساکین ہی ہوں گے اور یہ سلاطین دوزخ میں بھی بادشاہ ہی رہیں گے حالانکہ مساکین جنت میں بادشاہی کریں گے اور سلاطین، دوزخ مین بھنگی چماروں سے بھی زیادہ ذلیل وخوار ہوں گے۔ خیر یہ تو ایمان کے خلاف باتیں ہیں ایسے خیال کے تو سب مسلمان نہیں ہوتے مگر شکایت اتنی ضرور ہے کہ بدوں مال کے کسی فائدہ کو آجکل فائدہ ہی نہیں سمجھتے۔ حق تعالی سے بھی مال ہی کے واسطے تعلق رکھنا چاہتے ہیں حالانکہ حق تعالی کے ساتھ وہ تعلق ہونا چاہئے جو اور کسی کے ساتھ نہ ہو سکے۔ دینے لینے کا تعلق تو انسانوں سے بھی رکھا جاتا ہے کہ جس نے چار پیسے دیے اس کا کام کر دیا اگر یہی تعلق حق تعالی کے ساتھ بھی رکھا تو خدا اور بندے میں تم نے کیا فرق کیا گو حق تعالی بہت کچھ دیں گے لیکن بندہ کو بحیثیت بندہ ہونے کے حق تعالی کی ذات سے تعلق رکھنا چاہیے۔

غلام کو کیا حق حاصل ہے کہ آقا سے اپنی خدمت پر کچھ معاوضہ کا مطالبہ کرے؟ حق تعالی کو تو

ا بادشاہ اور حکام

یہ حق حاصل تھا کہ بندہ سے سب کچھ لیکر، اسکا مال اور اولاد سب چیزیں لے کر بھی ایک سجدہ کی اجازت دیدیتے تو غنیمت تھا، نہ کہ اور اپنے پاس سے دیکر اور وہ بھی کیا چیز دیکر جسکے ایک ادنی سے جزو کی قیمت دنیا و مافیہا نہیں ہوسکتی سجدہ کا مطالبہ فرماتے ہیں واللہ مرجانے کی بات ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم کو محبت نہیں ورنہ خدا تعالی کا نام لینے کو باعثِ فخر اور خوبی سمجھتے۔ یہ وہی بات ہے کہ گدھے کو دیا تھا نمک، اس نے کہا کہ میری آنکھیں پھوڑ دیں۔ تلاوتِ قرآن حق تعالی کے ساتھ ہمکلامی ہے اگر کچھ پاس سے دیکر بھی اس کی اجازت ہوجاتی تو غنیمت تھا، نہ کہ لوگ پوچھتے ہیں کیا ملیگا؟ اچھا ملنے کی بھی سن لیجئے۔

تلاوتِ قرآن کا ثواب

حدیث شریف میں وعدہ آیا ہے بکل حرف حسنة والحسنة بعشر امثالها یعنی ایک ایک حرف پڑھنے پر ایک ایک نیکی ملے گی اور نیکی کا عوض دس گنا ملتا ہے۔ دیکھئے کس قدر اجر ہے اب تو فائدہ بھی معلوم ہوگیا اور فائدہ بھی کیسا بے حد و بے حساب کوئی چھوٹی سے چھوٹی سورت پڑھئے تو اتنا ثواب ہوجائے کہ اٹھائے نہ اٹھے۔

ہاں شاید کوئی یہ کہے کہ نیکی لیکر کیا کریں گے اور نیکی سے کیا فائدہ؟ (کیونکہ فائدہ یہ تو آجکل روپیہ میں منحصر ہے) صاحبو! نیکی کا فائدہ وہاں معلوم ہوگا جہاں آپکا یہ روپیہ پیسا نہیں چلتا بلکہ وہاں نیکی ہی کا سکہ چلتا ہے شاید ابھی سمجھ میں نہ آیا ہو۔

میں اسکی شرح کئے دیتا ہوں۔ فرض کیجئے کہ ایک شخص کو مزدوری میں ایک سکہ دوسرے ملک کا دیا جائے جسکو یہ پہچانتا بھی نہیں اور اسکے ملک میں وہ سکہ چلتا بھی نہیں۔ ہاں وہ اس ملک کا سکہ ہے جہاں اسکو قریب ہی جانا ہے تو کیا وہ سکہ دیدینا، یہ اجرت دینا نہیں ہے اور اگر وہ مزدور یہ کہے کہ اس ملک کا سکہ کیوں نہیں دیا؟ اور وہ یہ جواب دے کہ بیوقوف تجھے فلاں شہر میں جانا پڑے گا یہ سکہ تجھے وہاں کام دے گا تو یہ کہنا اسکا بجا ہے یا بیجا؟ اور اس صورت میں اتنا اور فرض کر لیجئے کہ اس ملک میں جہاں اس مزدور نے اس وقت کام کیا ہے اسکو چند منٹ ہی رہنا ہے اور اس دوسرے ملک میں جس کی تیاری ہے، مدتوں رہنا ہوگا۔ اگر اس حالت میں اس نے دوسرے ملک کے سکہ کو منظور نہ کیا اور اسی ملک کے سکے ساتھ لے لئے تو چاہے گدھا بھر بوجھ بھی باندھ کر کیوں نہ لے جائے وہ وہاں کچھ کارآمد نہ ہوں گے اور وہاں جا کر یہ بھوکوں ہی مرے گا اور بوجھ میں مفت مرا، یہ الگ رہا۔

دنیا کا سکہ اموال ہیں اور آخرت کا سکہ اعمال

اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایک تو ملک دنیا کا ہے اور دوسرا ملک آخرت کا ہے۔ دنیا کا سکہ اموال ہیں اور آخرت کا سکہ اعمال ہیں، جسکا ترجمہ نیکی ہے۔ جس کے پاس نیکی نہیں ہے وہ وہاں مفلس اور بے کس اور بے بس ہے۔ چاہے اموال اس کے پاس قارون سے بھی زیادہ کیوں نہ ہوں۔ وہاں جا کر اسکی قدر معلوم ہوگی کہ نیکی سے کیا فائدہ؟ حدیث شریف میں ہے کہ لوگ ایک ایک نیکی کے بدلے جنت سے اٹک جاویں گے اور نجات نہ ہو سکے گی۔

ایک روایت میں ہے کہ ایک شخص ہوگا جسکی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ حکم ہوگا رہائی چاہتے ہو تو جس طرح ہو سکے نیکیوں کا پلہ بھاری کرو اگر ایک نیکی بھی اور ہو جائے تو پلہ بھاری ہو سکتا ہے۔ وہ بیچارہ اہل محشر سے اپنے شناساؤں سے اور اعزاء و اقارب سے اور جس سے بھی ہو سکے گا سوال کرے گا لیکن کہیں سے بھی سوائے نفی کے جواب نہ ملے گا کیونکہ ہر شخص کو اپنی اپنی پڑی ہوگی۔ ہر شخص کو یہ خیال ہو سکتا ہے کہ شاید ہمارے حساب میں بھی ایک نیکی کی کمی ہو جاوے اور اسکی بدولت ہم اٹکے پڑے رہیں۔ غرض کوئی نہ دے گا لیکن ایک شخص ایسا ہوگا جسکے پاس تمام برائیاں ہی برائیاں ہونگی اور نیکی صرف ایک ہوگی وہ کہے گا کہ بھائی جب تو اتنی نیکیاں کر کے صرف ایک نیکی کی کمی کی وجہ سے جنت میں جانے سے روک دیا گیا تو میرے پاس تو بجز ایک نیکی کے سب بدیاں ہی بدیاں ہیں میں تو دوزخ میں یقیناً ہی جاؤں گا کیونکہ ایک نیکی میری اتنی برائیوں کا کہاں تک مقابلہ کرے گی لہذا مجھ سے تو یہ بیکار ہی ہے، لے تو ہی لیجا میرا نہ سہی تیرا ہی کام بن جائے بس اس ایک نیکی سے حسنات[1] کو غلبہ ہو جائیگا۔

اب رحمتِ الٰہی دیکھئے کہ اس شخص کو بلایا جائیگا جس نے یہ نیکی دی تھی اور اس سے سوال ہوگا کہ تم نے اپنی نیکی دوسروں کو کیوں دیدی اب تمہارے پاس تو بجز گناہوں کے کچھ بھی نہ رہا۔ وہ کہے گا کہ الٰہی میں نے یہ دیکھ کر کہ ایک شخص کے پاس ہزاروں نیکیاں تھیں مگر ایک کی کمی کی وجہ سے وہ جنت میں نہ جا سکا، یہ سمجھ لیا کہ میرے پاس تو ایک ہی نیکی ہے قانون کے موافق میری مغفرت نہیں ہو سکتی اس لئے میں نے دوسرے کو اپنی نیکی دے دی کہ وہ تو بخشدیا جائے حکم ہوگا کہ ہم نے تجھ کو بھی بخشا۔ اسکو قانون سے بخشا اور تجھ کو فضل سے بخشا۔ تو نے اس شخص پر رحم کیا، ہم نے تجھ پر رحم کیا۔

نیکی کی قدر وہاں ہوگی۔ صاحبو! نیکی وہاں کا سکہ ہے تو وہیں چلے گا بھی اور ایسے وقت میں

---

[1] نیکیوں

کام دے گا جب کہ کوئی سکہ بھی کام نہ دے گا لفظ الحمد میں پانچ حرف ہیں، اتنا چھوٹا سا لفظ پڑھنے سے پانچ نیکیاں ملتی ہیں پھران پانچ کی پچاس ہو جاتی ہیں سووہ فائدہ یہ ہے۔اب تو سمجھ میں آ گیا ہوگا کہ تلاوتِ قرآن کا فائدہ کچھ معانی سمجھنے ہی میں منحصر نہیں جیسا کہ آپ نے سمجھ رکھا ہے اور اگر منحصر ہے بھی تو معنی سمجھنے سے کس نے منع کیا ہے؟عربی پڑھواور سمجھو۔ہم یہ کب کہتے ہیں کہ تم صرف طوطے ہی کی طرح پڑھو بلکہ یہ کہتے ہیں کہ طوطے کی طرح بھی پڑھواور سمجھ کر بھی پڑھو۔

بعض لوگ قرآن کی تعلیم بالکل اڑانا چاہتے ہیں

افسوس تو یہ ہے کہ جولوگ بچوں کو قرآن پڑھنے پر اعتراض کرتے ہیں، ان لوگوں کی نیت طوطے کی طرح رٹنے سے منع کرنے میں یہ نہیں کہ سمجھنے کی کوشش کرو بلکہ مطلقاً قرآن کی تعلیم کو اڑانا مقصود ہے۔ ریاست رامپور میں کسی کا لڑکا قرآن پڑھتا تھا دوسرے شخص نے کہا تم اپنے بچے کو انگریزی اسکول میں داخل نہیں کرتے؟ اس نے کہا قرآن پڑھ لے تو داخل کر دونگا۔پوچھا کتنا قرآن رہا ہے؟ کہا آدھا رہا ہے تو وہ کہتا ہے کہ میاں اتنے دن تو خراب ہوئے، اگلے دن بھی کیوں خراب کرتے ہو (نعوذ باللہ منہ) بھلا یہ کیا اسلام ہے کہ ایک شخص مسلمان کہلا کر قران کی تعلیم میں مشغول ہونے کو وقت کا خراب کرنا بتلائے؟ یہ کتنا سخت کلمہ ہے جس سے ایمان کی جڑ ہی کھوکھلی ہوئی جاتی ہے۔

اسی طرح ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ آپ نے بھتیجوں کو کیا پڑھایا؟ میں نے کہا ایک میرے پاس علم دین پڑھتا ہے، باقی اپنے والد کے پاس ہیں وہ انگریزی میں مشغول ہیں۔ کہنے لگے اس ایک کے واسطے آپ نے ترقی کی فکر نہیں کی؟ آپ کے بھائی تو بڑے صاحبِ استطاعت ہیں۔ اسکواعلی سے اعلی تعلیم دلا سکتے ہیں اور عربی پڑھنے کیلئے تو دیو بند کے طالب علم کافی ہیں۔ میں نے کہا سبحان اللہ آپ لوگوں نے زبانی دعووں سے تو ہمدردی کا بڑا غل مچا رکھا ہے مگر قوم کے ساتھ یہ کیسی آپ کی ہمدردی ہے کہ غریبوں کیلئے تو آپ ترقی نہیں چاہتے وہ تو دیو بند میں ادنی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور امیروں کیلئے ترقی چاہتے ہیں کیا دیو بند کے طالبعلم قوم میں نہیں؟ اگر ترقی اچھی چیز ہے تو دیو بند کے طالبعلموں کے متعلق بھی آپ نے یہی رائے کیوں نہیں دی کہ علم دین چھوڑ کر وہ بھی ترقی کی فکر میں رہیں اور اگر ترقی بری چیز ہے تو میرے بھتیجے کیلئے کیوں پسند کی جاتی ہے۔

مپسند بر دیگر کساں چیزے کہ داری ناپسند[۱]

[۱]۔ دوسروں کیلئے وہ چیز پسند نہ کرو جسے خود ناپسند کرتے ہو۔

یہ کیا انصاف ہے کہ آپ کے نزدیک پستی کیلئے تو دیو بند کے طالبعلم رہ گئے ہیں اور عیش و آسائش کیلئے آپ لوگ۔

افسوس عقل اور ہمدردی کا تقاضا تو یہ تھا کہ آپ کی رائے اس کے برعکس ہوتی کیونکہ جن لوگوں کو (جیسے کہ آپ) دنیا بقدرِ ضرورت حاصل ہے انکو علمِ دین میں زیادہ حصہ لینا چاہیے تھا کیونکہ دنیا تو حاصل ہی ہے اور جن کے پاس دنیا بقدرِ ضرورت بھی نہیں (جیسے دیو بند کے طالبعلم) انکو ترقی دنیا کی ضرورت تھی مگر ان کیلئے آپ یہ رائے دیتے ہیں کہ وہ ترقی نہ کریں پس آپ ہی ترقی کرتے رہیں آپ کیلئے علم دین کی کچھ ضرورت نہیں؟ کیوں صاحب اس کیلئے دیو بند کے طالبعلم ہی کیوں کافی ہیں کیا دین فقط ان ہی کا ہے آپ کا دین نہیں؟ آپ کے ذمہ دین کا کوئی حق نہیں؟ مجھے سمجھایئے تو کہ اس جملہ کا کیا مطلب ہے کہ عربی پڑھنے کیلئے دیو بند کے طالب علم بہت کافی ہیں بس اسکا کچھ جواب نہ تھا یہ عجیب رائے ہے۔

افسوس! امراء کو دین سے ایسا بعد ہو گیا ہے کہ دین میں کچھ بھی حصہ لینا نہیں چاہتے حالانکہ دین مسلمانوں کی مشترکہ جائیداد ہے مگر انہوں نے اس میں سے اپنا حصہ چھوڑ دیا ہے۔ پس سہارنپور اور دیو بند کے مولوی ہی سب لے لیں۔ ان کے نزدیک دین تو ملانوں ہی کا ہے گویا یہ لوگ دین کو اپنا نہیں سمجھتے مگر مہربانی کر کے یہ لوگ اس کا بھی وعدہ کر لیں کہ جب جنت سامنے آئے گی تو اس کو بھی خالص مولویوں کیلئے ہی چھوڑ دیں گے مگر یہ تو ہو ہی نہیں سکتا۔ پھر تعجب ہے کہ جنت کیلئے تو مدعی بنتے ہیں اور اسبابِ جنت مولویوں کے حوالہ کرتے ہیں۔

اور اگر کوئی شخص ایسا دلیر ہو جو کہ منہ پھاڑ کر یہ بھی کہہ دے کہ صاحب مجھے جنت میں جانا بھی منظور نہیں تو اس سے ہم اس طرح خطاب نہیں کریں گے کیونکہ وہ تو مسلمانوں کی قوم سے خارج ہے۔ اس سے ہم دوسری طرح خطاب کریں گے کیونکہ اسکو تو جنت و نار کے وجود ہی میں شک ہے باقی جسکو جنت دوزخ کے وجود کا یقین ہو وہ ہرگز یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا کہ مجھے جنت لینا منظور نہیں، دوزخ ہی منظور ہے ایک انگارا بدن پر گر جائے تو میاں ناچنے لگیں گے اور جہنم میں جانا منظور کرتے ہیں۔ ہاں جنت و نار[۱] کے وجود ہی میں شک ہو تو جتنی چاہو، باتیں بنا لو مگر ایسا شخص تو مسلمان ہی نہیں۔ اسکو تو اول مسلمان بنانا چاہیے جب وہ جنت و نار کا یقین کر کے ہمارے زمرہ میں شامل ہو

---

[۱] جہنم

جائے گا۔ پھر اس کے سامنے وہی بات کی جائے گی جو اوپر بیان ہوئی کہ جنت و نار کے ماننے کے بعد یہ کیسے جائز ہے کہ اس کے موجبات کو اختیار نہ کیا جاوے۔

بات یہ ہے کہ لوگوں میں دین کا شوق نہیں اور کسی کو ہے بھی تو ایک غلطی کے ساتھ، وہ یہ کہ علم حاصل نہیں کرتے۔ بڑی دوڑ یہ ہے کہ قرآن کا ترجمہ دیکھ لیا کیونکہ قرآن ہی اصل الاصول دین کا ہے۔ میں کہتا ہوں کیا کسی فن کی اعلیٰ درجہ کی کتاب کا لفظی ترجمہ دیکھنے سے وہ فن آجاتا ہے؟ ڈاکٹری یا طب تو اس طرح حاصل کر لیجئے ہم جب جانیں۔ پھر ترجموں میں سے بھی کون سے ترجمے انتخاب کئے ہیں، وہ نئے ترجمے جو واقع میں ترجمے نہیں بلکہ تحریف ہیں اور اگر ان سے منع کیا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ دین سے منع کرتے ہیں اچھے اچھے سمجھدار لوگ اس غلطی میں مبتلاء ہیں۔ کہتے ہیں میاں ترجمہ دیکھنے دو، آخر تو قرآن ہی کا ترجمہ ہے۔ کچھ دین کا فائدہ ہوگا اور یہ نئے ترجمے نئی عبارت کی وجہ سے ذرا دلچسپ ہیں ان کو لوگ شوق سے دیکھ لیتے ہیں تو ان سے کیوں روکتے ہو، ان کی دلچسپی ذریعہ ہے دین سے لگاؤ پیدا ہونے کا۔

میں کہتا ہوں بد دینی کو دین کا ذریعہ بنانا کیسے جائز ہے؟ دیکھئے اگر کوئی شخص مسجد میں ناچ کرائے اس خیال سے کہ اسی کے ذریعہ سے لوگ جمع ہو جائیں گے تو کیا یہ جائز ہے؟ آجکل کے تعلیم یافتہ کہتے ہیں کہ جب سے یہ نئے ترجمے ہوئے ہیں لوگ قرآن کو ترجمہ کے ساتھ پڑھنے لگے ہیں پہلے تو کوئی ترجمہ جانتا بھی نہ تھا۔

غلط ترجمے پڑھنا بڑا گناہ ہے

میں کہتا ہوں ناچ کرانے اور غلط ترجمہ پڑھنے میں کیا فرق ہے وہ بھی گناہ ہے اور یہ بھی گناہ لہذا اس کا فتوی دیجئے کہ مسجد وغیرہ میں پانچوں وقت ناچ ہوا کرے۔ اس سے یہ فائدہ ہوگا کہ لوگ آتو جایا کریں گے جیسے کہ غلط ترجموں سے یہ فائدہ ہوا کہ لوگ ترجمہ دیکھنے تو لگے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ہے کیونکہ ناچ کو جس چیز کا ذریعہ بنایا وہ دین تو ہے یعنی نماز اور غلط ترجمہ جس چیز کا ذریعہ بنا ہے وہ تو دین ہی نہیں یعنی عقائد فاسدہ اور علوم ضارہ۔[1]

علم دین کوئی کھیل نہیں ہے

خوب سمجھ لیجئے کہ علم دین کوئی کھیل نہیں جو تحصیلداری یا ڈپٹی کلکٹری پاس کرنے سے ترجمہ

---

[1] یعنی غلط عقائد اور نقصان دہ علوم

وتفسیر کا حق حاصل ہو جائے۔ پھر ایسے لوگوں کو دین میں ہاتھ ڈالنے کا کیا حق ہے اور ان کے ترجے کیونکر معتبر ہو سکتے ہیں۔ صاحبو! دین کیلئے تو محض دین کا ہو کر پچاس پچاس برس محنت کی جائے تب جا کر کہیں حاصل ہوتا ہے۔

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند![1]

کیا غضب ہے کہ ہر کام کیلئے تو اسکا ماہر تلاش کیا جاتا ہے۔ ایک چارپائی کا ڈھانچا بھی درست کرانا ہو تو اس بڑھئی کو تلاش کیا جاتا ہے جو اس کام کا مشاق اور مشہور ہو اور دین کیلئے اسکی بھی ضرورت نہیں کہ وہ عالمِ دین ہو اور کتابیں پڑھی ہوں۔ بس اس کیلئے انگریزی پڑھنے والے اور ڈپٹی کلکٹری کرنے والے بھی کافی ہیں اور غضب ہے کہ ان کے قول کو ماہرین کے قول پر ترجیح دی جاتی ہے اور یہ شخص علماء کی غلطی نکالنے کیلئے تیار ہو جاتا ہے اور احکام خداوندی میں اپنی رائے سے ترمیم کرتا ہے۔

بھلا انصاف سے کہیے کہ میں اگر فن زراعت میں غلطی نکالوں تو یہ خلل دماغ ہوگا یا نہیں؟ پھر علم دین نہ جاننے والے علماء کی رائے میں غلطی کیسے نکالتے ہیں؟ آجکل تو تعلیم کا بڑا چرچا ہے، ہر کام کی تعلیم دی جاتی ہے ایک انجن کی ڈرائیوری بلا تعلیم نہیں ملتی۔ حیرت کی بات ہے کہ ان معمولی کاموں کیلئے تو لیاقت کی ضرورت ہو اور خدائی پارلیمنٹ کا ممبر بننے کیلئے کسی لیاقت کی ضرورت نہ ہو۔ آرزو میخواہ لیک اندازہ خواہ۔ حوصلہ بڑھایئے لیکن حد کے اندر۔

اس کا جواب کہ سود کیوں حرام ہے

مجھ سے ایک دفعہ پوچھا گیا کہ سود کیوں حرام ہے؟ میں نے کہا اس واسطے کہ حق تعالی نے اس کو حرام کیا ہے۔ کہا حق تعالی نے کیوں حرام کیا ہے؟ میں نے کہا میں اس وقت مشورہ میں شریک نہ تھا جو وجہ پوچھتا اور اگر شریک ہوتا تب بھی یہی کہتا جو آپ لوگ حکام کے مشوروں میں دن رات کہا کرتے ہیں کہ جو حضور کی رائے ہو شاید یہ بھی کہہ دیتا کہ مسلمانوں پر ایک وقت افلاس کا آنے والا ہے لہذا اسکو حرام نہ کیجئے مگر مجھ سے کسی نے پوچھا ہی نہیں۔ اب وہ صاحب کہنے لگے کہ حکم خداوندی حکمت سے خالی تو ہوگا نہیں، وہ حکمت معلوم ہونا چاہیے۔ میں نے کہا حکمت ضرور ہے مگر میں بیان سے معذور ہوں کیونکہ آپ کی سمجھ میں نہ آئے گی۔ کہنے لگے بیان تو کیجئے میری سمجھ میں آوے یا نہ

---

[1] یہ نہیں ہے کہ جو چہرہ دھولے وہ خوبصورت بن جائے اور جو آئینہ رکھ لے وہ سکندر بن جائے

آوے۔ میں نے کہا میرے پاس ایسا فالتو دماغ نہیں۔ ہاں اسکی ایک صورت ہے کہ کسی سمجھ دار طالبعلم کو میرے پاس لے آیئے جو کم از کم ہدایہ پڑھتا ہو۔ وہ مجھ سے یہی سوال کرے تو میں حکمت بتلا دوں گا آپ بھی سن لیں۔ اس صورت میں میرا وقت بیکار میں تو ضائع نہ ہوگا کیونکہ مخاطب صحیح سامنے ہوگا اسوقت آپ کو بھی معلوم ہو جائے گا کہ احکام شرعیہ میں حکمتیں ضرور ہیں اور یہ بھی تجربہ ہو جائے گا کہ آپ ان حکمتوں کے سمجھنے کے قابل نہیں۔

افسوس آجکل تو پوچھنے والوں کی یہ حالت ہے کہ مسئلہ پوچھتے ہیں محض اس خیال سے کہ ہمارے خیال کے موافق اس مسئلہ کو کر دیا جائے اور جو لوگ اپنے آپ کو تعلیم یافتہ اور رفارمر[۱] سمجھتے ہیں وہ تو پوچھتے ہی نہیں بلکہ از خود بے دھڑک تحریف کرتے ہیں گویا دین ان کے گھر کا قانون ہے جو چاہا بنا دیا۔

ایک شخص نے ربٰوا کو ربودن سے مشتق کیا

اور لیاقتوں کی یہ حالت ہے کہ ایک مصنف صاحب نے حرم الربٰوا کی یہ کتر بیونت کی کہ رُبوا (بضم راء) کہا اور اسکے معنی ربودن سے مشتق کر کے اچکنے کے لیے اور کہہ دیا کہ قرآن میں کہیں سود کی حرمت ہے ہی نہیں۔ اس آیت میں تو غصب کی حرمت ہے اور راء کے کسرہ کو مولویوں کی گھڑت بتلایا۔ اس عقلمند نے اسکی بھی ضرورت نہیں رکھی کہ قرآن میں لفظ عربی کا استعمال ہونا چاہیے خواہ اصل سے، خواہ اہل عرب کے استعمال سے۔ ربودن تو لفظ فارسی کا ہے اور عرب نے اسکا کہیں استعمال بھی نہیں کیا۔ فرمایئے کیا ان ترجموں کو بھی منع نہ کیا جاوے؟ کوئی حد ہے اس بدتمیزی کی۔ افسوس آجکل ایسے ایسے لوگ قوم کے رفارمر ہیں اور اسی لیاقت پر حق تعالٰی کے احکام میں اصلاح کرنے کیلئے تیار ہیں۔ اے اللہ! کیا ہوگیا عقلوں کو۔

ایک شخص کی صدقۂ فطر میں ترمیم کی رائے

ایک نوجوان کہنے لگے صدقۂ فطر کی مقدار میں ترمیم کی ضرورت ہے۔ ایک عالم کے سامنے یہ خیال انہوں نے ظاہر کیا۔ عالم صاحب نے کہا پھر آپ ہی ترمیم کر دیجئے۔ کہنے لگے نا صاحب میں کس طرح کر سکتا ہوں میرے اوپر تو کفر کے فتوے لگ جائیں گے۔ انہوں نے کہا کفر کے فتوے سے

---

[۱] مصلح

جیسے آپ ڈرتے ہیں علماء بھی ڈرتے ہیں۔ غضب ہے کہ اپنے لئے تو کفر کا فتوی پسند نہیں اور علماء کیلئے اس کو پسند کیا جاتا ہے۔ یہ کونسی تہذیب ہے اور کیسی ہمدردی ہے کہ بدتر سے بدتر چیز اپنے مقتداؤں کیلئے تجویز کیجاتی ہے۔

دین کا محافظ اللہ تعالی ہے

میں اسپر ایک اور بات کہتا ہوں کہ اگر خدا نہ کرے کوئی عالم ایسی حرکت پر آمادہ بھی ہوجاوے، تب بھی اس دین کا محافظ اللہ تعالی ہے۔ اگر تمام دنیا کے عالم بھی غلطی پر اکٹھے ہوجائیں تو یہ نہ ہوگا کہ دین بگڑ جائے بلکہ انہیں کو عام لوگ چھوڑ دیں گے۔ بس جس کو مسلمانوں کی نظر سے گرنا ہو وہ ایسا کرے۔ بعض لوگ کہتے ہیں کہ سب مولوی مل کر اگر ایک مسئلہ کو رواج دیں مثلاً سب مل کر سود کو جائز کردیں تو بات چل جائے اور سب لوگ ان کو مان لیں۔ میں کہتا ہوں کہ بالکل غلط ہے بلکہ وہ مولوی خود ہی مردود ہوجائیں گے اور اول تو میں کہتا ہوں کہ جو مولوی ہیں، وہ ایسا کریں گے ہی نہیں کیونکہ مولوی اس کو کہتے ہیں جو مولا والا ہو یعنی علم دین بھی رکھتا ہو اور متقی بھی ہو۔ خوفِ خدا وغیرہ اخلاق حمیدہ بھی حاصل کئے ہوئے ہو۔ اس سے ایسے کام کب صادر ہوسکتے ہیں صرف عربی جاننے سے آدمی مولوی نہیں ہوجاتا، چاہے وہ کیسا ہی ادیب ہو، عربی میں تقریر بھی کرلیتا ہو کیونکہ عربی دان تو ابوجہل بھی تھا بلکہ وہ آجکل کے ادیبوں سے زیادہ عربی دان تھا تو وہ تو بڑا محقق عالم ہونا چاہیے حالانکہ اس کا نام ہی ابوجہل ہوا۔ معلوم ہوا کہ صرف عربی دانی کا نام مولویت نہیں۔

مولوی کس کو کہتے ہیں

بلکہ مولوی کہتے ہیں عالم، متقی، متبعِ سنت کو کیونکہ مولوی میں نسبت ہے مولی کی طرف یعنی مولی والا سو جب تک وہ اللہ والا ہے اسی وقت تک مولوی بھی ہے، لائق اتباع بھی ہے اور جب اس نے رنگ بدلا، اسی وقت سے وہ مولوی نہیں رہا، نہ قابل اتباع بلکہ اس کو چھوڑ دیا جائے گا۔ غرض آجکل آزادی کا زمانہ ہے اس لئے دین میں اس طرح کے تصرف کیے جاتے ہیں اور ہر شخص شریعت میں دخل دینا چاہتا ہے۔ یہ خرابی علمِ دین نہ ہونے کی ہے۔ آجکل لوگ اردو کے ترجمے دیکھ کر عالم بن گئے ہیں اور لطف یہ کہ بے سمجھے طوطے کی طرح رٹنے کو بیکار بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ قرآن کو سمجھ کر پڑھایا جاوے۔

ترجمہ پڑھنے سے بے ترجمہ قرآن پڑھنا اچھا ہے

صاحبو! اس رائے میں میں بھی آپ کے ساتھ متفق ہوں کہ قرآن سمجھ کر ہی پڑھنا چاہئے مگر یہ یاد رکھئے کہ اردو کا ترجمہ دیکھ لینا، اس کا نام سمجھ کر پڑھ لینا نہیں بلکہ یہ اس طوطے کی طرح رٹنے سے بھی زیادہ برا ہے کیونکہ وہ بقول آپ کے بیکار سہی مگر مضر تو نہیں اور یہ مضر ہے کیونکہ ترجمہ دیکھ کر آدمی اپنے آپ کو عالم سمجھتا ہے اور نیم ملا خطرۂ ایمان ا کا مصداق ہو جاتا ہے۔ سمجھ کر پڑھنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے متعلق جتنے علوم ہیں ان سب کو حاصل کیا جائے جسکے لئے دوسرا لفظ یہ ہے کہ طالبعلمی کی جائے اور مدرسہ میں با قاعدہ پڑھا جائے۔ پس میں بھی آپ کو یہی رائے دیتا ہوں کہ قرآن ضرور سمجھ کر پڑھئے مگر سمجھنے کے طریقے سے اور وہ یہ ہے جو میں نے بتلا دیا مگر اس کو کون کرے اسمیں مدت صرف ہوتی ہے اور اتنی مدت کے بعد پھر ملازمت کیلئے تعلیم کیونکر حاصل ہوگی اور عمر زیادہ ہو جانے کے بعد محکموں میں جگہ کیسے ملے گی اس لئے اسکو دوسروں پر ٹالتے ہیں کہ عربی پڑھنے کیلئے دیوبند کے طالبعلم ہی کافی ہیں۔ کیوں صاحب اسکو دوسروں پر کیوں ٹالتے ہو خود کیوں نہیں سمجھ کر پڑھتے؟ اور اگر کسی کو یہ عذر ہو کہ ہم تو بڈھے ہو گئے، اب پڑھنا ممکن نہیں تو میں کہتا ہوں کہ اپنی اولاد کو ہی پڑھائیے اور اس قابل بنائیے کہ قرآن شریف کو سمجھ کر پڑھیں اور تمہیں سنادیں اور سمجھادیں مگر خدارا ترجموں پر اکتفاء نہ کیجئے جسکو عالم بنانا ہو، با قاعدہ عالم بنائیے اور اس سے پھر آپ بھی فائدہ حاصل کیجئے۔

اور ہر کام کا یہی قاعدہ ہے کہ اس کا ایک مرکز ہوتا ہے اور دوسرے اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں مثلاً سب مالدار نہیں ہوتے اور ان کے مال سے دوسرے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ اسی طرح یہ طریقہ ٹھیک نہیں اور نہ ہو سکتا ہے کہ سب کے سب نام نہاد عالم بن جائیں صحیح طریقہ یہی ہے کہ چند اشخاص با قاعدہ عالم ہوں اور دوسرے ان کے علم سے فائدہ اٹھائیں۔ اسپر بعض وہ لوگ جو دین کا دم بھرتے ہیں خوشی کے ساتھ کہتے ہیں کہ ہم نے اپنا ایک بچہ علم دین کیلئے وقف کر رکھا ہے یہ ہمت کی بات ہے۔

علم دین کیلئے سب سے نکما بچہ دیا جاتا ہے

لیکن اسمیں اتنا اعتراض ہے کہ علم دین کیلئے وہ بچہ دیا جاتا ہے جو سب سے نکما ہو، جسکا دماغ اور قویٰ اور اخلاق اور طبیعت بیکار ہوں۔ اللہ میاں کی یہ قدر کہ اسکے نام پر بچہ بھی وہ دیا جاتا ہے جو

ا آدھا مولوی ایمان کیلئے خطرہ ہے جیسے آدھا طبیب جان کیلئے خطرناک ہے۔

اور کسی کام کا نہ ہو اور جو ہوشیار ذہن ہو، اسکو انگریزی کے نام پر دیا جاتا ہے کہ یہ انگریزی کے لائق ہے پھر بتایئے اس سے کیا جی خوش ہو۔

اور اولاد ہی پر کیا منحصر ہر چیز میں یہی عادت ہے کہ حق تعالیٰ کے نام پر وہی چیز دی جائے گی جو بالکل بیکار ہو۔ کپڑا جب پھٹ گیا اور کسی کام میں لانے کا نہ رہا تو دیدو اللہ واسطے، کھانا جب بگڑ گیا اور بس گیا اور گھر میں اسے کوئی نہیں سونگھتا نوکر چاکر بھی نہیں کھاتے تو دیدو اللہ واسطے۔ افسوس وما قدروا الله حق قدره ۱ان لوگوں کو خدا کی قدر ہی نہیں۔

اس بات کا ایک قصہ مشہور ہے کہ ایک مؤذن کے پاس محلّہ کا لونڈا ایک مٹی کی رکابی میں کھیر لایا۔ مؤذن بڑے خوش ہوئے اور کہا شاباش آج کیا تقریب تھی جو کھیر لایا۔ لڑکے نے کہا کہ تقریب تو کچھ نہ تھی، اناں نے کھیر پکائی تھی اسمیں کتا منہ ڈال گیا۔ اناں نے کہا کہ پھینکنے سے اچھا ہے کہ مؤذن کو دے آیا رزق ہے پیٹ میں پڑ جائے گا۔ یہ سن کر مؤذن کو بہت غصہ آیا اور رکابی اٹھا کر پھینک دی، کھیر بھی گر گئی اور رکابی بھی ٹوٹ گئی۔ لڑکا رونے لگا اس پر مؤذن صاحب کو اور بھی غصہ آیا اور کہا کہ ابے! تو کتے کے آگے کی کھیر لایا اور اوپر سے روتا ہے تجھے کسی نے مارا ہے کیا؟ کہا اناں ماریں گی رکابی بھیا کے گو ۲ اٹھانے کی تھی (ظرف بھی بڑا پاکیزہ تھا اور مظروف بھی ایسا ہی، جوڑ تو اچھا ملا۔)

بالکل نکھے کو امام اور مؤذن بنایا جاتا ہے

مگر آجکل یہ زیادہ بے جوڑ نہیں کیونکہ مؤذن بھی آجکل خیر ایسے لوگ ہی رکھے جاتے جو گو کے ٹھیکرے کے برابر ہوتے ہیں اور کسی کام کے نہ ہوں۔ اندھے، لنجے، اپاہج، بے علم آدمی مؤذن اور امام بنائے جاتے ہیں۔ راز یہ ہے تاکہ کچھ زیادہ خرچ نہ ہو کیونکہ جو آدمی کام کا ہوگا وہ تو خرچ سے ہی آوے گا اور لطف یہ ہے کہ خرچ تو کرتے نہیں اور کام ان سے اتنا لیتے ہیں کہ زر خرید غلام سے بھی کوئی نہ لے۔ ہمارے قصبات میں رواج ہے، سقاوے کیلئے ایندھن لانا انہیں کے ذمہ ہے اور محلّہ کا کوئی لونڈا گھڑا لے کر آوے تو اسکا گھڑا بھر دینا مؤذن کے ذمہ ہے، اہل محلّہ کا گوشت لانا مؤذن کے ذمہ ہے اور ضرورت کے وقت دہلیز میں سونا بھی مؤذن کے ذمہ ہے۔ علی ہذا امام جو رکھے جاتے ہیں وہ بھی وہ ہوتے ہیں جو کسی کام کے نہ رہیں جب تک کام کے رہے، نوکری چاکری کرتے رہے اور جب اپاہج ہو گئے تو وکالت دربار خداوندی کیلئے منتخب ہوئے۔

۱:۔ ان لوگوں نے خدا تعالیٰ کی کچھ عظمت نہ کی جیسی عظمت کرنا چاہئے تھی۔ (سورۃ الزمر، ٦٧) ۲:۔ پاخانہ

امامت وکالتِ خداوندی ہے

کیونکہ امامت، وکالتِ دربار خداوندی ہے۔ اگر بادشاہ سے آپ ملنے کو جائیں اور قسمت سے رسائی ہو جائے تو آپکو بادشاہ کے روبرو پیش کرنے کیلئے کوئی قلی مزدور نہیں آگے بڑھے گا بلکہ کوئی معمولی رئیس یا حاکم بھی یہ کام نہ کرسکے گا گمان غالب یہ ہے کہ یہ کام کوئی والیِ ملک یا وائے سرائے کریگا۔ اور خدا کے سامنے پیش کرنے کیلئے ارذل الناس اور اخس الناس ۱؎ تجویز ہوتا ہے۔ ذرا غور کرنے کی بات ہے۔

اماموں کی قدر ہم نے مکہ معظّمہ میں دیکھی ہے کہ سو، سو روپیہ ماہوار کے ایک سو پانچ امام اس وقت مقرر تھے جو نوبت بنوبت امامت کرتے تھے اور امام کی تعیین کوئی معمولی آدمی نہیں کرسکتا تھا۔ ہر وقت کیلئے امام کو معین کرنا شیخ الحرم کے ذمہ تھا جو حرم کا حاکم اعلیٰ ہوتا ہے اور علاوہ تنخواہ کے اماموں کی عزت بھی بہت ہے۔ وہاں کے امام ایسے ہوتے ہیں جیسے رؤساء اور یہاں خرچ کی کفایت کیلئے خود ہی تو ایسے آدمیوں کو رکھا جاتا ہے جو نہایت ذلیل، بدنیت، دنی الطبع ۲؎ ہوتے ہیں حتیٰ کہ تمثیلاً ۳؎ کہا جاتا ہے کہ فلانے کی تو ملانوں کی سی عادت ہوگئی مگر اپنی خطاء کو کوئی نہیں دیکھتا کہ اول تو انتخاب ہی میں ایسے لوگ لائے جاتے ہیں جو فطرۃً پست حوصلہ ہوتے ہیں پھر اس کی خدمت کی یہ حالت ہے کہ خوشی میں تو برادری کی پوچھ ہوتی ہے۔ شادی ہو، بیاہ ہو، بسم اللہ ہو سب میں لمبی چوڑی فہرستیں بنیں مگر ان کو مؤذن اور امام صاحب کا نام کہیں نہ آوے۔

بیماری اور مصیبت میں مؤذن یا امام کی پوچھ ہوتی ہے

اور غمی میں مثلاً کوئی مرجائے، بیمار ہوجائے، ہیضہ ہوجائے، طاعون ہوجائے (خدا خیریت رکھے) مؤذن کی پوچھ اور امام کی پوچھ ہوگی کیونکہ صدقہ دیا رد بلا ۴؎۔ اس وقت یہ سوجھتی ہے کہ دو ایک مصلیوں کو کھانا کھلا دو اور بیماری میں مؤذن سے یہ کہتے ہیں کہ ملاجی ذرا دعا کرنا اور پانچوں وقت بعد نماز کے لوگوں سے بھی دعا کروانا۔ وہ جیسی دعا کرے گا معلوم ہے اگر زبان سے دعا کر بھی دی تو دل سے تو کبھی نہیں کرے گا کیونکہ کسی کے اچھا ہونے سے اس کو کیا فائدہ؟ اسکا فائدہ تو مرنے میں ہی ہے کہ کچھ دن کی روٹیاں چلیں گی۔ سوئم چہلم میں کھانا ملے گا، کچھ پیسے ملیں گے۔ غرض اسکا نفع تو کسی کے مرنے میں ہی ہے جینے میں تو اسکا نقصان ہی ہے کہ کچھ کام بڑھتا ہے۔ یہ قدر رہ گئی ہے

۱؎ سب سے گھٹیا لوگ ۲؎ نیت کے خراب، بہت ہلکی فطرت والے ۳؎ مثال کے طور پر ۴؎ صدقہ بلا ٹالنے کیلئے

خدا تعالیٰ کے نام کی چیزوں کی۔

خدا تعالیٰ کے نام اعلیٰ درجہ کی شئے دینی چاہیے

صاحبو! خدا تعالیٰ کے نام کی اتنی تو بے وقعتی نہ کرو خدا کے نام کی چیز تو وہ نکالنی چاہئے جو سب سے اعلیٰ درجے کی ہو۔ خدا واسطے کھانا دو تو اعلیٰ درجے کا دو، کپڑا دو تو اعلیٰ درجے کا دو، علم دین کیلئے اولاد تجویز کرو تو اعلیٰ درجے کی کرو۔ اس بچہ کو منتخب کرو جس کے قویٰ اچھے ہوں، فہم درست ہو، عالی حوصلہ ہو۔ لوگ کہتے تو ہیں کہ آجکل غزالی اور رازی پیدا نہیں ہوتے۔ میں بقسم کہتا ہوں کہ اب بھی ان سے بڑھ کر پیدا ہو سکتے ہیں لیکن ہاں آجکل ایسے کم پیدا ہوتے ہیں اور اسکی وجہ آپ کی غلطی ہے کہ آپ تندرست، صحیح الدماغ لوگوں کو عربی نہیں پڑھاتے ایسے لوگوں کو انگریزی میں ڈالتے ہیں۔

غزالی اور رازی اب بھی پیدا ہوتے ہیں

اگر انتخاب صحیح ہو تو غزالی اور رازی اس وقت بھی پیدا ہوں۔ غزالی اور رازی پر علم ختم نہیں ہو گیا کیونکہ قیامت سے پہلے کسی زمانہ میں ختم نہ ہوگا۔ نبوت کا ختم ہو جانا تو ثابت ہے لیکن ولایت اور علم کا ختم ہونا کہیں ثابت نہیں لیکن جب علم دین کیلئے منتخب ہی وہی بچے ہوں جو نرے بیوقوف ہوں تو یہی تو پڑھ کر علماء کہلائیں گے پھر بڑے ہو کر عقل مند کہاں سے ہو جائیں گے؟

مولوی بیوقوف نہیں ہوتے بلکہ بیوقوف مولوی بن جاتے ہیں

لوگ مولویوں کو بے وقوف کہتے ہیں لیکن یہ نہیں سمجھتے کہ یہ بیوقوف بن کر مولوی ہوئے یا مولوی ہو کر بیوقوف بنے جیسے ایک لطیفہ ہے کہ کسی مدرسہ میں ایک طالب علم نے دوسرے طالبعلم کی چوری کی، پولیس آگئی ان میں سے ایک افسر جو غالباً درجہ دُوم کے تھے حیرت سے کہنے لگے کہ طالبعلم بھی چوری کرتے ہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں طالبعلم چوری نہیں کرتے بلکہ یوں کہو کہ چور بھی طالبعلمی کرتے ہیں۔ اس جواب کو سن کر وہ شخص بہت محظوظ ہوئے[۱]۔

میں ڈھاکہ گیا تھا وہاں ایک اسکول کے سپرنٹنڈنٹ صاحب سے میری ملاقات ہوئی جو مجھ کو اسکول لے گئے تھے۔ انہوں نے کہا گستاخی معاف ہو، ایک بات پوچھنی ہے۔ میں نے کہا فرمائیے کہنے لگے میرے تحت میں دو قسم کے طالبعلم ہیں عربی کے بھی اور انگریزی کے بھی۔ انگریزی خوانوں

---

[۱] مطمئن ہوئے

میں جسکو بھی میں دیکھتا ہوں عالی حوصلہ پاتا ہوں اور عربی خوان جتنے بھی ملتے ہیں سب پست خیال۔ میں نے کہا کہ یہ خاصیت انگریزی اور عربی کی نہیں بلکہ یہ اثر خاندانوں کے عالی وسافل [1] ہونے کا ہے اس دور میں عموماً عالی خاندان والے انگریزی پڑھتے ہیں اور عربی پڑھنے والے اکثر پست خاندانوں والے ہیں پھر ظاہر ہے کہ جو شخص فطری طور پر کم حوصلہ ہو وہ عربی پڑھنے سے عالی حوصلہ کیسے ہو جائے گا؟ عربی پڑھنے سے وہ کم حوصلہ نہیں ہوئے بلکہ وہ اپنی فطرت سے ہی ایسے ہیں پھر کسی قدر اصلاح ہو جاتی ہے اگر وہ عربی نہ پڑھتے تو نہ معلوم کتنے پست حوصلہ ہوتے اور انگریزی پڑھنے والے انگریزی پڑھنے سے عالی حوصلہ نہیں ہوئے بلکہ وہ چونکہ اکثر شریف النسب، عالی خاندانوں کے ہیں اس لئے عالی حوصلہ ہیں کیونکہ آپ نے چھوٹی قوموں کے عربی طلبہ کو دیکھا ہے اس لئے آپ کو یہ شبہ ہوا۔

آپ ان لوگوں کو دیکھئے جو شریف النسب اور خاندانی ہیں اور پھر انہوں نے عربی پڑھی ہے انکے برابر کوئی بھی عالی حوصلہ نہیں ہوسکتا۔ وہ سلاطین کو بھی نگاہ میں نہ لائیں گے۔ پھر میں نے بعض واقعات سے اس کی شہادت پیش کی مثلاً میرے پاس ایک رئیس کا بچہ عربی پڑھتا تھا اس سے ایک افسرِ پولیس نے جو ہتھیار لگائے ہوئے تھا، اس کی ہیبت اتنی مہیب [2] تھی کہ اس کے سامنے ایسا ویسا آدمی بات بھی نہ کر سکے سوال کیا کہ یہ کیا بات ہے کہ عربی پڑھنے والے سب سر منڈواتے ہیں؟ بچہ نے بے دھڑک جواب دیا کہ یہ کیا بات ہے کہ انگریزی پڑھنے والے سب ڈاڑھی منڈواتے ہیں۔ بس وہ چپ ہی تو رہ گئے اگر کسی غریب قوم کا بچہ ہوتا تو یہ جواب ہرگز نہ دے سکتا۔

علم سے حوصلہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ بڑھ جاتا ہے

اصل یہ ہے کہ علم سے حوصلہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ فطری حوصلہ بڑھ جاتا ہے مگر جب فطرت ہی میں حوصلہ نہ ہو تو علم سے کہاں سے آئے گا تو یہ غلطی پڑھانے والوں کی ہے نہ کہ علم کی۔ وہ صاحب اس جواب سے بہت خوش ہوئے اور کہا جزاک اللہ آپ نے میرا ایمان بچا لیا اور یہ بالکل صحیح ہے میرے رجسٹر سے اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

یہ ہیں واقعات پھر حیرت ہے کہ اپنے انتخاب میں خود تو غلطی کریں اور خود ہی عربی پڑھنے والوں پر اعتراض کریں۔

---

[1] اونچے، نیچے [2] رعب والی

ایک رئیس تارکِ جماعت کی حکایت

یہ ایسا ہے جیسے ایک رئیس سے کہا گیا کہ آپ نماز مسجد میں کیوں نہیں پڑھتے ؟ کہنے لگے کہ اس واسطے نہیں پڑھتا ہوں کہ وہاں صفائی کا کوئی انتظام نہیں ۔ نہ جھاڑو ہے، نہ روشنی ہے، بورے ہیں تو ٹوٹے ہوئے، میلے کچیلے، پرانے ان پر نماز پڑھنے کو دل نہیں چاہتا ان کی صورت دیکھ کر بھی تے آتی ہے۔ میں نے کہا کہ بے شک یہ بات تو صحیح ہے مگر یہ تو بتلاؤ کہ یہ الزام کس پر اور قصور کس کا ہے؟ جب مسجد کی خدمت کرنے والے اور اس میں نماز پڑھنے والے غریب ہی لوگ ہوں گے تو وہ بوریئے، بدھنے اپنی حیثیت کے موافق لائیں گے، صفائی بھی اپنے مزاج کے موافق کریں گے۔ تم مسجد میں آنا شروع کرو اور بوریوں، بدھنوں کا انتظام کرو، رقم خرچ کرو۔ دیکھو پھر مسجد میں چاندنا ہوتا ہے یا نہیں چنانچہ جس مسجد میں امراء اور روٗساء نماز پڑھنے کی پابندی کرتے ہیں انکو جا کر دیکھو کیسا عمدہ انتظام اور کیسی صفائی رہتی ہے صاحب آپ مسجد میں آنے کی پابندی کریں اور صفائی کا معقول انتظام کریں پھر دیکھیں صفائی کیسے نہ ہو؟ مسجد غریبوں کے باپ کا گھر تو نہیں کہ وہ اگر صفائی نہ کریں تو آپ آنا ہی چھوڑ دیں کسی کا ذاتی گھر ہو اور وہاں صفائی نہ ہو تو عذر ہو سکتا ہے کہ ہم تمہارے گھر اس واسطے نہیں آتے کہ تم صفائی نہیں رکھتے مسجد تو کسی ایک کا یا محلّہ کے غریبوں کا گھر نہیں بلکہ آپ کی بھی مسجد ہے اور آپ کے بھی ذمہ اسکی صفائی ہے خود تو صفائی کا انتظام کرتے نہیں اور خود ہی گھن کھاتے ہیں۔ اسکے تو یہ معنی ہوئے کہ آپ اپنے ہی گھر سے گھن کھاتے ہیں اسپر مجھے مولانا کا قول یاد آیا۔

حملہ برخودمے کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ برخود حملہ کرد[1]

اسی طرح یہ اعتراض تو ہر شخص کی زبان پر ہے کہ مولوی کم حوصلہ ہوتے ہیں، تنگ خیال ہوتے ہیں۔

مولویوں کے تنگ خیال وغیرہ ہونے میں قصور کس کا ہے

مگر خدا جانے عقلیں کہاں ماری گئی ہیں؟ کوئی غور نہیں کرتا کہ یہ قصور مولویوں کا ہے یا اپنا۔ صاحبو! اسکی اصل وہی ہے جو میں نے بیان کی اس کو سن کر سب کی گردنیں جھک جاتی ہیں پھر مولوی جیسے بھی ہوں مگر آپکو یہ تسلیم ہے کہ دین کی اور علم دین کی مسلمانوں کو ضرورت ہے تو اہل دین

---

[1] اے سادہ شخص تو خود اپنے آپ پر حملہ کر رہا ہے، جیسے وہ شیر جس نے پانی میں اپنا عکس دیکھ کر خود اپنے آپ پر حملہ کیا

اور اہل علم سے آپکو تنافر اور بعد[1] ہونا تو کسی طرح ٹھیک نہیں بلکہ ان سے مجانست وموانست[2] ہونی چاہیئے ان کے ساتھ استغناء کا برتاؤ نہ ہونا چاہیئے بلکہ اپنے آپ کو انکا محتاج سمجھنا چاہیئے۔

اور یہ کوئی اختراعی بات نہیں بلکہ واقعی بات ہے کیونکہ کسی مذہب کا بھی آدمی ہو، وہ اپنے مذہب کے اہل علم سے مستغنی نہیں ہوسکتا ورنہ مذہب کا نام لینا ہی فضول ہوگا۔ جب آپ علماء اور طلبہ کے محتاج ہیں تو ان سے الگ نہیں ہوسکتے۔ پس آپ کے ذمہ یہ بات ہے کہ ان سے ملئے اور ان کی باتوں کی اصلاح کیجئے جو ان میں باعث بعد ونفرت ہیں۔

صاحبو! اس میں ایک اور طرح سے بھی سراسر آپ ہی کا قصور ہے وہ یہ کہ آپ نے طلبہ کو اس طرح تنگ حال کیوں رکھا ہے جس سے وہ تنگ خیال ہوگئے کہ کوڑی کوڑی پر انکی نیت بگڑنے لگی۔ تنگی معاش ایسی بلا کی چیز ہے کہ اچھے سے اچھے آدمی کی نیت کو بگاڑ دیتی ہے الا ماشاء اللہ۔ جب آدمی کے پیٹ کو لگتی ہے تو اسکی آنکھیں ہر طرف اٹھتی ہیں اور ذرا ذرا سی چیز پر جان دینے لگتا ہے۔ طالبعلموں کو چھوڑ کر آپ اپنے حالات میں اور اپنی برادری کے حالات میں غور کریں تو اسکی تصدیق ہوجائے گی۔ اچھے اچھے خوشحال لوگوں کو جب تنگی پیش آتی ہے تو نیتیں بگڑ جاتی ہیں اور معمولی ضرورتوں کیلئے وہ کام کر بیٹھتے ہیں جن سے دنیا میں بھی منہ کالا اور آخرت میں بھی منہ کالا ہوتا ہے۔ سودی قرض لیتے ہیں اور تیرا میرا حق دبا لیتے ہیں جس میں آخر کار مقدمہ بازیاں ہوتی ہیں اور سر بازار رسوائیاں ہوتی ہیں اور آخرت کا گناہ الگ سر پر رہتا ہے، نیز تنگ دستی میں کہیں رشوت لیتے ہیں، کسی کی امانت میں تصرف کر لیتے ہیں۔ جب خوش حال لوگ جو کبھی حوصلہ مند تھے ایسا کر گزرتے ہیں تو جس شخص کے پیٹ کو شروع ہی سے نہ ملے[3] اسکی نیت بگڑے تو کیا تعجب ہے؟ اس لئے میں پھر کہوں گا کہ طلبہ عربی کے بدنیت ہونے میں بڑا قصور مسلمانوں کا ہے۔ آپ نے طالب علم کو اس طرح کیوں رکھا کہ اسکو تنگی پیش آئے اور بات بات پر نیت بگڑے۔

طالب علم کے ساتھ کیسا برتاؤ چاہیئے

اس کے ساتھ وہی سلوک کیوں نہ کیا جو اپنے بچوں کے ساتھ کرتے ہو اگر آپ کا بچہ بھوکا ننگا پھرے تو آپ کو کیوں کوفت ہوتی ہے صرف اسی وجہ سے کہ اس کے ساتھ آپ کو طبعی محبت ہے تو اگر اپنے بچے سے محبت طبعی ہے تو طالب علم سے محبت عقلی تو ہونا چاہیئے۔ بچہ کے بھوکا، ننگا پھرنے سے

---

[1] نفرت اور دوری [2] ان کے ساتھ مل کر بیٹھنا اور ان سے محبت [3] یعنی پیٹ بھر کر کھانے کو نہ ملے

اگر اس لئے عار ا آتی ہے کہ لوگ کہیں گے کہ فلانے کی اولاد اس طرح پھرتی ہے تو طالب علم کے بھوکا، ننگا ہونے سے یہ عار کیوں نہیں آتی کہ لوگ کہیں گے کہ ان کے مذہبی لوگ اس حال سے پھرتے ہیں۔ دنیا بھر کے خیال میں تو یہ راسخ ہے کہ مسلمانوں سے زیادہ مذہب پر جان دینے والی کوئی قوم نہیں مگر انکو ہمارے گھر کی خبر نہیں انکو پہلے قصے یاد ہیں ورنہ آجکل جتنے مسلمان اپنے مذہب سے بے فکر ہیں اتنی کوئی قوم اپنے مذہب سے بے فکر نہیں بھلا یہ کیا مذہب پر جان دینا ہے کہ اپنے مذہبی لوگوں کی شکستہ حالی کی مطلقاً پرواہ نہیں۔

اہل ثروت ایسا کیوں نہیں کرتے کہ جہاں اپنے چار بچے پرورش پاتے ہیں وہاں پانچواں بچہ ایک طالب علم کو سمجھ کر اپنے ذمہ لے لیں اور اس کو اپنی اولاد کے برابر رکھیں۔ جو اولاد کو کھلائیں وہی اس کو بھی کھلائیں اور جو اولاد کو پہنائیں، وہی اسکو پہنائیں۔ ایک دو کے ساتھ ایسا کیجئے اور اس طرح طلبہ کو علمِ دین پڑھائیں۔ پھر میں دیکھوں کہ آپ کو ان کے اخلاق کی نسبت کیا کیا شکایتیں پیدا ہوتی ہیں۔ جب وہ خوش عیشی میں رہے گا تو اسکا حوصلہ بڑھے گا اور سیر چشم ہوگا ورنہ جو روپیہ آجکل پڑھنے کا ہے اس سے حوصلہ کیسے بڑھ سکتا ہے؟ جو شخص ہمیشہ فاقے کرتا ہے، پیسے کی صورت کبھی دیکھتا نہیں، دوسروں کا دست نگر رہتا ہے، کسی کے پاس جائے تو کوئی منہ نہیں لگاتا اسکا حوصلہ بڑھے تو کیسے بڑھے؟ کوئی ذریعہ حوصلہ بڑھنے کا ہے ہی نہیں غرض خود آپ نے اسکو اس حالت میں رکھا ہے اور آپ ہی نے اسکو پست حوصلہ بنایا ہے پھر افسوس ہے کہ آپ ہی شکایتیں کرتے ہیں میں پھر کہتا ہوں۔

حملہ بر خود مے کنی اے سادہ مرد ہمچو آں شیرے کہ بر خود حملہ کرد ۲

یہ شعر مثنوی کے ایک قصہ میں ہے مولاناؒ نے نخچیروں ۳ کا ایک قصہ لکھا ہے کہ ایک جنگل میں بہت سے جانور رہتے تھے۔ وہاں ایک شیر آ گیا اس نے چیر پھاڑ شروع کر دی جس کو چاہتا شکار کر لیتا۔ جانور بہت تنگ ہو گئے اور آپس میں مشورہ کر کے اس سے جا کر کہا کہ ہم آپ کیلئے روز کی خوراک مقرر کئے دیتے ہیں ایک جانور روز ہم بھیج دیا کریں گے ہمیں سب کو نہ ستایئے۔ بس یہ مقرر ہو گیا کہ روز قرعہ ڈال کر جسکا نام نکلتا اس ایک کو بھیج دیتے باقی سب جانور امن وامان سے رہتے۔ ایک روز خرگوش کا نام نکل آیا اس نے ایک ترکیب سوچی اور کہا آج میں اس کا جھگڑا پاک کئے دیتا ہوں اور ذرا دیر کر کے گیا وہاں شیر بھوکا بیٹھا تھا بھوک کی وجہ سے نہایت غصہ میں تھا اسکو دیکھ کر کہنے لگا

ا شرم ۲ اے سادہ شخص تو خود اپنے آپ پر حملہ کر رہا ہے جیسے اس شیر نے اپنے پر ہی حملہ کیا تھا ۳ جنگلی جانوروں

کہ بس میں پھر وہی طریقہ شروع کر دوں گا کہ جو سامنے پڑا اسے ہی پھاڑ ڈالا تم لوگوں نے اپنا عہد خود توڑ دیا ہے۔ خرگوش نے کہا حضور کو اختیار رہے آپ مالک ہیں مگر میری بات سن لیجئے میں سب جانوروں کی طرف سے آپ کو اس بات کی اطلاع کرنے آیا ہوں کہ آئندہ ہم سے وعدہ پورا نہ ہوگا کیونکہ ایک زبردست شیر جنگل میں اور آ گیا ہے وہ راستہ ہی میں سے آپکا راتبا[1] لے لیتا ہے چنانچہ میں اسوقت اپنے ایک دوسرے بھائی کو حضور کی خوراک کیلئے لایا تھا اس شیر نے راستہ ہی میں چھین لیا اگر ایسا ہی ہوا کرے گا تو ہم کہاں تک وعدہ پورا کریں گے۔

شیر کو یہ سن کر بڑا غصہ آیا او کہا بتلا تو وہ شیر کہاں ہے میں بھی تو اس کو دیکھوں۔ خرگوش نے کہا چلئے چنانچہ اس کو ایک بڑے کنویں پر لے گیا اور کہا کہ وہ اس کنویں میں ہے۔ شیر نے جھانک کر جو دیکھا تو کنویں میں ایک شیر اور ایک خرگوش نظر آیا۔ اس نے کہا دیکھئے وہ ہے اور خرگوش بھی ساتھ لئے ہوئے ہے۔ پس شیر غصہ میں آ کر ایک دم کنویں میں کود پڑا خرگوش کا کام بن گیا اور اچھلتا کودتا نخچیروں کے پاس پہنچا اور مبارک باد دی کہ میں دشمن کو ہلاک کر آیا دیکھئے اس شیر نے کیا غلطی کی جس سے لڑنے کو چلا تھا وہ خود اپنی صورت ہی تھی مگر تمیز نہ ہوئی جس کا یہ نتیجہ ہوا کہ خود ہی ہلاک ہو گیا۔ اسی طرح جو لوگ کسی طالب علم پر اعتراض کرتے ہیں وہ درحقیقت اپنے ہی اوپر اعتراض کرتے ہیں اور طالب علم کی صورت بُری معلوم ہونا اپنی ہی صورت کا برا معلوم ہونا ہے کیونکہ وہ صورت اپنے ہی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہے۔

ایک حبشی کہیں چلا جا رہا تھا راستہ میں ایک آئینہ پڑا ہوا ملا۔ اس کو اٹھا کر جو دیکھا تو ایک نہایت بُری شکل نظر آئی موٹے موٹے ہونٹ، کالا رنگ، بُرا نقشہ۔ اس کے قبل کبھی آئینہ نہ دیکھا تھا کہنے لگا کہ ایسا بُری صورت کا تھا جب ہی تو کوئی راستہ میں پھینک گیا۔ یہ کہہ کر آئینہ کو زمین پر پٹک دیا دیکھئے اس میں آئینہ کا قصور تھا یا اپنی صورت کا۔

ایسے ہی ایک بچہ روٹی کھا رہا تھا پانی کا لوٹا پاس رکھا تھا اتفاق سے اس میں ٹکڑا اگر گیا جھانک کر جو دیکھا تو اپنی صورت نظر آئی کہ ایک بچہ ہاتھ میں ٹکڑا لئے ہوئے ہے۔ بس لگا رونے کہ ہائے ابا! اس نے میرا ٹکڑا چھین لیا۔ ابا جان نے کہا کس نے چھین لیا؟ کہا یہ جو لوٹے میں بیٹھا ہے۔ وہ بھی اسی کے باوا تھے لوٹے میں جھانک کر جو انہوں نے دیکھا تو ان کو اپنی صورت نظر آئی اس کو خطاب کر کے

---

[1] مقرر کردہ حصہ

فرماتے ہیں کہ اتنی بڑی ڈاڑھی لگا کر شرم نہیں آتی کہ بچہ کا لقمہ چھین لیا۔ یہ سب کچھ اپنے ہی کو سنا رہے تھے مگر حماقت سے یہ سمجھ لیا کہ دوسرے کو سنا رہا ہوں۔ اسی طرح جو لوگ علماء پر، مسجدوں پر، مساکین پر اعتراض کرتے ہیں سمجھ لیں کہ یہ صورت، یہ حالت انہی کی بنائی ہوئی ہے۔ اگر مساکین اور طلبہ کی خبر گیری رکھیں تو وہ ایسے شکستہ حال کیوں رہیں۔

ہر قوم مذہبی جماعت کی خدمت کرتی ہے

اور علماء وطلبہ کی خدمت مفت بھی تو نہیں ہے وہ بھی تو قوم کی بڑی خدمت کر رہے ہیں۔ انکی خدمت آپ کی خدمت سے زیادہ اچھی اور زیادہ ضروری ہے۔ اگر آپ ان کی دنیوی خدمت کرتے ہیں تو وہ آپ کی دینی خدمت کرتے ہیں اور دین کی خدمت کرنا قوم ہی کی خدمت تو ہے کیونکہ دین سب مسلمانوں کی مشترک چیز ہے جسکی خدمت سب مسلمانوں کے ذمہ فرض ہے جس کو طلبہ علم دین آپ کی طرف سے ادا کر رہے ہیں۔ اگر قرآن وحدیث سے یہ بات سمجھ نہ آوے تو دوسری قوموں کی شہادت سے سہی کیونکہ آجکل دوسروں کی تقلید کی عادت ہوگئی ہے۔

دیکھئے غیر اقوام بھی اپنی مذہبی جماعت کی دینی خدمت کو نہایت وقعت کی نگاہ سے دیکھتی ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ مذہبی جماعت ساری قوم کی طرف سے ایک اہم اور ضروری کام کو سرانجام دے رہی ہے اسی لئے مشنریوں کی خدمت تمام عیسائی اور گروکل کی خدمت تمام ہندو، سب چھوٹے، بڑے کرتے ہیں۔ ہر ہر شخص اپنا کام سمجھ کر اس میں حصہ کچھ نہ کچھ ضرور لیتا ہے۔ افسوس ہے کہ مسلمان اس بات میں دوسروں کی بھی تقلید نہیں کرتے۔ وہ بیچارے دست خود، دہاں خود[1] کا منظر بن رہے ہیں انکی وہ حالت ہے جو اکبر بادشاہ کے ایک عطیہ کی تھی۔

بھانڈوں کے ہاتھی کا قصہ

قصہ اسکا یہ ہے کہ اکبر بادشاہ نے ایک دفعہ بھانڈوں کو انعام میں ہاتھی دیا مگر ہاتھی کو کہاں تک کھلاتے۔ پس انہوں نے کیا کیا کہ اس کے گلے میں ڈھول ڈال کر بازار میں چھوڑ دیا اس ہاتھی نے بازار میں بہت فساد مچایا یہانتک کہ بادشاہ کو خبر پہنچی بادشاہ نے ان کو بلایا اور پوچھا کہ یہ کیا حرکت ہے؟ انہوں نے کہا حضور ہم غریب لوگ ہیں ہاتھی کے کھلانے کو کہاں سے لاتے اور پیشہ ہمارا مانگنا

---

[1] خود کماؤ، خود کھاؤ

کھانا۔ ہم نے اس سے بھی کہہ دیا کہ تو بھی مانگ اور کھا۔ بادشاہ بہت خفیف ہوئے اور اسکی خوراک اپنے یہاں سے مقرر کر دی۔

حضرت آجکل ہماری قوم نے مولویوں کو اکبر بادشاہ کا ہاتھی بنایا ہے کہ دین کی خدمت بھی کرو، مدرسے بھی قائم کرو، مخالفین اسلام کا جواب بھی دو اور بھیک مانگو اور کھاؤ۔ اگر کوئی بات دین پر آئے تو مولویوں پر الزام کہ یہ مذہب کی خبر نہیں لیتے۔ یہ نہیں کرتے، وہ نہیں کرتے ان سے کوئی پوچھے کہ کبھی تم نے بھی کسی دن مذہب کی خبر لی کہ مولوی صاحب یہ رقم لو اور اس سے دین کا کام چلاؤ۔ جب تم خبر نہیں لیتے اور خود مولوی صاحب کو گھر گھر چندہ مانگنا پڑتا ہے تو وہ بھیک مانگیں یا سارے کام کریں۔ پھر چندہ میں بھی قوم فراخ دلی سے حصہ نہیں لیتی۔ حالت یہ ہے کہ جب کوئی عالم چندہ مانگتا ہے تو رئیس صاحب یہ کہہ کر چل دیتے ہیں کہ میں ذرا گھر جاتا ہوں اور وہاں جا کر خدا ہی کے یہاں پہنچ جاتے ہیں پھر جب تک مولوی صاحب کے بیٹھے رہنے کا احتمال رہیگا، نکلنے ہی کے نہیں۔ میرا خیال تو یہ ہے کہ خیر قوم نے تو جو کچھ بھی کیا وہ کیا مگر علماء کا بھی ان کے ساتھ یہ رنگ ہونا چاہئے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مے گلگوں باشی

بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی

در رہِ منزلِ لیلیٰ کہ خطرہاست بجاں

شرطِ اول قدم آنست کہ مجنوں باشی [1]

علماء کو چاہئے کہ سوال نہ کریں

سوال کرنا تو نہایت ہی ذلت کا کام ہے جو کرنا ہو، خود خدا کے نام پر کریں اور قوم کو منہ بھی نہ لگائیں۔ اچھا ہے جیسا یہ دین کی خدمت سے بھاگتے ہیں، یہ دین کی خدمت سے محروم ہی رہیں۔ بس خدا ہی پر نظر رکھیں حق تعالیٰ اپنا کام آپ ہی کریں گے۔ اس سوال ہی نے علماء کو بے قدر کر دیا۔ علماء کی بے قدری سادگی سے اور پھٹے ہوئے کرتے سے اور پھٹے ہوئے جوتے سے نہیں ہوتی۔ اس کی تو وہ کچھ بھی پرواہ نہ کریں مگر خدا کیلئے مستغنی ہو کر رہیں۔ اگر یہ ایسا کریں تو مسلمان اتنے بے حس نہیں

[1] اے دل اس سرخ رنگ کی شراب سے دل لگانا بہتر ہے۔ بغیر سونے خزانے کے تمہیں قارون کا سا دبدبہ حاصل ہو جائے گا۔ لیلیٰ کے راستے میں اگرچہ جان کے بہت سے خطرات ہیں مگر اس راستہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ تم مجنوں ہو

کہ حقیقت کو نہ سمجھیں گے۔ ایک شخص پھٹے ہوئے لباس میں ہو لیکن عالم ہو اور متقی ہو تو ممکن نہیں کہ مسلمانوں کی نظر میں اس کی عزت نہ ہو برخلاف اس کے جو لوگ عبا، قبا میں ہوتے ہیں چاہے کیسے ہی مہذب طریق سے سوال کریں مگر ذلت ضرور ہوتی ہے خاص کر اس وقت جبکہ سوال بھی اپنی ذات کیلئے ہو اور اگر سوال کسی کارِ خیر کیلئے ہو تب بھی کچھ نہ کچھ ذلت ضرور ہوتی ہے۔

اس پر اہل مدارس کہہ دیتے ہیں کہ اگر اس طرح سے سوال نہ کیا جائے تو کام کیسے چلے؟

اہل علم کو سوال کرنے سے مرنا بہتر ہے

میں کہتا ہوں سوال ضرور ذلت ہے۔ ہاں تحریک عام[۱] کا مضائقہ نہیں اور اگر خلوص سے کام کیا گیا تو اس تحریک کا بھی اثر ضرور ہوگا اور اگر اثر نہ ہو تو نہ سہی، ہر شخص مکلّف اتنے کام کا ہے جو اس کے بس کا ہو، آپ اپنا کام کر چکے کوئی نہیں دیتا ہے، مت دو۔ رہا کہ کام تو بند ہو گیا، میں کہتا ہوں کہ جتنا تھوڑا بہت ہو سکے کر و اور جو بدوں بڑی بڑی رقموں کے نہ ہو سکے، اسے چھوڑ دو اور اگر مدرسے بھی مٹ جائیں، مٹ جانے دو۔

میں علماء سے کہتا ہوں کہ اس حالت میں تم اپنے گھر بیٹھو۔ مزدوری کر کے کھاؤ، کوئی آوے تو پڑھا دو، کھانے کو نہ ملے تو اُسی کونہ میں مر جاؤ مگر ہاتھ مت پھیلاؤ اور خدا تعالیٰ کے سامنے کہہ دینا کہ جتنا ہم سے ہو سکا اتنا ہم نے کیا اس سے زیادہ کیلئے سرمایہ کی ضرورت تھی جو ہمارے پاس تھا نہیں، جن کے پاس تھا انہوں نے دیا نہیں۔ بس اس وقت ساری قوم کی گردنیں نپ جائیں گی۔ باقی اس سوال میں تو طرح طرح کی خرابیاں ہیں گو لوگ اس کو کارِ خیر سمجھتے ہیں لیکن میرے نزدیک تو یہ کارِ شر ہے۔ مشترک خرابی تو یہ ہے کہ دین کی ذلت ہے اور ان علماء کیلئے جو سوال کرتے ہیں یہ خرابی ہے کہ ذلیل ہوتے ہیں اور چند روز میں حیا جاتی رہتی ہے۔ مشاہدہ ہے کہ اکثر سائلوں کے اخلاق اکثر خراب ہو جاتے ہیں اور علم کے آثار مٹ جاتے ہیں۔ پھر ان سے دوسروں کو کیا فیض ہو سکتا ہے علماء کو تو اس عیب کے پاس بھی نہ جانا چاہئے۔ بس اگر کام کرنا ہے خدا کا نام لیکر کریں، جب نہ ہو سکے چھوڑ دیں۔

خلوص کے ساتھ کام کرنے میں فاقہ کی نوبت نہیں آئے گی

اور حضرت میں خدا پر توکل کر کے کہتا ہوں کہ انشاء اللہ فاقہ کی نوبت آوے ہی گی نہیں۔ کام

---

[۱] عمومی انداز میں چندہ کی ترغیب دینا

کیجئے کام خود لوگوں کو متوجہ کر لیتا ہے مگر براہِ خدا اللّٰہیت کے ساتھ کیجئے یہ بھی نیت نہ رکھئے کہ لوگ رجوع ہوں۔ خیر یہ تو دور کی بات ہے کس کس کو رائے دوں اور کیسے دل میں ڈال دوں؟ آجکل اہل علم کو اس چندہ سے روکنا تو مشکل ہے اور یہ سوال کی رسم دنیا سے اٹھنا دشوار ہے کیونکہ ضعفاء کو ظاہراً تکلیف کا قوی احتمال ہوتا ہے مگر میں قوم سے کہتا ہوں کہ تم اپنے دین کی بے عزتی کیوں کرتے ہو علماء کے سپرد تم نے یہ چندہ کی خدمت کیوں کی ہے جس سے وہ ذلیل ہوئے اور ان کے ساتھ علم اور دین بھی ذلیل ہوا۔ غیرت قومی کیسے تقاضا کرتی ہے کہ اپنے علماء کو لوگوں کی نظروں میں بے وقعت دیکھا جائے۔

امراء کو چندہ جمع کرنا چاہئے نہ کہ علماء کو

یہ چندہ کا کام تم خود کرو اور علماء سے وہ کام لو، جو انکے کرنیکا ہے یعنی تعلیم و تبلیغ اور تعلیم و تبلیغ کے متعلق جو نظم و نسق ہو، اس میں تم دخل مت دو اور مالی انتظامات اپنے ہاتھ میں رکھو۔ اس میں علماء کچھ دخل نہ دیں اور دینے والوں کو اور وصول کرنے والوں کو سب کو چاہئے کہ اس کام کو حقیر نہ سمجھیں کیونکہ سوال سے علماء کی تو تحقیر ہوتی ہے اور قوم کی تحقیر نہیں ہوتی کیونکہ علماء کے مانگنے میں تو یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اپنے پیٹ کے واسطے مانگتے ہیں اور قوم کے سربرآوردہ لوگوں کے مانگنے میں یہ شبہ نہیں ہوسکتا کہ یہ اپنے پیٹ کے واسطے مانگتے ہیں اس واسطے مولویوں کو چندہ نہیں ملتا اور ایسے لوگ کھڑے ہو جاتے ہیں تو فوراً ملتا ہے۔ مولویوں کی تو صورت دیکھ کر لوگ چھپ جاتے ہیں۔

چنانچہ ایک جگہ ایک صدر اعلیٰ کی تبدیلی ہوئی وہ پرانے فیشن کے آدمی تھے۔ عبا، قبا پہنتے تھے جب اس شہر میں پہنچے تو ایک رئیس صاحب سے ملنے گئے۔ وہ باہر مکان میں بیٹھے ہوئے تھے دور سے دیکھ کر کہ کوئی مولوی صاحب آرہے ہیں گھر میں چلے گئے۔ صدر اعلیٰ سمجھ گئے اور یہ کہلوا بھیجا کہ ڈریں نہیں میں کوئی سائل نہیں ہوں تب وہ باہر تشریف لائے۔ علماء کے مانگنے سے یہ نتائج پیدا ہو گئے ہیں علماء کو مانگتے دیکھ کر جاہلوں نے بھی مانگنا اختیار کر لیا۔ مولویوں کی وضع بنالی ان کا نام بھی مولوی ہو گیا۔

بھک منگوں کا نام مولوی ہو گیا ہے

بھک منگوں کا نام مولوی؟ حیرت کی بات ہے۔ بوڑھانہ میں ایک واعظ آئے پھر وہ آٹھ آنہ سے لیکر پانچ روپیہ تک کا وعظ کہتے تھے لا الٰہ الا اللہ ان کا نام بھی مولوی صاحب تھا۔ ایک مولوی صاحب (ایسے ہی نام کے مولوی) نے وعظ کہا انا اعطینک الکوثر کا ترجمہ کیا: دیا ہم نے تجھ کو

مثل کوثر کے۔ ایک صاحب علم نے ان سے پوچھا مثل کا ہے کے معنی ہیں؟ کہنے لگے ایک کاف تشبیہ کا ہوتا ہے۔ سائل نے کہا وہ تو ایسے موقع پر گول گول لکھا جاتا ہے غنیمت ہے مان گئے اور کہا مجھکو معلوم نہ تھا خیر ان کی سمجھ میں تو آ گیا۔

ایک اور صاحب نے میرے سامنے وعظ کہا تھا اور ذلکم خیر لکم ان کنتم تعلمون. (سورة الجمعة، ۹) کا یہ ترجمہ کیا تھا: تمہارے لئے یہ بہتر ہے کہ جمعہ کی نماز کے وقت دکانوں کو تالا لگا کر مسجد میں آیا کرو۔ تعل کو تو تالا سمجھے اور مون کو موند سمجھے بند کرنے کے معنی میں۔ یہ حالت واعظوں کی رہ گئی ہے اور قوم کی یہ حالت ہے کہ جو منبر پر بیٹھ گیا وہ مولوی ہے مجھ سے بعض لوگ مسئلہ پوچھتے ہیں پھر کہتے ہیں کہ ایک مولوی صاحب آئے تھے وہ تو یوں کہتے ہیں۔ میں کہہ دیتا ہوں کہ کیا میں تمام دنیا کے گشتی مولویوں کا ذمہ دار ہوں۔

ہر شخص کا وعظ نہ سننا چاہئے

یہ خرابی قوم کی بے توجہی سے ہے۔ اگر ہر شخص کا وعظ نہ سنیں اور یہ قید لگا دیں کہ کسی معتبر عالم سے اپنے عالم ہونے کی تصدیق کراؤ جب ہم وعظ سنیں گے تو یہ راستہ ہی بند ہو جاوے گا اور سندوں کا اعتبار ہرگز نہ کیا جائے جعلی سند تو ہر کوئی بنا سکتا ہے جب وہ تصدیق نہ کرا سکا تو ایسوں کے ساتھ صرف یہ سلوک کر دیں کہ ان کو کھانا کھلا دیا اور وعظ سے منع کر دیا۔

میں خدمت سے منع نہیں کرتا۔ حسب موقع و محل خدمت کر دو کیونکہ ممکن ہے کہ وہ محتاج اور واجب الخدمۃ ہوں مگر وعظ کسی کا نہ سنیں سوائے مستند اور مصدق شخص کے اور خدمت کے باب میں یہ مسلک رکھیں۔

خورش دہ بہ کنجشک و کبک و حمام　　　کہ شاید ہمائے درافتد بدام[۱]

پیرزادوں کے ساتھ برتاؤ

پیپاڑ ایک جگہ ہے وہاں میں ایک جلسہ میں گیا ہوا تھا کہ ایک پیر صاحب تشریف لائے اور ان کے ساتھ ایک لسّان مولوی صاحب بھی تھے انکو اس واسطے لائے تھے کہ اگر میں پیرزادوں کی خدمت سے منع کروں تو وہ مجھ سے مناظرہ کریں۔ اتفاق سے میں نے وعظ میں یہ بیان کیا کہ صاحبو!

---

۱ چڑیا، چکور، کبوتر سب کو خوراک دیتے رہو شاید کوئی ہما پرندہ جال میں پھنس جائے ۲:۔ باتونی

پیرزادوں کی خدمت تو خوب کرو کیونکہ یہ بزرگ زادے ہیں مگران سے حاصل کچھ مت کرو کیونکہ وہ دین کونہیں جانتے۔ یہ خدمت تعلیم کی مولویوں سے لو یعنی ان سے وعظ کہلاؤ، مسئلے مسائل پوچھو مگر وعظ کے بعدان کی مالی خدمت کچھ نہ کرو۔ پس مالی خدمت کیلئے تو پیروں کو رکھو اور دین حاصل کرنے کیلئے ہم طالبعلموں کو رکھو چاہے اور ہمیں کچھ نہ دو۔ اس جملہ سے وہ پیر صاحب گویا مرید ہو گئے۔ پھر مجھے داعی نے جو رئیس شخص تھے سو روپیہ کا نوٹ دیا مگر میں نے سفر خرچ کے سوا کچھ نہ لیا۔ صاحبو! اگر دین سے معاملہ درست ہوتا تو چندہ میں کچھ خرابی نہ تھی۔

علماء دین کی خدمت کریں اور اہل دنیا علماء کی

ہمارے ذمہ تمہارے دین کی خدمت ہے اور تمہارے ذمہ ہمارے تن کی خدمت ہے انصاف کی بات تو یہ ہے لیکن اب انصاف نہیں رہا مگر میں علماء سے کہتا ہوں کہ اس کا استغاثہ کسی انسان کے پاس نہ لیجاؤ بلکہ حق تعالیٰ کے پاس لے جاؤ اور اپنا کام کئے جاؤ حق تعالیٰ خود آپ ہی سنیں گے۔ میں نے تو اپنا طرز عمل یہی رکھا ہے۔

ہدایا لینے میں حضرت والا کا طرز عمل

اس میں تو شک نہیں کہ میں لیتا ہوں۔ میرا اور کوئی ذریعۂ معاش نہیں مگر چند شرطوں کے ساتھ لیتا ہوں مثلاً جب تک یہ نہ دیکھ لوں کہ اس ہدیہ دینے والے کو محبت کا جوش ہے اور بلا کسی غرض کے دیتا ہے اور ہدیہ قبول کر لینے میں کوئی خرابی اس وقت اس کیلئے یا میرے لئے یا کسی شخص کیلئے نہیں ہے، نہ آئندہ کسی خرابی کا احتمال ہے، نہ کسی قسم کا دباؤ پڑے گا، نہ اس شخص کو حق بات کہنے میں وہ ہدیہ مجھے کچھ مانع ہوگا۔ یہ سب باتیں دیکھ لیتا ہوں اور مقدار بھی اس کی یہی رکھی ہے کہ ایک مہینہ میں ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہیں لیتا ہوں حتیٰ کہ جس کے یہاں وعظ ہوتا ہے، اسکے یہاں اس دن بلکہ اس سے اگلے دن بھی کھانا نہیں کھاتا ہوں۔

غرض لیتا ضرور ہوں مگر اس طرح کہ نہ ایمان فروشی ہو، نہ حیا فروشی ہو، نہ عزت فروشی ہو ورنہ یہ اگر احتمالاً بھی معلوم ہو جائے کہ ذرا آنکھ نیچی ہو گی تو ہفت اقلیم[۱] کی سلطنت بھی بحمد اللہ میرے نزدیک کچھ نہیں۔ مجھے فاقہ سے بیٹھا رہنا اور گھر کے اندر مر جانا گوارا ہے مگر کسی کے سامنے مہذب یا غیر مہذب پیرایہ میں بھی اپنی حالت کا ظاہر کرنا گوارا نہیں اور یہ فخر نہیں، شکر ہے۔ جو رقم آن بان کے

---

[۱]: یعنی ساری دنیا کی حکومت

ساتھ آوے وہ عطیۂ الٰہی ہے، اس سے ناک بھوں چڑھانا تکبر اور ناشکری ہے۔ گویہ مضمون بحث سے خارج ہے مگر اس وجہ سے زبان پر آ گیا کہ مفید ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میرے دوست بھی ایسا کریں اس لئے بیان کر دیا۔

ایک شخص نے میرے پاس پانچ روپیہ بھیجے اور یہ لکھا کہ یہ روپے طالبعلموں کے واسطے ہیں اور میری فلاں حاجت کیلئے ان سے دعا کرا دیجئے میں نے وہ روپیہ واپس کر دیا اور لکھدیا کہ طالبعلم اس کام کیلئے نہیں ہیں۔ وہ روپیہ واپس آیا اور اس شخص نے لکھا کہ میں دعا بھی نہیں چاہتا طالبعلموں کیلئے بھیجتا ہوں تب میں نے لے لئے۔ دیکھئے اب ہوا ہدیہ، وہ کیا ہدیہ ہے جس میں اپنی غرض بھی شامل ہو۔ حق تعالیٰ کا ارشاد تو یہ ہے انما نطعمکم لوجه الله لا نريد منكم جزاء و لا شكوراً ۱ اس میں جزاء نکرہ ہے یعنی کوئی بھی بدلہ نہیں چاہتے حتیٰ کہ دعا بھی نہیں اور شکوراً کے لفظ سے اس کی اور تاکید ہوگئی۔ مطلب یہ ہوا کہ اور کسی قسم کا بدلہ تو درکنار وہ تو خالی شکریہ بھی نہیں چاہتے۔

جلسوں میں شکریہ کرنے کی بدرسم

اسی وجہ سے میرا مشرب یہ ہے جو میں نے مؤتمر الانصار میں کہا تھا کہ دینی کاموں میں چندہ دینے والوں کیلئے ہمارے منہ سے قیامت تک یہ پانچ حرف نہیں نکل سکتے یعنی شکریہ کیونکہ ہمارے اوپر چندہ دینے والوں کا کیا احسان ہے۔ اگر آپ لوگ جلسہ میں آئے ہیں یا کچھ خرچ کریں گے تو یہ سب اپنے واسطے ہے کیونکہ دین کی امداد ہر مسلمان کا فرض منصبی ہے تو اب جلسہ میں اپنے کام کیلئے آئے ہو اور امداد اپنے فرض کو ادا کرنے کیلئے کی، جس سے مقصود ثواب اور رضائے الٰہی ہے۔ ہمارے اوپر کون سا احسان کیا ہے جو ہم اسکا شکریہ ادا کریں۔

اور بطور وظیفہ کے یہ بھی کہہ دیا کہ جو لوگ چندہ دینے والوں کا شکریہ ادا کرتے ہیں اس سے تو یہ شبہ ہوتا ہے کہ وہ اس رقم کو اپنے واسطے سمجھتے ہیں اور خود کھالیں گے ورنہ کیا وجہ ہے شکریہ ادا کرنے کی؟ جیسے بانیانِ جلسہ قوم کے ایک فرد ہیں، ایسے ہی شرکاء جلسہ بھی ایک فرد ہیں۔ انہوں نے اپنا کام کیا، انہوں نے اپنا کام کیا اور اگر یہی ٹھہری ہے کہ ایک، دوسرے کا شکریہ ادا کرے تو آپ بھی شکریہ ادا کیجئے ہم بھی ادا کریں گے اس صورت میں شکریہ کی رسم ایک گدھا کھجادن ۲ کی رسم بن جائے گی۔

۱:۔ ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں، نہ تم سے بدلہ چاہیں اور نہ شکریہ (سورۃ الدھر، ۹) ۲:۔ گدھے ایک دوسرے کو کھجاتے ہیں

شرکائے جلسہ کو علماء کا شکریہ ادا کرنا چاہئے

بلکہ انصاف تو یہ ہے کہ پہلے تم ہمارا شکریہ ادا کرو کیونکہ جلسہ تمام قوم کا ہے اس کے انتظام کا بار جو ہم نے اٹھایا ہے اسکا احسان آپ پر ہے یا نہیں؟ کسی اور نے نہ اٹھالیا اور یہ کام ہم نے پہلے کیا اس لئے ہمارا شکریہ پہلے ادا کیا جائے اس کے بعد ذرا دیر کیلئے آپ بھی جلسہ میں آگئے اور کچھ رقم دے گئے اور بس فارغ ہو گئے۔ ہم نے تو انتظام میں بہت وقت خرچ کیا اور اب تک ہمارا کام ختم نہیں ہوا بلکہ اس کے بعد وصول شدہ رقم کی حفاظت کریں گے اور اسکی ذمہ داری لیں گے۔ آپ کا کام تو گھنٹہ آدھ گھنٹہ کا ہے اور ہمارے ذمہ تو یہ بلا مہینوں اور برسوں کیلئے ہے بلکہ تمام عمر کیلئے لگ گئی۔ اب بتائیے قوم کا کام ہم نے زیادہ کیا یا تم نے؟ اور شکریہ آپ کے ذمہ زیادہ واجب ہوا یا ہمارے ذمہ؟ مگر عجیب الٹی رسم پڑ گئی ہے کہ کم کام کرنے والے زیادہ کام کرنے والوں سے شکریہ چاہتے ہیں اور وہ بھی خواہ مخواہ شکریہ ادا کرتے ہیں۔ اس سے تو پتہ چلتا ہے کہ کچھ دال میں کالا ہے جس سے بانیان مدرسہ کی آنکھ نیچی ہے۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا اس میں کچھ بناوٹ نہیں۔

میں واللہ دل سے کہہ رہا ہوں کہ جہاں دینے والے کے خیال میں ہم کو شکریہ ادا کرنا پڑے مجھے تو اس جگہ سے کچھ بھی لیتے ہوئے سخت غیرت آتی ہے۔ میں تو اسکا ہدیہ قبول کرتا ہوں جسکو شکریہ کا وہم بھی نہ ہو۔ اس آن بان کے ساتھ جو ملتا ہے وہ نعمتِ خداوندی ہے۔ ہدیہ سے مطلقاً انکار کرنا تکبر ہے۔ حضور ﷺ نے ہدیہ لیا ہے پھر ہمارا کیا منہ ہے کہ اس سے استنکاف[۱] کریں مگر اس کیلئے کچھ اصول اور شرائط ہیں شریعت میں مصرح یا اس سے مستنبط[۲] ہیں۔

ہدیہ کے عام اصول

چنانچہ میں ہدیہ کے عام اصول عرض کرتا ہوں وہ یہ ہیں کہ ہدیہ کسی کے مکان پر نہ لے اپنے صدر مقام پر لے۔ اپنا مقام ہدیہ کیلئے ہیڈ کوارٹر رکھے یا بذریعہ منی آرڈر تو لے لے، کوئی گھر پر بلا کر دے تو ہرگز نہ لے۔ ایک جگہ ایک شخص مجھے گھر پر لے گئے اور کچھ پھل سامنے رکھ دئے میں نے کھالئے، پھر کچھ روپیہ دینے لگے میں نے وہ نہ لیے۔ بہت اصرار کیا مگر میں نے کہا کہ میری مصلحتوں میں دخل نہ دیں۔ وہ مصلحت یہ تھی کہ انکے علاوہ بھی بعض اہلِ محبت مجھے اپنے گھر لے جانا چاہتے ہیں مگر وہ غریب ہیں، کچھ ہدیہ نقد نہیں دے سکتے اس واسطے وہ مجھے نہ لے جاسکیں گے۔ جب یہ بات

---

[۱] انکار کرنا، حقارت سے دیکھنا [۲] کھول کر بیان کی گئی ہیں یا قرآن وسنت سے نکلتی ہیں

لوگوں کو معلوم ہوگئی کہ کسی کے مکان پر جا کر میں نہیں لیتا ہوں تو سینکڑوں بلانے والے پیدا ہو گئے مگر وہ بہت خفا ہوئے کہ یہ پیچ اور چال ہے تا کہ شہرت زیادہ ہو۔ میں نے کہا چال اور پیچ ہی سہی مگر ایذاء رساں چال اور پیچ تو نہیں۔ لوگوں کو کچھ فائدہ ہی پہنچا۔ یہ ہیں اصول ہدیہ کے، نیز لینے والے کو چاہئے کہ دینے والے کی گنجائش بھی دیکھ لے اگر چہ دینے والا امیر ہی ہو۔

ہدیہ لینے میں بنسبت غرباء کے امراء زیادہ قابل رحم ہیں

میں سچ عرض کرتا ہوں کہ مجھے بنسبت غریبوں کے امیروں پر زیادہ رحم آتا ہے۔ غریب کا تو یہ ہے کہ اگر وہ دو پیسہ بھی دے اور کوئی یہ بھی کہہ دے کہ کچھ نہیں دیا تو اس کی شان نہیں گھٹتی۔ سب جانتے ہیں کہ غریب ہے اور بڑے لوگ شان سے کم دینے کو اپنی ذلت سمجھتے ہیں۔ پس جب امیر ہدیہ دیں تو اس بات کو ضرور دیکھ لینا چاہئے کہ اتنا دینے کے قابل بھی ہیں یا نہیں کیونکہ امراء دیکھنے میں تو سب کچھ کرتے ہیں مگر بسا اوقات مقروض ہوتے ہیں۔ ان کے سامان، ٹھاٹھ کو دیکھ کر لوگ ان کو بڑا آدمی سمجھتے ہیں حالانکہ آمدنی اور خرچ دونوں کو دیکھنا چاہئے، جسکی آمدنی زیادہ ہو اسکو امیر کہنا چاہئے اور جسکا خرچ آمدنی سے زیادہ ہو وہ ہرگز امیر نہیں بلکہ غریب ہے۔ آجکل اکثر جگہ یہی حالت ہے کہ ہزار کی آمدنی تو ڈیڑھ ہزار کا خرچ ہے اور یہ آجکل بڑا حوصلہ کہلاتا ہے۔ کہتے ہیں فلا نا رئیس ایسا عالی حوصلہ ہے کہ ایک پیسہ اپنے پاس نہیں رکھتا اور اپنی حیثیت سے زیادہ خرچ کرتا ہے (عقلاء کے نزدیک تو یہ بے وقوفی ہے) بہت جگہ صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ ہے، کپڑے ہی کپڑے ہیں کھانے کو پیٹ بھر روٹی بھی میسر نہیں اور ریاست تو کہاں۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

ہے شرافت تو کہاں بس شر و آفت ہے فقط　　　ست ریاست سے گیا صرف ریا باقی ہے

مگر دیکھنے والے کو یہ کیسے معلوم ہوسکتا ہے کہ ان کی حالت کیا ہے اور ہم کو اس کا بھی کیا حق حاصل ہے کہ کسی کے خزانہ کی جانچ کریں لہذا حکم عام بھی مناسب ہے کہ امراء سے ہدیہ کم لیں۔ ان سے زیادہ لینا انکو تکلیف پہنچانا اور اخذِ مالِ مسلم بغیر طیبِ نفس ہے جو حرام ہے۔

ہدیہ کے متعلق عقلی التزامات

یہ تو ہدیہ کے متعلق شرعیات تھے یعنی وہ باتیں تھیں جن کی رعایت شرعاً واجب ہے اور کچھ عقلی التزامات بھی ہیں جو تجربہ سے ضروری معلوم ہوئے۔ وہ یہ ہیں کہ میں کسی شخص سے ایک مہینہ میں ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہیں لیتا۔ بعضوں نے یہ ترکیب کی کہ ایک دن آ کر ایک دن کی آمدنی کے

برابر دے گئے اور دوسرے دن پھر دینا چاہا اور کہا: دیکھ لیجئے یہ ہدیہ اس قاعدہ کے اندر ہے کیونکہ ایک دن کی آمدنی سے زیادہ نہیں۔ میں نے ایک قاعدہ بڑھا دیا کہ دو ہدیوں میں کم از کم ایک مہینہ کا فصل ہو۔ نیز میری رائے یہ ہے کہ کسی سے اول ملاقات میں ہدیہ نہ لے اور یہ کہ ہر ملاقات میں نہ لے کیونکہ اس سے ملاقات قطع ہو جاتی ہے اس واسطے کہ جب تک اس کے پاس نہ ہو اس وقت تک آنے کی ہمت نہ ہو گی نیز اس سے لینے والے کے دل میں طمع پیدا ہو گی کہ جب آنے والے کی صورت دیکھے گا نفس خوش ہو گا کہ کچھ لایا ہو گا۔ آجکل مشائخ اسکا خیال بالکل نہیں کرتے۔ بقول حضرت گنگوہیؒ کے کہ آجکل پیروں کی یہ حالت ہے کہ مریدان کے سامنے سر بھی کھجلانے لگے تو خیال ہوتا ہے کہ پگڑی سے کچھ نکال کر دے گا۔ پس پیر کے ساتھ یہ برتاؤ کبھی نہ کرے کہ بلا ہدیہ اس کے پاس جاوے ہی نہیں اس سے وہی نقصان ہوتا ہے کہ پیر کی نیت بگڑتی ہے تو یہ کیا انصاف ہے کہ پیر تو تمہارا دین سنوارے اور تم اس کا دین بگاڑ دو۔

پس چاہئے کہ کبھی لاؤ اور کبھی نہ لاؤ بلکہ کبھی کچھ ان کے پاس سے لے جاؤ۔ یہ بات ازراہ تفاخر نہ سمجھئے گا خدا کی نعمت سمجھ کر عرض کرتا ہوں کہ بحمد اللہ میں تو بہتیروں کی خدمت کر دیتا ہوں کیونکہ ہمیشہ لینے سے نیت بگڑتی ہے اور بزرگوں نے نیت بگڑنے سے بڑی احتیاط کی ہے۔

بلگرام کے ایک بزرگ کا قصہ

بلگرام میں ایک بزرگ تھے، انکو فاقہ تھا۔ ایک مرید کو آثار سے یہ بات معلوم ہو گئی کہ شیخ کو آج فاقہ ہے۔ وہ اٹھ کر گئے اور ایک خوان میں کھانا لگا کر شیخ کے سامنے لائے شیخ نے اسکے لینے سے عذر کیا۔ انہوں نے کہا حضرت یہ تو ہدیہ ہے اور بلا سوال کے آیا ہے اس کے قبول کر لینے میں کیا حرج ہے؟ شیخ صاحبِ نسبت بھی تھے نرا مولوی ایسا نہیں کر سکتا، صاف کہہ دیا کہ بیشک یہ ہدیہ ہے اور خلوص سے بھی ہے اور مجھے حاجت بھی ہے مگر اس وقت اس کا قبول کرنا سنت کے خلاف ہے کیونکہ حدیث میں آیا ہے ما اتاک من غیر اشراف نفس فخذه[۱] اور اس وقت یہ ہدیہ اشرافِ نفس[۲] کے بعد آیا ہے کیونکہ جس وقت تم اٹھ کر چلے تھے میں اسی وقت سمجھ گیا تھا کہ کھانا لینے گئے ہو۔ اس وقت سے برابر نفس کو اشتیاق اور انتظار لگا ہوا تھا یہی اشرافِ نفس ہے۔ مرید بھی سمجھ دار اور مخلص تھا اس نے کچھ اصرار نہ کیا اور کھانے کا خوان اٹھا کر واپس لے چلے۔ شیخ کے حکم کے سامنے اور حدیث کے سامنے انہوں نے کچھ تاویل نہیں کی (صحیح عقل بھی نعمت ہے) ہم سوال[۳] ہوتے تو کہتے حضرت قبول فرما لیجئے

---

۱ جو ہدیہ نفس کے لالچ اور انتظار کے بغیر حاصل ہو، اسے لے لو ۲ نفس کا انتظار ۳ ہم جیسے

گویہ قبول کرنا ایک معنی کر خلاف سنت سہی مگر نہ لینے میں مُہدی ا کی دل شکنی ہے اور دل شکنی کی ممانعت ہے (سبحان اللہ تمہاری دل شکنی نہ ہو چاہے پیر صاحب کی دین شکنی ہو جائے یعنی ان کا دین تباہ و برباد ہو کر پاش پاش ہو جائے)

بزرگوں کی صحبت انسان کو انسان بنا دیتی ہے اور جب سچی محبت ہوتی ہے تو کام کے طریقے خود بخود سمجھ میں آجاتے ہیں چنانچہ وہ خوان واپس لے گئے حتی کہ پیر صاحب کی نظر سے غائب ہو گئے اور وہاں سے پھر لوٹا کر لے آئے اور سامنے رکھ دیا کہ حضرت اب تو لے لیجئے اب تو اشراف نفس جاتا رہا۔ شیخ نے مرید کو گلے سے لگا لیا اور ہدیہ قبول فرما لیا دیکھئے شریعت سے عقل کیسی درست ہو جاتی ہے۔

عقل اہل اللہ ہی میں منحصر ہے

میں تو دعوی سے کہتا ہوں کہ عقل تو اہل اللہ ہی میں منحصر ہے۔ ہاں تجربہ اور بات ہے جو دنیاداروں کو بھی حاصل ہو جاتا ہے۔ اہل اللہ عقیل ۲ ہوتے ہیں گو بعض امور کا تجربہ نہیں رکھتے جیسے کوئی چیز ایجاد کرنا یا تجارت وحرفت کے کاموں میں ہوشیار ہونا کیونکہ ایجادات اور صنائع وغیرہ میں عقل کی ضرورت نہیں، تجربہ اور مشق کی ضرورت ہے اور تجربہ عقل سے جدا چیز ہے۔ اگر تجربہ کاری کا نام عقل ہے تو ایک ایل ایل بی پاس شدہ کو کپڑا بننا بھی آنا چاہئے حالانکہ مشاہدہ اس کے خلاف ہے۔ ایک معمولی سے معمولی بے وقوف بھی ایل ایل بی صاحب سے کپڑا بننے میں بڑھا ہوا ہے تو آپ کے قاعدے کے موافق اس بے وقوف کو ان سے زیادہ عقلمند کہنا چاہئے حالانکہ کوئی بھی نہیں کہتا۔ وجہ یہی ہے کہ وہ کپڑا بننے کا تجربہ رکھتا ہے اور ایل ایل بی صاحب یہ تجربہ نہیں رکھتے تو وہ تجربہ سے اس کام میں بڑھ گیا نہ کہ عقل سے۔ ثابت ہوا کہ عقل اور چیز ہے اور تجربہ اور چیز۔

عربی خواں اور انگریزی خواں کا سوال وجواب

ایک عربی مدرسہ کے طالبعلم سے ایک سائنس داں، اسکول کے طالبعلم نے پوچھا بتاؤ آسمان میں کل کتنے ستارے ہیں؟ اس نے جواب دیا کہ تم بتادو کہ سمندر میں کتنی مچھلیاں ہیں؟ اس نے کہا یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ کہا تو افسوس ہے تم کو زمین کی چیزوں کا بھی پورا علم نہیں جس میں تم رہتے ہو

ا ہدیہ دینے والے کی ۲ عقل مند

اور مجھ سے آسمان کی چیزوں کی تعداد پوچھتے ہو جو تم سے ہزاروں کوس دور ہے۔ پس وہ چپ ہی تو رہ گئے۔

دیکھئے ان دونوں میں کون زیادہ عقلمند تھا۔ آجکل کے عقلمندوں کی یہی غلطی کیا تھوڑی ہے کہ عقل اور تجربہ کو ایک رکھتے ہیں۔ غرض اہل اللہ میں عقل کامل ہوتی ہے ان کی صحبت میں بھی آدمی عقلمند بن جاتا ہے دیکھ لیجئے کتنی بڑی عقل کا کام اس مرید نے کیا کہ کام بھی کر لیا اور دین کی حفاظت بھی رکھی۔ پس اگر آدمی میں دین اور عقل ہو تو پچاس طرح خدمت کر سکتا ہے۔ یہ کیا ضرور ہے کہ ایسی طرح دے کہ اپنا مال ضائع ہو اور دوسرے کا دین ضائع ہو۔ یہ اصول ہیں ہدایا کے کہ ان کی پابندی کے ساتھ ملے تو نعمت خداوندی ہے اور اس سے استنکاف [1] تکبر ہے جو اعلیٰ درجہ کا عیب ہے اور اگر آبرو بگڑے یا دینے والے کو یا لینے دینے والے کو ایذاء ہو تو وہ ہرگز اس قابل نہیں کہ اس کی طرف آنکھ بھی اٹھائی جائے۔ آجکل کے ہدایا اور چندے اکثر کسی نہ کسی خرابی کو ضرور مستلزم ہوتے ہیں۔

اگر علماء زبان کو چندہ سے روک لیں تو اس طرح حق تعالیٰ بے گمان پہنچاویں گے کہ انسان کی عقل حیران رہ جائے گی جس کا جی چاہے آزمالے۔ مجھے تو ہر روز تجربہ ہوتا ہے کہ میں نے کسی شرط کے خلاف ہونے کی وجہ سے کو یہ ہدیہ رد کر دیا تو اس سے زیادہ بہت ہی قریب وقت میں آ گیا۔

اگر علماء حق تعالیٰ کا کام کریں گے تو کیا حق تعالیٰ ان کو بھول جائیں گے؟

حیرت کی بات ہے کہ جب علماء حق تعالیٰ کا کام کریں گے تو کیا حق تعالیٰ ان کو بھول جائیں گے؟ وہ تو سرکاری ملازم ہوں گے تو کیا سرکاری ملازم کو کفایت کا سامان نہیں ملے گا؟ گورنمنٹ کا جو کوئی کام کرتا ہے اسکی کفیل گورنمنٹ ہوتی ہے پھر اس کفالت کے بعد سرکاری ملازم مثلاً ایک تحصیلدار یہ پیشہ اختیار کرے کہ مانگنے، کھانے لگے تو کیا گورنمنٹ کے نزدیک معتوب نہ ہوگا۔ عالم کو تو یہ چاہئے کہ چندہ ہاتھ میں بھی نہ لے چہ جائیکہ مانگے۔

اے دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگوں باشی　　　　بے زر و گنج بصد حشمت قاروں باشی [2]

---

[1] انکار کرنا، حقارت سے دیکھنا [2] اے دل! سرخ شراب سے لت، پت ہو جانا بہتر ہے۔ بغیر سونے، خزانے کے تم سو عزت کے ساتھ قارون ہو جاؤ گے۔

اور یہ حالت ہونا چاہیئے۔

لنگلکے زیر، لنگلکے بالا　　　　نے غم دزد، نے غم کالا[۱]

اگر کپڑے نہیں ہیں تو پھٹے ہوئے کپڑے پہنیں، پیوند لگے ہوئے پہنیں اور غریبوں اور نوابوں کی پرواہ نہ کریں اپنے فاقہ میں ہی مست ہوں۔ مرجائیں مگر سوال نہ کریں۔ کسی سے آنکھ ان کی نہ لچے، اپنے خدا سے کام رکھیں۔

تکبر اور استغناء میں فرق

اس کا مطلب یہ نہیں کہ کسی سے سیدھے منہ بات نہ کریں یا کسی کو سخت سست کہیں، گالیاں بکیں۔ ہرگز نہیں یہ تو تکبر ہے۔ سخت کلامی، سخت عیب ہے اور دل آزاری اور توہین ادنی سے ادنی کی بھی جائز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ حاجت کسی کے سامنے نہ لے جائیں اور تملق[۲] اور خوشامد کسی کی نہ کریں اور انتظار کسی کا نہ کریں۔ یہ معنی ہیں بے پرواہ ہونے کے، نہ یہ کہ تہذیب چھوڑ دیں، شریعت کو چھوڑ دیں۔ شریعت نے تہذیب کو دین کا بڑا جزو قرار دیا ہے۔

بعض لوگ استغناء اور دل آزاری اور تکبر میں فرق نہیں کرتے اور اپنا یہ شعار رکھتے ہیں کہ آنیوالوں کو دور دبک کرتے ہیں خاص کر امراء اور بڑے طبقہ کے لوگوں کو اور حقیقت اسکی استغناء اور لاپرواہی نہیں ہے بلکہ اپنی احتیاج کو ایک بلیغ طریقے سے پیش کرنا ہے۔ اصل بات چھپتی نہیں ہے، کبھی نہ کبھی ظاہر ہو جاتی ہے اس وقت ان ہی لوگوں کو اس وقت دور دبک کے وقت ہاتھ جوڑتے اور جی حضور کرتے تھے، نفرت ہو جاتی ہے اور کہتے ہیں، سب ڈھونگ ہے یہ تو بڑا امکار شخص ہے۔ غرض یہ استغناء نہیں بلکہ مکر ہے

استغناء کی حقیقت اختیار کرنی چاہیئے

انسان کو استغناء کی حقیقت اختیار کرنی چاہیئے اس میں خود یہ اثر ہے کہ دنیا کھچی چلی آئے گی۔ مگر خدارا محض اس نیت سے استغناء نہ کرنا۔ محض للہ مستغنی بننا چاہیئے اور کسی کے سامنے سوائے حق تعالیٰ کے ہاتھ نہ پھیلایئے۔ یہ طریقہ علماء نے چھوڑ دیا اسی وجہ سے ان کی بات میں اثر نہیں رہا۔ ہاتھ پھیلانے کی بدولت نظروں میں ذلیل ہو گئے۔ اسی وجہ سے امراء اپنے بچوں کو عربی نہیں پڑھاتے

---

[۱] ایک چادر اوپر، ایک نیچے۔ نہ چور کا ڈر، نہ ڈاکو کا [۲] چاپلوسی

اور بعض تو صاف کہتے ہیں کہ ہمکو اپنی اولاد کو گدا بنانا منظور نہیں۔ یہ عذر گو ان کا کافی نہ ہو مگر اصلیت تو رکھتا ہے اس واسطے علماء اس اعتراض سے بالکلیۃ نہیں بچ سکتے اور یہ طریقہ انکا فی نفسہ برا ہونے کے علاوہ اس مفسدہ کو بھی مستلزم ہے کہ لوگوں کو مانع عن تعلیم الدین[۱] ہے۔ غرض دونوں طرف سے خرابی ہے۔ مقتداؤں کی طرف سے بھی اور مقتدیوں کی طرف سے بھی مگر زیادہ الزام قوم پر ہے جیسا کہ میں نے بیان کیا کہ جو کچھ خرابی علماء میں ہے وہ قوم کے غلط انتخاب کی وجہ سے ہے ورنہ علم دین ایسی چیز نہیں جو کسی کو بگاڑے وہ تو بگڑے ہوؤں کو بنانے والا ہے اور مُردے میں جان ڈالنے والا ہے۔

باوجود کوتاہیوں کے علم کا اثر ہوتا ہی ہے

دیکھ لیجئے باوجود بہت سی کوتاہیوں کے ان نا قابل لوگوں میں سے بھی جن پر علم کا اثر پورا ہو جاتا ہے وہ کس درجہ شائستہ ہو جاتے ہیں۔ اچھے اچھے لوگ ان کے ہاتھ پیر چومتے ہیں۔ یہ اس علم ہی کا اثر ہے یا کچھ اور؟ مگر شکایت یہ ہے کہ ایسے لوگ کم پیدا ہوتے ہیں اور یہی شکایت ہم بھی کرتے ہیں اور قوم بھی کرتی ہے لیکن یہ غور نہیں کرتے کہ یہ شکایت کیوں پیدا ہوئی اور اس میں قصور کس کا ہے؟ میں نے اسی کو اپنی تقریر میں بیان کیا کہ تمام خرابی اور الزام قوم پر عائد ہوتا ہے اور خیر کسی حد تک حالت موجودہ کے اعتبار سے میں یہ بھی تسلیم کئے لیتا ہوں کہ کسی قدر کوتاہی علماء کی طرف سے بھی ہے اور دونوں کو اصلاح کی طرف توجہ دلاتا ہوں کہ ان موانع کو مرتفع کریں جو تعلیم دین میں حارج[۲] ہیں تا کہ تعلیم دین عام اور تام ہو۔

علماء اپنا کام کریں اور قوم اپنا کام کرے

علماء اپنی عادات واخلاق کو درست کریں اور قوم حیلہ بہانہ چھوڑ دے۔ یہ مضمون اس سے شروع ہوا تھا کہ لوگ تلاوت قرآن نہیں کرتے اور اس کیلئے یہ حیلہ چھانٹا ہے کہ سمجھ کر پڑھنے کی تو قابلیت نہیں اور بے سمجھے پڑھنے سے کیا فائدہ؟ اس کا حاصل یہ ہوا کہ تلاوت اڑا ہی دی جائے۔ میں کہتا ہوں دو شقیں تو آپ نے نکالیں مگر ایک چھوڑ دی وہ یہ کہ اگر بے سمجھ کر پڑھنا آپ کے نزدیک بے کار ہے تو سمجھ کر پڑھنے کو کس نے منع کیا ہے اور جو عذر آپ نے گھڑ رکھے ہیں وہ سب بیکار ہیں جیسا کہ میں نے تفصیل کے ساتھ عرض کر دیا۔

---

[۱] دینی تعلیم سے روکنے والی [۲] رکاوٹ

تلاوتِ قرآن کی اہمیت اور امام احمد بن حنبلؒ کا واقعہ

اب میں عود[1] کرتا ہوں اصل بات کی طرف وہ یہ کہ آیت میں تلاوت کا امر[2] ہے اور اسکو دوسری عبادت سے مقدم[3] کیا گیا ہے۔ اس سے کس قدر فضیلت اور تاکید تلاوت کی نکلتی ہے اور آیت میں سمجھ کر پڑھنے کی بھی کوئی قید نہیں۔ حضرت امام احمد بن حنبلؒ نے اللہ تعالیٰ کو خواب میں دیکھا عرض کیا کوئی عمل ایسا ارشاد ہو جس سے آپ کا خاص قرب حاصل ہو۔ ارشاد ہوا تلاوتِ قرآن۔ انہوں نے عرض کیا سمجھ کر یا بلا سمجھے؟ ارشاد ہوا سمجھ کر ہو یا بلا سمجھے۔

حضرت قرآن وہ چیز ہے کہ اسکا ہمکو عطا ہونا یہ محض موہبت خداوندی[4] ہے جس میں ہمارے اختیار کو کوئی دخل نہیں اسی معنی کر فرمایا ہے اولم یکفھم انا انزلنا الکتاب یتلی علیھم[5] یعنی ''جو لوگ معجزات مانگتے ہیں کیا یہ کافی معجزہ نہیں ہے کہ ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے، انکو دیدی ہے جو ان پر پڑھی جاتی ہے''۔ معجزہ اسی بات کو کہتے ہیں جو انسانی طاقت سے باہر ہو۔ معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کا ہمارے ہاتھوں میں ہونا ایسی بات نہیں تھی کہ ہم اسکو کسی طاقت اور کسی کوشش سے حاصل کر سکتے۔ یہ نمونۂ رحمت ہے کہ وہ بے دریغ ہمارے پاس ہے۔

صاحبو! بخدا اس وقت وہ چیز ہمارے پاس ہے جو تمام دنیا کی کوشش سے بھی نہیں مل سکتی۔ اگر کسی سے ان پڑھ ہونے کے سبب اس کا پڑھنا بھی نہ ہو سکے تو زیارت ہی کر لیا کرے۔ دیکھئے آج کوئی چیز ایسی آجاوے جو کمیاب ہو اور جو ہر جگہ نہ مل سکتی ہو تو لوگ دور دور سے اس کو دیکھنے کیلئے آویں۔ عجائب خانہ دیکھنے کیلئے کہاں کہاں سے لوگ پہنچتے ہیں اس کی بھی تو اصل ہے کہ وہاں وہ چیزیں ہیں جو ہر جگہ نہیں مل سکتیں حالانکہ اس کو دیکھنے سے کچھ آمدنی بھی نہیں ہوتی بلکہ کچھ نقصان ہی ہو جاتا ہے۔ روپیہ خرچ ہوتا ہے، ٹکٹ لگتا ہے تو جب قرآن شریف ایسی چیز ہے کہ دنیا بھر کی کوششوں سے بھی نہیں مل سکتی تو وہ ہزار عجائبات کا عجائب ہے، اسکی زیارت کرنے کیلئے تو بڑی بڑی رقمیں خرچ کرتے پہنچنا چاہئے تھا، نہ کہ زیارت سے بڑھ کر اس کی تلاوت حق تعالیٰ نے ہمارے اختیار میں کر دی ہے پھر اس سے جان چرانا کتنی بڑی کم نصیبی کی بات ہے۔ حرمان[6] اسی کو کہتے ہیں۔

قرآن سے روکنا شیطانی مکر ہے

یہ صرف شیطان کا مکر ہے کہ یوں سمجھایا جاتا ہے کہ سمجھ کر تو ہم پڑھ نہیں سکتے اور بے سمجھے

---

[1] لوٹ کر آنا [2] حکم [3] پہلے ذکر کیا گیا [4] اللہ تعالیٰ کا عطیہ [5] العنکبوت، ۵۱ [6] محروم رہ جانا

پڑھنا فضول ہے۔ کیوں صاحب عجائب خانہ میں آپ کیوں جاتے ہو؟ وہاں آپ کا نفس یہ کیوں نہیں کہتا کہ یہ چیزیں دیکھنے سے تو مل نہیں سکتیں پھر دیکھنا فضول ہے؟ اور بعض تلاوت کرنے والے اس وجہ سے تلاوت چھوڑ بیٹھتے ہیں کہ ان سے صحیح پڑھا نہیں جاتا۔ بس شیطان ان کو بہکا دیتا ہے کہ جب صحیح پڑھا جاتا نہیں تو غلط پڑھنے سے کیا فائدہ؟ بلکہ بعض لوگ تو یوں کہہ دیتے ہیں کہ غلط پڑھنے سے اور گناہ ہوتا ہے۔

قرآن غلط پڑھنے سے گناہ کب ہوتا ہے

صاحبو! اس غلطی کو سمجھ لیجئے کہ غلط پڑھنے سے گناہ اس وقت ہوتا ہے جبکہ صحیح پڑھنے پر قدرت ہو اور لاپرواہی سے غلط پڑھا جائے ورنہ ایں خطا از صد ثواب اولی ترست[۱] ایسے غلط پڑھنے والے کو جو کہ شوق سے پڑھتا ہو مگر غلطی رفع کرنے پر اس کو قدرت نہیں ہے، دو چند ثواب ملتا ہے حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے۔

ما بروں را ننگریم و قال را　　　ما دروں را بنگریم و حال را
ناظر قلبیم اگر خاشع بود　　　گرچہ گفت لفظ نا خاضع بود[۲]

حق تعالیٰ دل کو دیکھتے ہیں اور ایک تلاوت ہی پر کیا شبہ ہے ہماری عبادت تو کوئی بھی ایسی نہیں جس کو صحیح کہہ سکیں سب ایسی ہی ہیں جیسے غلط قرآن پڑھنا۔ پھر تعجب ہے کہ اور عبادتوں پر ہم خوش ہوتے ہیں اور ثواب کی امید رکھتے ہیں اور غلط تلاوت سے ناخوش ہوتے ہیں حق تعالیٰ کے یہاں تو دل کی حالت دیکھی جاتی ہے۔ جو شخص شوق سے پڑھ رہا ہے، اسکی غلطیوں پر نظر نہیں کی جاتی بلکہ دو چند ثواب دیا جاتا ہے۔

حضرت حبیب عجمیؒ کے حروف اچھے نہ تھے۔ ایک مرتبہ تہجد پڑھ رہے تھے، حضرت حسن بصریؒ نے بھی ان کے پیچھے شریک ہونا چاہا لیکن ان کی غلطیوں کی وجہ سے گھر آ کر تہجد ادا کیا۔ خواب میں حق تعالیٰ کو دیکھا۔ پوچھا آپ کے نزدیک کون عمل زیادہ پسندیدہ ہے؟ ارشاد ہوا الصلوۃ خلف الحبیب[۳]۔

---

[۱] یہ غلطی سو درستگی سے افضل ہے [۲] ہم ظاہر کو اور بات کو نہیں بلکہ باطن کو اور اس کی حالت کو دیکھتے ہیں۔ اگر دل میں خشوع ہو تو ہم اس دل پر نظرِ رحمت رکھتے ہیں خواہ زبان پر اتنا خشوع نہ ہو [۳] حبیب عجمی کے پیچھے نماز پڑھنا

دیکھئے یہ رتبہ ہے بعضے غلط پڑھنے والوں کا۔ حق تعالی کی نظر قلب پر ہے۔ اگر کوئی صحیح نہ پڑھ سکے تو اس کا غلط، صحیح سے بڑھ کر ہے۔

عورتوں میں تلاوتِ قرآن بالکل متروک ہے

غرض تلاوت بڑی چیز ہے جسکی طرف سے لوگوں میں عام غفلت ہے۔ بالخصوص عورتیں تو اس سے بہت ہی غفلت کرتی ہیں۔ بس عورتوں کو تو رسموں سے کام ہے یہی ان کا دین ہے اور یہی ان کا قرآن ہے۔ یہ رسم ضرور ہے کہ قرآن جہیز میں دیا جاتا ہے مگر کاہے کیلئے دیا جاتا ہے صرف رسم پورا کرنے کیلئے۔ بس گھر پہنچتے ہی وہ قرآن، طاقِ نسیان پر رکھ دیا جاتا ہے اور بڑی حفاظت کے ساتھ کہ کبھی اس کو جزو دان میں سے نکلنے اور ہوا لگنے کی نوبت نہیں آتی۔ اس میں اس کا قصور تو ہے لیکن اوپر والوں کا بھی ہے کہ اسکو پڑھنے ہی نہیں دیتے۔

دلہن کا قرنطینہ اور دلہن کی کیا گت بنتی ہے

کیونکہ دلہن کو کچھ دنوں تک قرنطینہ[1] میں رکھا جاتا ہے۔ اس طرح سے کوٹھڑی میں بند کی جاتی ہے کہ ہوا کو بھی ترس جاتی ہے۔ ایک مدت منہ پر ہاتھ رہتا ہے اور یہ قید اس بیچاری کی بیاہ سے پہلے ہی سے شروع ہو جاتی ہے۔ مائیوں بٹھلائی جاتی ہے اس طرح کہ ایک جگہ سے نہیں نکل سکتی اور بیاہ ہونے کے بعد تو وہ عجائب المخلوقات میں سے ہو جاتی ہے۔ دور دور سے اس کو دیکھنے والیاں آتی ہیں اور وہ اس طرح انسان سے جماد بنائی جاتی ہے کہ نہ اس کے آنکھ رہے، نہ زبان رہے، نہ کسی کی طرف دیکھ سکتی ہے، نہ بول سکتی ہے۔ پیشاب، پاخانہ کو بھی جانا ہو تو دوسرے پکڑ کر لے جاتے ہیں۔

صاحبو! یہ کیا خرافات ہیں کون سی عقل ان باتوں کو اچھا بتاتی ہے۔ خیر اگر ان باتوں سے شریعت میں خلل نہ پڑتا تو حرج بھی نہ تھا مگر حالت یہ ہے کہ اس قرنطینہ کے زمانہ میں نماز تو بالکل ہی ناجائز ہو جاتی ہے اور تلاوت وغیرہ کا تو ذکر ہی کیا۔ قرنطینہ کے بعد منہ پر ہاتھ ہوتا ہے۔ میں کہا کرتا ہوں کہ منہ پر ہاتھ نہیں بلکہ ہاتھ پر منہ ہوتا ہے کیونکہ دلہن دونوں گھٹنوں پر ہاتھ رکھ کر ہاتھوں پر منہ رکھ دیتی ہے۔

اس وقت دلہن بالکل مردہ بدست زندہ ہو جاتی ہے اور ان کی دین داری کی یہ حالت ہوتی

---

[1] وہ جگہ جہاں مریض کو حفاظتی تدبیر کے طور پر عام لوگوں سے علیحدہ رکھا جاتا ہے

ہے کہ دلہن سے پردہ میں وہ کام تو کرادیں گے جو حد سے زیادہ بے حیائی کے (چنانچہ بعض رسمیں ایسی فحش ہیں کہ ان کا ذکر بھی نہیں کیا جا سکتا) یہ سب کام تو ہوں گے لیکن جب نماز کا وقت آویگا تو وہ خلافِ حیا ہے۔ نماز کیسے پڑھوائیں؟ اور خود دلہن تو بول بھی نہیں سکتی۔ اگر کوئی دلہن نماز کا نام لے اور پانی بھی وضوء کیلئے مانگے تو بوڑھی عورتیں کائیں کائیں کر کے اس کے پیچھے پڑ جائیں کہ نوج اب تو وہ زمانہ آگیا کہ نئی دلہنوں کا دیدہ بھی نہیں جھپکتا۔ غرض نئے دنوں تک تو یہ مجبوری رہی جب نماز ہی نہیں تو تلاوت قرآن کہاں۔ پھر چند روز تک اس طرح معمول متروک ہوگیا پھر اس کا اعادہ عادۃً دشوار ہو جاتا ہے سو اس طرح سے دوسروں کا بھی اس ترک تلاوت میں دخل ہوا۔ پھر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رخصتی کے بعد ہی امید ہو جاتی ہے۔ پھر طبیعت اچھی نہیں رہتی تلاوت کیسے ہو؟ پھر بچے ہو گئے، پھر گھر کی مالک بن گئیں۔ کھانا، پکانا، پیسنا، کوٹنا اپنے ذمہ ہوگیا، پھر بڈھی ہو گئیں یہانتک کہ مر گئیں۔ سب کام ہو گئے مگر تلاوت نصیب نہیں ہوئی۔

تمام عمر گزر گئی مگر تلاوت نصیب نہ ہوئی

کوئی زمانہ ایسا نہ آیا جس میں اس قرآن کو جو جہیز میں آیا تھا، طاقِ نسیان پر سے اتار کر کھولنے کی نوبت آجاتی۔ ساری عمر شیطان نے راہ ماری اور ہمیشہ حیلے بہانوں میں رکھا اور تلاوت ہی نہ کرنے دی حالانکہ سب حیلے فرضی تھے اور صرف سستی اور بد نصیبی تھی۔ میری والدہ نے ہم دونوں بھائیوں کو پالا مگر سوائے ایام معذوری کے معمولات کو ناغہ نہ ہونے دیا۔ اصل بات یہ ہے کہ آخرت کی طرف سے ذہول[۱] ہو گیا ہے اور ثواب کو کچھ نہیں سمجھا جاتا۔

میں کہتا ہوں اگر خاوند دلہن سے یوں کہہ دے کہ قرآن شریف پڑھا کرو میں فی سپارہ سو روپیہ کا زیور بنوا کر دوں گا تو سب حافظ ہو جائیں اور سب حیلے، بہانے ندارد[۲] ہو جائیں کیونکہ عورتوں کو زیور کی بڑی حرص ہوتی ہے۔

عورتوں کو زیور کا شوق اور اس کی حکایت

ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی بنئے نے اپنی عورت سے کہا کہ ذرا مجھے باٹ اٹھا دے۔ اس نے کہا اونہہ بھلا مجھ سے اتنا بھاری باٹ اٹھے گا۔ اس نے کیا کیا کہ سنارے سے کہہ کر ایک سل کے

---

[۱] غفلت [۲] ختم ہو جائیں

او پر سونا مڑھوایا اور گھر میں لایا کہ لے بی! میں نے تیرے واسطے ایک نئی قسم کا زیور گھڑوایا ہے جیسے ہی وہ زیور عورت کے سامنے آیا بے ساختہ گلے میں ڈال لیا۔ پھر تو بنئے نے اس کی خوب مرمت کی کہ مردار! کل تک تو تجھ سے باٹ بھی نہ اٹھتا تھا یا اب سل کو بھی بے تکلف گلے میں ڈالے پھرنے لگی۔ یہ حالت ہے ان کے زیور کے شوق کی۔ لڑکیوں کو دیکھا ہے کہ کان لہولہان ہیں مگر سونا لا د رکھا ہے کیسی ہی تکلیف ہو مگر اسکو نہیں چھوڑ سکتیں۔ کانوں کے بوجھ اور تکلیف کی وجہ سے گردن تک نہیں جھکا سکتیں مگر تمام کنبے کو دکھاتی پھرتیں ہیں تا کہ اچھی لگوں۔ مشہور تو یہ ہے کہ بھٹ پڑے وہ سونا جس سے ٹوٹیں کان۔ مگر ان کے نزدیک بھٹ، وٹ کچھ نہیں پڑتا۔

ہندوستان میں زیور کا کچھ ایسا رواج ہے کہ لڑکیوں کا تمام بدن ابتداء سے جکڑ بند ہو جاتا ہے مگر اس کو اپنے لئے بڑا فخر سمجھتی ہیں۔ میری ایک جگہ دعوت تھی وہاں ایک چھوٹی لڑکی تھی اس کے باپ نے مجھ سے کہا کہ میرا دل دکھتا ہے اسکے کان چھدواتے ہوئے اگر نہ چھدواؤں کچھ حرج تو نہیں؟ میں نے کہا کہ نہیں کان میں صرف لو کا چھدوانا ثابت ہے بقیہ چھدوانا ضروری نہیں۔ وہ لڑکی تو اس وقت سوتی تھی صبح کو اس کی بڑی بہن نے اس سے کہا تیرے واسطے یہ تجویز ہوا ہے۔ وہ بہت بگڑی اور کہنے لگی کہ مولوی اپنی بیوی، بہن کو نہیں دیکھتے۔ ان کے ناک، کان کیوں چھدے ہوتے ہیں۔ یہ قصہ اس کے باپ نے مجھ سے کہا۔ غرض انہیں تو بس اسی کا شوق ہے کہ دوسری عورتوں کی ریس ہو۔ ثواب اور عقاب کو یہ نہیں جانتیں۔ انہیں تو ذرا سے مال کا لالچ دیا جائے تو یہ سب کچھ کر گزریں۔

عورتوں سے نماز و تلاوت کا اہتمام کرانے کی ایک تدبیر

میں سچ کہتا ہوں کہ اگر پانچ پیسہ روز کا بھی انہیں لالچ دیں تو سب عورتیں نمازی ہو جائیں۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ کوئی واقعی عذر تو ان کے پاس ہے نہیں ہاں ارادہ نہیں ہے تو بے ارادہ تو کچھ بھی نہیں ہوسکتا تو اس حالت میں سوائے محرومی کے کیا ہے۔ تمام عمر گزر گئی اور کوئی کام بھی دین کا نہیں ہوا۔ نہ نماز، نہ تلاوت بالخصوص تلاوت سے تو بہت ہی غفلت ہے۔ عورتیں بھی غافل ہیں اور مرد بھی غافل ہیں۔ عورتوں نے تو صرف عدیم الفرصتی کا عذر نکال رکھا ہے مگر مردوں نے ایسا حیلہ چھانٹا ہے کہ اس کے بعد تبدیل رائے کی امید ہی بہت کم ہے۔ وہ حیلہ وہی ہے جس پر بہت دیر سے بحث ہو رہی ہے کہ تلاوت کر کے کیا کریں سمجھنے کی ہم میں قابلیت نہیں اور بلا سمجھے پڑھنا بے کار ہے۔ میں کہتا ہوں کہ پڑھنا تو بے کار کیوں ہوتا مگر تمہاری یہ باتیں ضرور بے کار ہیں کہ انجام ان کا حسرت ہے۔ اسی تلاوت کے باب میں حق تعالیٰ فرماتے ہیں ان الذین یتلون کتاب اللہ اب میں بیان کو

ختم کرتا ہوں کیونکہ وقت بہت ہو چکا گو مضمون ختم نہیں ہوسکتا کیونکہ یہ خدا تعالی کی باتیں ہیں۔

نہ حسنش غایتے دارد نہ سعدی راسخن پایاں بمیر دتشنہ مستسقی ودریا ہمچنیں باقی ا

یہ بالکل ٹھیک ہے چنانچہ صریحاً ارشاد ہے قل لو کان البحر مداداً لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہ مدداً ۲ یہی وجہ ہے کہ جولوگ قرآن واحادیث کے مضامین بیان کرتے ہیں ان کے بیانوں میں بڑی وسعت ہوتی ہے بخلاف اسکے اگر کسی دوسرے فن کے متعلق بحث کی جائے مثلاً علم حساب میں یا شعروشاعری میں یا جس فن کو بھی لیا جاوے تو اس میں تقریر کو اتنا امتداد نہیں ہوسکتا۔ وجہ یہ ہے کہ قرآن وحدیث کو تعلق ہے ایسی ذات وصفات سے جو لا متناہی ہے مگر میں اس کو قصداً ختم کئے دیتا ہوں۔

نری نماز کا حکم نہیں بلکہ درست کرنے کا بھی حکم ہے

آگے دوسرے اجزاء کا مختصراً مختصراً بیان کر کے فارغ ہوتا ہوں سو یتلون کے بعد فرماتے ہیں واقاموا الصلوۃ یعنی نماز کی پابندی کرتے ہیں یصلون نہیں فرمایا بلکہ اقاموا الصلوۃ فرمایا معنی یہ ہوئے کہ نری نماز نہیں بلکہ پابندی کے ساتھ پڑھتے ہیں اور درست کر کے پڑھتے ہیں یعنی نماز کے حقوق پورے پورے ادا کرتے ہیں۔ میں بہت اختصار سے بیان کر رہا ہوں اس واسطے صرف اتنا کہتا ہوں کہ ہر شخص دیکھ لے کہ وہ نماز کے حقوق کہاں تک ادا کرتا ہے آگے فرماتے ہیں وانفقوا مما رزقناھم سرا وعلانیۃ یعنی ہمارے دیے ہوئے مال میں سے خرچ کرتے ہیں پوشیدہ بھی اور علانیہ بھی یعنی حسب موقع ومحل خرچ کرتے ہیں اگر پوشیدہ خرچ کرنے کا موقع ہے تو پوشیدہ خرچ کرتے ہیں اور اگر علانیہ خرچ کرنے کا موقع ہے تو علانیہ خرچ کرتے ہیں۔

یہ بات مشہور ہے افضل صدقہ وہی ہے جو پوشیدہ ہو اور یہ بات صحیح بھی ہے حدیث میں موجود ہے مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ صدقہ میں علی الاطلاق اخفاء ہی افضل ہے بلکہ بعض مواقع ظاہر کرنے کے بھی ہیں زکوۃ کو اکثر حالات میں علانیہ دینا بہتر ہے تاکہ دوسروں کو بھی تحریض ۳ ہو اور دیگر صدقات میں اکثر حالات میں اخفاء ۴ بہتر ہے۔

---

۱ نہ اس کے حسن کی انتہا ہے، نہ سعدی کی باتوں کی۔ استسقاء کے مریض پیتے، پیتے مر جائیں مگر دریا ختم نہ ہو ۲ آپ کہہ دیجئے کہ اگر میرے رب کی باتیں لکھنے کے لئے سمندر روشنائی ہو تو میرے رب کی باتیں ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جاوے اگرچہ اس سمندر کی مثل ایک دوسرا سمندر مدد کے لئے ہم لے آویں ((الکھف، ۸۹) ۳ ترغیب ۴ پوشیدہ کرنا

آیت تمام کارِ خیر کو شامل ہے، مالی ہوں یا بدنی

یہ کل تین باتیں ہوئیں۔ تلاوت، نماز کی پابندی، خیرات۔ یہ کہنے کو تین ہیں مگر تمام عبادات بدنیہ و مالیہ اس میں آگئیں، نوافل بھی فرائض بھی۔ صلوۃ میں عبادات بدنیہ آگئیں اور خیرات میں عبادات مالیہ۔ اور چونکہ عبادات مالیہ میں مقصود دوسروں کو نفع پہنچانا ہے اس واسطے اشارۃً اس میں تمام طرق نفع رسانی کے آگئے حتی کہ کسی کیلئے دعا کرنا یا ہاتھ پاؤں سے خدمت کرنا یا اور کسی طریق سے نفع پہنچانا اور انفقوا میں صدقہ فطر بھی آگیا اور قربانی بھی اور دوسرے مفید کام بھی جو مال کے ذریعہ انجام پاتے ہیں جیسے مدرسوں کے چندے وغیرہ۔ آگے ان سب پر جزاء کو متفرع[1] فرماتے ہیں یرجون تجارۃ لن تبور یعنی جو لوگ یہ کام کرتے ہیں وہ امید رکھتے ہیں ایسی تجارت کی جو ہرگز خسارہ نہ دیگی۔

اعمالِ آخرت کو تجارت کہنے کی وجہ

یہاں اول یہ سمجھ لیجئے کہ اعمالِ آخرت کو تجارت کیوں فرمایا؟ اور سعی آخرت تجارت کس طرح ہے؟ تو سمجھ لیجئے کہ تجارت اس کو صورۃً کہا گیا ہے اس وجہ سے کہ لوگ تجارت کے عادی تھے ورنہ اسکی حقیقت یہاں موجود نہیں کیونکہ تجارت کی حقیقت ہے مبادلۃ المال بالمال[2] یہ بالمعنی الحقیقی جب صحیح ہوتا کہ ہم کوئی چیز اپنی ملک سے دیتے اور ادھر سے جنت ملتی مگر ہماری تو کوئی چیز ہے ہی نہیں۔

تو دادی ہمہ چیز من چیزِ تست[3]

تو اب اس کی ایسی مثال ہے کہ بچہ کو اول ایک روپیہ عاریۃً دیں پھر اس سے کہیں کہ ہمارے پاس ہزار اشرفی ہیں اس روپیہ سے خرید لو تو یہ بیع نہیں بلکہ اس کی حقیقت یہی ہے کہ ہمکو ہزار اشرفی اسکو دینا ہی تھی۔

صرف برائے نام مبادلہ[4] کا لفظ آجانے سے اس کو تجارت کہہ دیا اور دوسری تجارتوں میں اور اس میں یہ فرق بھی بیان کر دیا کہ لن تبور یعنی یہ تجارت نقصان دہ ہرگز نہیں بخلاف دوسری تجارتوں کے کہ ان میں نفع و نقصان دونوں برابر ہوتے ہیں اور نقصان تو بہت ہی بعید ہے۔ اس

---

[1] نتیجہ کے طور پر ذکر فرماتے ہیں [2] مال کا تبادلہ مال سے [3] سب کچھ آپ نے دیا۔ میری سب چیزیں تو آپ کی دی ہوئی ہیں [4] تبدیلی

تجارت کا تو یہ نتیجہ ہے لیوفیهم اجورهم یعنی پورا پورا اجر ملے گا اور معاوضہ ہی پر اکتفاء نہیں بلکہ ویزیدهم جتنے کا استحقاق ہے اس سے زیادہ ملے گا۔ اگر کام چار روپیہ کا کیا ہے تو چار سو ملیں گے۔ بھلا یہ قاعدہ کسی سرکار میں ہے کہ جتنا اجر ٹھیرا ہو اس سے زیادہ دیا جائے مثلاً تحصیلدار کے سو روپیہ مقرر ہوئے تو مہینہ پر سو نہ دیے جاویں بلکہ بجائے سو کے ہزار دیے دیئے جاویں اور اس وجہ سے کہ زیادہ ملنے پر کوئی تعجب نہ کرے من فضله بھی فرمادیا کہ زیادتی حق تعالی کے فضل سے ہے اور ہمارے فضل کے سامنے کس چیز کی کمی ہے؟ گو تمہارا استحقاق زیادہ کا نہ تھا مگر ہمارے یہاں کمی نہیں ہم کو اختیار مطلق حاصل ہے جس کو جتنا چاہیں دے دیں اسکے آگے فرماتے ہیں انه غفور شکور کیسے عجیب طور پر ختم کیا ہے مضمون کو۔۔

شبہ کہ نیکیوں کے ساتھ گناہ بھی ہوتے ہیں تو جنت کیسے ملے گی؟

بیان اس کا یہ ہے کہ یہاں ایک شبہ ہوسکتا تھا جسکے دو جزو ہیں ایک یہ کہ آیت سے ثابت ہوا کہ اعمال میں خاصیت ہے کہ نتیجہ ملیگا تو جیسے کہ اعمالِ خیر میں خاصیت ہے اچھا نتیجہ ملنے کی۔ ایسے ہی اعمال شر میں خاصیت ہوگی برا نتیجہ ملنے کی اور ہم سے گناہ ہوتے ہی رہتے ہیں اگرچہ طاعت بھی ہوتی ہوں مگر قاعدہ کے موافق چونکہ گناہوں پر نتیجہ شر مرتب ہونا ضرور ہے اس لئے گناہوں سے دوزخ میں جانا بھی ضرور ہوگا تو طاعت کرنے کے بعد بھی اطمینان نہ ہوا کیونکہ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں کہ جرائم عظیمہ تو الگ رہے ذرا سے قصور سے بھی کام ناپسند کردیا جاتا ہے مثلاً کسی سے سڑک بنوائی مگر ذراسی کوتاہی ہوگئی وہ ناپسند کردی اور توڑ ڈالی تو اس صورت میں طاعات کیا کام دے سکتی ہیں؟ وہ بھی حبط[1] ہوجائیں گی۔ یہ شبہ کمر توڑ دینے والا ہے۔ دوسرا جزو یہ ہے کہ طاعات میں ہمیں یہ خیال ہوسکتا ہے کہ ہم کام تو کرتے ہیں مگر ان میں کوتاہیاں بھی ہوتی ہیں تو قطع نظر معاصی سے خود طاعات ہی میں یہ احتمال ہے کہ شاید بیکار ہوجائیں اور اجر سب جرمانہ میں ہی سوخت ہوجائے اور یہ شبہ کچھ بعید نہیں ہے جسکو اپنے اس تعلق سے آگاہی ہے جو بندہ کو خدائے تعالی کے ساتھ ہے اسکو اس سے بھی بڑھ کر شبہات پیدا ہوسکتے ہیں۔

دیکھئے آپ کا باورچی کھانا پکاتا ہے اور فرض کرو کہ وہ اس کام کا استاذ ہو اور غلطی نہ کرتا ہو مگر جب کھانا پکاچکے اور اس سے کہا جاوے کہو آج کھانا اچھا پکا؟ تو یہی کہے گا کہ اچھا جب ہے کہ آقا کے

---

[1] ضائع

پسند آجاوے۔ اس کے اس جواب کی وجہ یہ ہے کہ اسکی ان تعلقات پر نظر ہے جو اسکے اور اس کے آقا کے درمیان ہیں بخلاف ہم لوگوں کے کہ ہم کو شبہات نہیں ہوتے وجہ اس کی خدا تعالی کی عظمت اور اپنی عبودیت سے ذہول [1] ہے۔ بہر حال ان تعلقات پر نظر کر کے یہ شبہ ہو سکتا تھا تو اس واسطے کہ ان شبہات سے کسی کا دل نہ ٹوٹے غفور شکور فرمادیا یعنی ہم گناہوں سے طاعات کو غارت نہ کریں گے کیونکہ ہم معاف کرنے والے ہیں خود ان گناہوں ہی کو معاف کر دیں گے جن کے مؤثر ہونے کا شبہ ہوا تھا اور یہ دوسرے دلائل سے ثابت ہے کہ اگر معاف بھی نہ ہوتے تو ان پر مستقل مقدمہ چلتا وہ طاعات کو حبط نہیں کرتے غفور ہیں اور کسی کے کام کو ناپسند کرنے والے بھی نہیں۔ کوتاہیوں کو نظر انداز کر دیں گے کیونکہ ہم شکور ہیں، قدر دان ہیں ہم سب پسند کر لیں گے۔

ہے کوئی گورنمنٹ جس کا اپنی رعایا کے ساتھ یہ برتاؤ ہو کہ بات بات میں دل کو سنبھالتے ہیں۔ بس یہ ایک ہی گورنمنٹ ہے جو کوتاہیوں پر نظر نہیں کرتی اور کسی کام کی ناقدری نہیں کرتی بلکہ اتنا معاوضہ دیتی ہے کہ اسکو عمل کا معاوضہ کہنا ہی صحیح نہیں محض عطا ہی عطا ہے پھر ہم نے کیا قدر کی اس عطا کی؟ اس کی قدر تو یہ تھی کہ تعمیل احکام میں جان توڑ کر کوشش کرتے، نہ یہ کہ احکام کا نام ہی اڑا دیا اور خالی امید لے لی۔

نری امید کا کہیں حکم نہیں ہے

آخر یہ بات قرآن میں کس جگہ ہے کہ امید ہی امید رکھو۔ یہ آیت جو میں نے تلاوت کی ہے قرآن ہی کی آیت ہے اور رجاء ہی کے بارے میں ہے۔ اس کا مدلول تو یہ ہے کہ جو لوگ فلاں فلاں عمل کرتے ہیں وہ امیدوار سمجھے جا سکتے ہیں اس کے یہ معنی کس طرح لے لئے گئے کہ گو عمل تو کچھ بھی نہ ہو تب بھی اپنے کو امیدوار سمجھتے رہو۔ اس مضمون کو میں نے بقدرِ کفایت بسط کے ساتھ بیان کر دیا۔ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالی نے رجاء کا طریق بھی بتا دیا اور اس کی حقیقت بھی بتلا دی وہ یہ کہ اعمال شرعی کرو اور رحمت کے امیدوار رہو نہ یہ کہ خیال خام میں پھنسے رہو اب دعا کیجئے کہ ہم لوگوں کا فہم درست ہو اور عمل صحیح ہو۔ آمین. وصلی اللہ علی سیدنا ومولانا محمد وعلی آلہ واصحابہ اجمعین وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العالمین.

---

[1] غفلت

لب لباب وعظ ہذا:۔

قال الله تعالى :"ان الذين يتلون كتاب الله واقاموا الصلوة وانفقوا مما رزقنهم سراً وعلانيةً يرجون تجارة لن تبور ليوفيهم اجورهم ويزيدهم من فضله انه غفور شكور". الموصول مع الصلة اسم "ان" و"يرجون" خبره. فالمعنى ان الذين يعملون تلك الاعمال يرجون تجارة لن تبور. اعنى يترتب عليها الجزاء البتة وهو دخول الجنة. فالحاصل ان الرجاء المعتبر هو الذى يكون مع كسب الاعمال لا الامانى المحضة التى اعتادها الناس. والله سبحانه اكتفى من بين الاعمال على ذكر التلاوة واقامة الصلوة وانفاق المال فالاول اشارة الى جميع الطاعات النافلة خص منها التلاوة بالذكر لفضلها. والثانى اشارة الى جميع العبادات البدنية المكتوبة خص منها الصلوة بالذكر لفضلها ايضاً والثالث اشارة الى جميع العبادات المفروضة والنافلة ويتعدى الحكم باشتراك علة النفع الى جميع الطرق النافعة حتى الدعاء لاخيه واعانته بالنفس. وتسمية الاعمال تجارة ليست الا صورة فان حقيقة التجارة اعنى مبادلة المال بالمال ليست ههنا لان العمل ليس الا بتوفيق الله. واللام فى "ليوفيهم" للعاقبة كقولهم ﴿سرق ليقطع﴾ ولم يكتف على الاجر بل وعد بالزيادة. وفى لفظ "من فضله" رد لاستعجاب ان العبد كيف ينال مثل تلك الاجور والزيادة لانها لا نسبة بين العمل والجزاء فقال لخطى من فضلنا فانا ذو الفضل العظيم. والله يرزق من يشاء بغير حساب.

وفى قوله "غفور شكور" رد لشبهة لها جزأن. الاول انه يثبت بالاية ان للاعمال خاصية فى ترتب النتيجة عليها فان الانسان ولو عمل الطاعات فلا يخلو من اكتساب الخطيأت البتة فكما انه استحق الجنة بالطاعات، استحق النار

بالخطیأت فکیف یسره عمل الطاعات؟ والثانی ان الطاعات ایضاً لا تخلو عن تقصیرات فکیف یحصل لها القبول وترتب النتیجة؟ فهذه الشبهة تقعد العامل عن العمل فازال الله سبحانه الجزء الاول بلفظه غفور والثانی بشکور

فقط اشرف علی

باغپت ضلع میرٹھ میں کئے گئے تین اہم مواعظ میں سے ایک اہم وعظ

دَواءُالعُیوب

المعروف بہ

شامِ خورشید

از حکیم الأمت مجدد الملت حضرت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

☆

ناشر

ادارہ اسلامیات کراچی ۔ لاہور

اين	متى	کم	کیف	لم	من أی شان	ماذا	من ضبط	المستمعون	الاشتات
کہاں ہوا	کب ہوا	کتنی دیر ہوا	کیونکر ہوا	کیوں ہوا	کس طبقہ کو زیادہ مفید تھا	کیا مضمون تھا	کس نے ضبط کیا	سامعین کی تخمینی تعداد	متفرقات
میرٹھ صدر مکان حاجی وجیہ الدین خان صاحب	۴۔ ربیع الثانی ۱۳۳۴ھ	ایک گھنٹہ ۳۸ منٹ	تخت پر بیٹھ کر			ضرورت تذکر موت	حکیم محمد مصطفیٰ صاحب	بالقصد مجمع زنانہ و مرد تقریبا ۵۰	بوجہ عام اطلاع نہ ہونے کے مجمع کم تھا

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

خطبہ ماثورہ:۔ امابعد۔ فاعوذ باللہ من الشیطن الرجیم۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم۔

"أولم نعمر کم ما یتذکر فیه من تذکر و جاء کم النذیر" [۱]۔

ترجمہ۔ کیا ہم نے اتنی عمر تم کو نہیں دی تھا جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کر لے حالانکہ ڈرانے والا بھی تمہارے پاس آ چکا ہے۔

مضمون آیت

یہ ایک لمبی آیت کا ٹکڑا ہے مجھے صرف اتنے ہی جزو کو بیان کرنا ہے، اسی واسطے پوری آیت نہیں پڑھی، اس میں حق تعالیٰ کی طرف سے ایک خطاب ہے جو قیامت میں ان لوگوں سے ہوگا جو تمنا کریں گے کہ اگر ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تو اب کے [۲] ہم ایسے عمل نہ کریں گے جیسے اس مرتبہ کئے!۔ جواب ملے گا "اولم نعمر کم ما یتذکر فیه من تذکر و جاء کم النذیر"۔ "کیا ہم نے اتنی عمر تمہیں نہیں دی تھی جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کر لے"۔ چنانچہ جن لوگوں نے دنیا میں ہدایت پائی ہے ان کو بھی تو اتنی ہی عمر ملی تھی۔

دوبارہ زندگی دینے سے اصلاح کی امید فضول ہے

ثابت ہوا کہ عمر کے اعادہ [۳] سے یہ امید رکھنا کہ اعمال دوسرے ہوسکیں گے غلط ہے جس کو اعمال دوسرے کرنے تھے اس نے اسی ایک عمر میں کر لئے اور تم نے غفلت میں عمر کھو دی پس جو سبب معصیت کا اس عمر میں موجود تھا اور جو مانع ہوا اعمال صالحہ اور ہدایت سے، یعنی غفلت وہ اگر دوبارہ بھی قائم رہا تو جتنی بھی عمریں ملتی جائیں گی اس سبب کا اثر بھی ساتھ ساتھ رہے گا یعنی ہدایت نہ ہوگی، اس لئے یہ درخواست مسموع نہ ہوگی۔

اس کے بعد ارشاد ہے وجاء کم النذیر یعنی ڈرانے والا بھی تمہارے پاس آ چکا جو تم کو

---

[۱] سورہ فاطر، ۳۷۔ [۲]:۔ اس بار۔ [۳]:۔ دوبارہ زندگی ملنے۔

خواب غفلت سے بیدار کرنے والا تھا۔ ''نذیر'' کی تفسیر میں گفتگو ہوئی ہے، ایک قول یہ ہے کہ نذیر سے مراد پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور نائبین پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جن سے تبلیغ احکام الٰہی ہوتی ہے۔ دوسرا قول یہ ہے جو ایک حدیث کے موافق ہے، گویا وہ حدیث اس کی تفسیر کرتی ہے کہ ''نذیر'' بڑھاپا ہے خواہ اس حدیث کے یہ معنی ہوں کہ آیت میں نذیر سے مراد یہی ہے خواہ حدیث میں تمثیلاً بڑھاپے کو بھی ''نذیر'' فرما دیا گیا بہر حال تمثیلا ہو یا تعیینا، یہ ضرور ثابت ہوا کہ بڑھاپا بھی ڈرانے والا ہے، تو آیت کے یہ معنی ہوئے کہ جوانی تو کھوئی ہی تھی بڑھاپے میں بھی تمہاری غفلت نہ گئی اور آنکھ نہ کھلی کہ کچھ سامان آخرت کر لیتے۔

یہ خطاب عبارۃ النص[۱] سے خواہ کفار ہی کے لئے ہو، مگر بدلالۃ النص خواہ بالقیاس[۲] باختلاف مراتب[۳] تمام ان اشخاص کے لئے بھی ہو سکتا ہے جو بناء خطاب[۴] یعنی غفلت میں شریک ہیں، یعنی یہ مانا کہ اتنا فرق ضرور ہوگا کہ اعمال صالحہ میں کوتاہی کرنے والے کی غفلت مع سلامتی ایمان کے اس درجہ مضر نتائج کا موجب نہ ہوگی۔ جتنی کافر کی غفلت ہوگی، اس کے لئے خلود فی النار نہ ہوگا، لیکن ملامت تو ذرا سی بھی بہت ہے اور ملامت تو بڑی چیز ہے لوگ تو نیک نامی نہ ہونے سے متاثر ہوتے ہیں۔ چنانچہ اسی نیک نامی اور نام آوری کے لئے کتنی کتنی کوششیں کرتے ہیں۔

ایک خان بہادری کے خطاب کے لئے ہزاروں روپیہ خرچ کرتے ہیں، سفارشیں اٹھاتے ہیں، برسوں کارگذاریاں دکھاتے ہیں، حالانکہ خطاب حاصل ہونا کوئی ضرورت کی چیز نہیں، اور اس کے عکس، یعنی بدنامی سے بچنے کے لئے تو کس درجہ اہتمام کرتے ہیں حتی کہ بعض دفعہ بدنامی پر مر جانے کو ترجیح دیتے ہیں۔ بڑے بڑے عہدہ دار تمام عمر خائف و ہراساں رہتے ہیں۔ دعائیں مانگتے ہیں کہ خدائے تعالیٰ آبرو سے مدت ملازمت گذار دے کوئی دھبہ نہ لگ جائے، جب خیریت سے پینشن مل جائے تب اطمینان ہوتا ہے، یہ ملامت ہی کا خوف تو ہے، حالانکہ ہر بدنامی میں جیل خانہ یا کسی جسمانی سزا کا اندیشہ بھی نہیں ہوتا، حالانکہ دنیا کی ملامت چیز ہی کیا ہے؟ چار دن سے زیادہ رہنے والی چیز نہیں، جب مر گئے تو بعد چندے کوئی یہ بھی جاننے والا نہیں رہتا کہ کون تھا؟ اور کہاں گیا؟ لاکھوں ہوئے اور گذر گئے، نام تک بھی جاننے والا کوئی نہیں رہا، نیک نامی اور بدنامی کیسی، مگر پھر بھی لوگ

---

[۱]:۔ واضح عبارت کی بنیاد پر [۲]:۔ سمجھ بوجھ کی بناء پر قیاس کرتے ہوئے [۳]:۔ اگرچہ مرتبوں میں اور ترتیب میں فرق ہو سکتا ہے۔ [۴]:۔ خطاب کی بنیاد۔

اس ذرا سی بدنامی سے بچنے کے لئے کتنی کوششیں کرتے ہیں۔

ملامت بھی خوف کی چیز ہے

پس حقیقت یہ ہے کہ ملامت ایسی ہی چیز ہے کہ تھوڑی ہو یا بہت اور موجب سزائے جسمانی ہو یا نہ ہو اس سے ڈرنا اور بچنا ہی چاہیئے، تو مؤمن کو کافر کی معنی ملامت نہ سہی، مگر ادنیٰ سی ملامت بھی ملامت ہی ہے اور آخرت کا تو اھون ا بھی خدا بچائے، اشد ۲ ہی ہے۔ ایک وقت کی نماز بھی اگر قضا ہوگئی ہے تو ہزاروں برس دوزخ میں رہنا ہوگا، تین پیسہ قرض کے رہ گئے ہیں تو سات سو مقبول نمازیں چھین لی جائیں گی۔ غرض مؤمن کی ملامت خواہ کافر کی ملامت کے پاسنگ ۳ بھی نہ ہو، مگر بڑے خوف کی چیز ہے اور اس بنا پر یہ خطاب اولم نعمرکم (کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی)، علیٰ قدر مراتب ۴ ہر اس شخص کے لئے ہے جو مرض غفلت میں مبتلا ہے۔

یہاں کفار سے تو مجھے بحث کرنا نہیں، میرے مخاطب اس وقت مؤمنین ہیں، اور جو جس درجہ غفلت میں مبتلا ہے اسی قدر خطاب بھی اس کی طرف متوجہ ہے، جو عقائد کی غلطی میں مبتلا ہے اس سے اس کے مرتبہ کے موافق، اور جو اعمال کی غلطی میں مبتلا ہے اس سے اس کے مرتبہ کے موافق، علی ہذا ۵ معاشرت۔ معاملات۔ اخلاق۔ جس قسم کی بھی کوئی غلطی کر رہا ہے اسی قدر خطاب میں شدت وخفت ہوگی۔ ہم لوگ جس قدر غلطیوں میں مبتلا ہیں بیان کی احتیاج نہیں۔ کوئی شخص بھی یہ نہیں کہہ سکتا کہ میں کسی غلطی یا کوتاہی میں مبتلا نہیں ہوں، خود حدیث میں آچکا ہے کلکم خطاؤن. یعنی ''تم سب کے سب خطا وار ہو''۔ تو پھر کس کا منہ ہے خطا سے براءت کا مدعی ہو، تو یہ خطاب بھی سب ہی کی طرف متوجہ ہوگا، اور مؤمنین کے سامنے اس قیامت کے واقعہ کو نقل کرنے سے حق تعالیٰ کا مقصود یہی ہے کہ مؤمنین چونک جائیں، اور کفار کے اس واقعہ کو سن کر نصیحت پکڑ لیں، اور یہ سنانا ایسا ہے جیسے ایک شخص کو پھانسی دی جاتی ہے، اور علی رؤس الاشہاد ۶ اس سے کہا جاتا ہے کہ کیا تمہیں قانون کا اور سلطنت کے جبروت ۷ کا علم نہ تھا کہ یہ فعل جرم ہے، اور سلطنت کے قبضہ سے تم بھاگ نہیں سکتے ہو، جو اس کا ارتکاب کیا، اب سزائے موت چکھو، اس جملہ سے اس مجرم کی نصیحت مقصود نہیں ہوتی، کیونکہ اس کا تو

۱:۔ بہت ہلکا عذاب ۲:۔ بہت سخت۔ ۳:۔ یعنی اس کے مقابلے میں معمولی۔ ۴:۔ مرتبے کے معیار کے اعتبار سے۔ ۵:۔ اسی طرح۔ ۶:۔ سب لوگوں کے سامنے۔ ۷:۔ پکڑ، طاقت۔

اب خاتمہ ہو جائے گا، اس کی نصیحت سے کیا نفع بلکہ دوسروں کو متنبہ کرنا ہوتا ہے کہ جرم ایسی چیز ہے تاکہ وہ اس سے بچیں، اور یہ عامہ رعایا کے لئے باعث رحمت ہے کیونکہ آئندہ کے لئے انسداد جرائم کا موجب ہے۔

حق تعالیٰ نے وہ خطاب جو کفار سے قیامت میں ہوگا قیامت سے پہلے ہی مؤمنین کو سنا دیا تاکہ وہ نصیحت حاصل کرلیں اور ان کی طرح عذاب و ملامت میں نہ پڑیں، تو یہ بڑی رحمت ہوئی مؤمنین کے لئے بشرطیکہ اس سے کام لیں، اور اس میں حق تعالیٰ نے اصلاح کے لئے ایک مراقبہ کی تعلیم فرمادی، وہ یہ ہے کہ عمر کے جلد جلد گذرنے اور ختم ہونے کو ہر وقت پیش نظر رکھے، اور ہر وقت کو آخری وقت سمجھے۔ یہ ہے خلاصہ تمام میری تقریر کا اور اجمال ساری تفصیل کا۔

اب سمجھئے بڑھاپا ''نذیر'' یعنی ڈرانے والا کیونکر ہے، یہ نذیر اس طرح ہے کہ سفید بالوں سے موت کی خبر آتی ہے کیونکہ عمر کے حصے کبھی کبھی تین ہوتے ہیں (کبھی کبھی کا لفظ اس واسطے کہا ہے کہ دواماً[۱] تین نہیں ہوتے، خصوصاً اس زمانہ میں کہ جوان موتیں بکثرت ہوتی ہیں، یہی وجہ ہے کہ اب جوان موت سے بھی ہم لوگوں کو تنبہ[۲] نہیں ہوتا، ورنہ پہلے کہیں جوان موت ہو جاتی تھی تو تمام بستی میں غل مچ جاتا تھا، اور کم وبیش سب متاثر ہوتے تھے اور اب عادت سی ہوگئی) تاہم عرفاً جو حصے مانے جاتے ہیں تین ہیں۔ ایک تو لڑکپن کا اور ایک جوانی کا اور ایک بڑھاپے کا، پہلے دو حصوں میں یعنی لڑکپن اور جوانی میں تو کسی درجہ میں توقع ہوتی ہے کہ بہت عمر پڑی ہے، توبہ وطاعات کے لئے ابھی کیا جلدی ہے، اور آدمی لیت ولعل[۳] کرتا رہتا ہے، اس امید پر کہ آئندہ توبہ کرلوں گا، گویہ توقع مہمل[۴] ہے کیونکہ عمر کا طویل ہونا اختیاری بات نہیں، صرف ایک ضعیف سا احتمال ہے کہ عمر ممتد[۵] ہوگی۔

غیر اختیاری چیز پر گناہ کرنا بڑی غلطی ہے

جب اپنے قبضہ کی بات نہیں، اور دوسرے کے قبضہ کی بات ہے، تو اس پر مہالک[۶] کی بناء کرنا یعنی گناہ کرنا مستحق جہنم بننے کو گوارا کرلینا صرف اس خیالی بات پر کہ آئندہ کہ اس کا تدارک کرلوں گا کس قدر بے عقلی کی بات ہے، گویا پھانسی کو گلے میں ڈال لینا ہے، اس خیال پر کہ میرے زور کرنے سے رسی ٹوٹ جائے گی۔

---

[۱]۔ ہمیشہ۔ [۲]۔ تنبیہ، عبرت۔ [۳]۔ ٹال مٹول۔ [۴]۔ بیکار۔ [۵]۔ لمبی۔ [۶]۔ ہلاک کرنے والے

مزید برآں یہ ہے کہ دنیا میں یہ بھی تو نہیں ہے کہ اوسط کے حساب سے زیادہ آدمی بڑھاپے کی عمر کو پہنچتے ہوں بلکہ بڑھاپے کو نہ پہنچنا کثیر الوقوع[۱] ہے، تو یہ شاذ و نادر[۲] کے حکم میں ہوا، اور مثل مشہور ہے "النادر کالمعدوم" (نادر مثل نہ ہونے ہی کے ہے) امر نادر پر کسی امر کی بنا[۳] نہیں کی جایا کرتی، تو جب عمر کا امتداد[۴] بڑھاپے تک اپنے اختیار سے خارج اور محتمل محض ہے، پھر تجربہ اس کے خلاف کا ثبوت دیتا ہے، یعنی اوسط بڑھاپے تک اکثر نہیں پہنچتا تو یہ توقع کسی قدر مہمل ہوئی، عاقل کو تو اس میں قدرت خدا نظر آتی ہے کہ قدرت نے کیسا آفتاب پر پردہ ڈالا ہے کہ جو بات دلیل سے محض موہوم اور تجربہ سے اس کا عکس متحقق، اس کے وجود پر مہالک کی بناء کی جاتی ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اگر عادت سے بھی اس کا وقوع ثابت ہو جائے کہ بڑھاپا بھی ایک لازمی حصہ عمر کا ہے، اور اکثر انسان بڑھاپے کی عمر پا ہی کر مرتے ہوں تب بھی اس پر کسی کام کی بنا کرنا عجیب بات ہے، کیونکہ یہ خواہ وقوعاً اکثر ہو مگر اسباب طبعیہ سے مظنون[۵] نہیں ہے، صرف ضعیف احتمال کے درجہ میں ہے تو یہ توقع محض نادانی ہوئی۔

انسان کا زندہ رہنا تعجب کی بات ہے نہ کہ مرنا

بیان اس کا یہ ہے کہ انسان کے بدن کی ترکیب اضداد[۶] سے ہوئی ہے، یعنی اربع عناصر سے، اور یہ سب آگ اور پانی اور ہوا اور مٹی آپس میں ایک دوسرے کی ضد ہیں اور بالطبع ایک دوسرے سے بعد اور علیحدگی کو چاہتے ہیں۔ دیکھئے پانی میں مٹی ڈال دیجیے، نیچے بیٹھ جائے گی، یہ نہ ہوگا کہ مل جائے۔ ہوا میں پانی گرایئے، ہوا اوپر اور پانی نیچے ہو جائے گا، اور آگ تو سب سے اوپر ہونا چاہتی ہے۔ قدرت خدا ہے کہ بدن میں چاروں چیزیں یکجا موجود ہیں، اور تعجب کی بات ہے کہ اضداد سے ایک چیز مرکب ہے، اس کو "قسر قاسر" کہتے ہیں، مگر ظاہر ہے کہ اسے مرکب کا اصل اقتضاء[۷] ہلاک اور تحلل ترکیب[۸] ہی ہے، تعجب اگر ہو سکتا ہے تو اس کی بقاء سے ہو سکتا ہے نہ کہ فنا سے۔ فنا تو ہر وقت اس کے سر پر کھڑی ہے، تو اگر عمر کا بڑھاپے تک امتداد اکثری درجہ تک بھی مان لیا جائے، تب بھی اس وجہ سے کہ یہ امتداد خلاف قاعدہ ہے، اور خطرہ کی حالت میں ہے، اس لئے اس قابل نہیں کہ اس پر کسی امر کی بنا کی جائے۔

---

[۱]:۔ اکثر۔ [۲]:۔ جو بہت کم ہو۔ [۳]:۔ بنیاد۔ [۴]:۔ لمبا ہونا۔ [۵]:۔ غالب گمان۔ [۶]:۔ متضاد چیزوں۔ [۷]:۔ تقاضا۔ [۸]:۔ اجزاء کا تحلیل ہو جانا یعنی علیحدہ علیحدہ ہو جانا۔

اس کی مثال یہ ہے کہ بہت سے علاج عوام میں ایسے رائج ہیں کہ ان سے دن رات کام لیا جاتا ہے اور مفید ہوتے ہیں، لیکن درحقیقت وہ قواعد طبی کے خلاف ہیں تو اس وجہ سے کہ ایک کثیر تعداد انسانوں کی اس کو استعمال کرتی اور فائدہ اٹھاتی ہے، عامی آدمی[۱] اس پر اعتماد کر لیتا ہے لیکن جب وہ علاج اہل عقل اور ماہرین فن کے سامنے پیش کیا جاتا ہے، وہ اس کو رد کر دیتے ہیں، اور کبھی جرأت اس کے استعمال کی نہیں کرتے، وجہ کیا؟ صرف یہ کہ وہ قواعد کے خلاف ہے، تو باوجود تجربہ کی شہادت کے، محض مخالفتِ قواعد کی وجہ سے اس کا نافع ہونا درجہ ظن[۲] سے گر گیا۔ ایسے ہی اگر یہ بات ثابت ہو جائے کہ بڑھاپا بھی باعتبار عادت کے وقوعاً اکثری ہے، تب بھی قواعد پر نظر کرنے سے ظنی نہ رہے گا بلکہ صرف مشکوک بلکہ موہوم رہ جائے گا۔ اور اس پر بھروسہ کر لینا اور اعمال اخروی کو اس پر محول[۳] کرنا عقل کا کام نہ ہوگا۔ یہ گفتگو تو محض ترکیب جسمانی کے اعتبار سے ہے کہ تعجب ہے کہ اس کا وجود ہی کیونکر ہوا، جب کہ تمام اجزاء اس کے باہم متنافر[۴] ہیں، اور جب اس کی بقا کی طرف نظر ڈالیں تو اور تعجب در تعجب ہوتا ہے۔ مان لیا کہ ایک دفعہ آپ کا وجود خواہ کسی طرح سے بھی ہو موجود ہو گیا، لیکن تعجب اس کے بقاء میں ہے کہ جس کی ایک وجہ تو ترکیب من الاضداد[۵] ہے۔

اور دوسری وجہ یہ ہے کہ انسان دونوں وقت بدن کے باقی رکھنے کے لئے جو کام کرتا ہے وہ سب بقا کے خلاف ہیں، مثلاً کھانا ہی کھاتا ہے تو ذرا اس میں غور کر کے دیکھئے، عادت ہو جانے سے ذہول[۶] ہو گیا ہے، ورنہ کھانا کھانے کے جتنے اجزاء ہیں سب درحقیقت بقا کے سامان نہیں، فنا کے سامان ہیں، کیونکہ کھانا کھانے کی حقیقت یہ ہے، غذا کو تھوڑا تھوڑا منہ میں رکھئے، اور پیٹ میں اتاریئے۔ اس کے لئے سب سے اول اس کی ضرورت ہے کہ لقمہ گلے سے اتر جائے، اور سب سے پہلا یہی فعل غیر اختیاری ہے کیونکہ ان حضرات کو تو یہ بھی خبر نہیں کہ لقمہ گلے سے کیسے اتر جاتا ہے۔ حلق میں دو سوراخ ہیں ایک ''مجرائے نفس'' یعنی سانس کی نالی اور ایک ''مجرائے طعام'' یعنی کھانا پانی اترنے کا راستہ ہمیں یہ خبر نہیں کہ کھانا کیونکر اترا کس طرف کو گیا مگر سانس برابر اپنے راستہ سے آتا ہے اور کھانا پانی اپنے راستہ سے جاتا ہے کھانے والا تو اپنے ارادہ سے لقمہ کو نیچے لے جاتا ہے اور یہ فضلِ خداوندی ہے کہ وہ مجرائے نفس[۷] میں نہیں جاتا، بالاضطرار اپنے مجرا[۸] میں چلا جاتا ہے انسان اپنے

۱:۔عام۔ ۲:۔یعنی اس کے مفید ہونے کا غالب گمان نہ ہوگا۔ ۳:۔موقوف رکھنا۔ ۴:۔ایک دوسرے کی ضد۔ ۵:۔ضدوں سے مرکب ہونا۔ ۶:۔توجہ نہیں ہوتی۔ ۷:۔سانس کی نالی۔ ۸:۔یعنی اپنے راستے۔

ہاتھوں تو مرنے کا سامان کرتا ہے کیونکہ اس نے اپنے ارادہ سے حلق کی طرف سے نیچے کو لقمہ کو سرکا دیا۔

اب یہ بات کہ لقمہ سانس کے مجرا میں نہ جائے، اس میں اس کے فعل کو کچھ بھی دخل نہیں، اگر ادھر کو چلا جائے تو کچھ بعید نہیں، تعجب کیا، اور ادھر کو چلا جانا موت ہے۔ حق یہ ہے کہ اگر کرمِ خداوندی نہ ہو تو ایک لقمہ بھی پیٹ میں نہیں جاسکتا بلکہ مارنے کے لئے بہت کافی ہے۔

فعل محتمل الضرر کو اختیار کرنا ہلاکت میں پڑنا ہے

غرض کھانا کھانے میں دونوں احتمال برابر ہیں کہ یا تو ہلاکت کا سامان ہے یا بقاءِ حیات[۱] کا، اور محتمل الضرر[۲] کام کا اختیار کرنا ہلاکت کا اختیار کرنا کہلاتا ہے۔ دیکھو ڈاکو ڈاکا ڈالتے ہیں، اس میں دونوں احتمال ہوتے ہیں کہ یا تو کامیابی اور اپنی مرضی کے موافق مال ہاتھ آیا اور یا پکڑے گئے تو مارے گئے، تو دیکھ لیجئے کہ کوئی عقلمند آدمی ایسے فعل کو اچھا نہیں کہتا، بلکہ جب ڈاکو پکڑا جاتا ہے تو سرزنش کرتے ہیں کہ اپنے ہاتھوں برباد ہوا، حالانکہ اس نے اپنی بربادی کبھی نہیں چاہی، صرف ایک فعل محتمل الضرر کیا ہے۔ جب محتمل الضرر کا کرنا اپنے کو ہلاک کرنا ہے، اور کھانا کھانے میں بھی ہلاکت کا احتمال ہے تو ثابت ہوا کہ انسان تو دونوں وقت اپنی ہلاکت کا سامان کرتا ہے، لیکن حق تعالیٰ اپنی عنایت سے اس کو بقا کا سامان کر دیتے ہیں۔ پھر حیرت ہے کہ جو شخص روزانہ دو دفعہ موت کے منہ میں خود جاتا ہو، وہ بڑھاپے کا خواب دیکھے، اگر کوئی کہے کہ لقمہ اتارنا اور نگلنا تو ہمارے اختیار میں ہے اضطراری ہونا کیا معنی؟ تو اس کی تکذیب اس طرح کی جائے گی کہ صدور بالاختیار ہمیشہ مسبوق بالعلم[۳] ہوتا ہے، یعنی جب ہم کسی فعل کو اختیاری کہیں تو اس کے صدور[۴] کے قبل لازم ہے کہ ہم کو اس کا اور اس کے ذرائع کا اول علم بھی ہو مثلاً ہم کہیں کہ ہم بازار گئے تھے تو بازار جانا اختیاری ہے، جب کہا جائے گا کہ ہم کو بازار کے راستہ اور بازار کا علم پہلے سے ہو اور اگر کوئی ہم کو اٹھا کر ایسے بازار میں پھرا لایا جس کو ہم نے کبھی دیکھا بھی نہیں، تو اس کو اختیاری فعل نہ کہیں گے، بلکہ اضطراری کہیں گے، اور یہ نہ کہیں گے کہ ہم بازار گئے تھے، بلکہ یوں کہیں گے کہ فلاں ہم کو لے گیا تھا۔

۱:۔ زندگی باقی رہنا۔ ۲:۔ جس کام میں نقصان کا اندیشہ ہو۔ ۳:۔ جو چیز اپنے اختیار سے کی جائے اس کا پہلے سے علم ہوتا ہے۔ ۴:۔ شروع کرنے۔

اب ہم پوچھتے ہیں کہ اگر غذا کو پیٹ میں پہنچا لینا امر اختیاری ہے تو مدعی علیہ یہ بتا دے کہ وہ سوراخ جس میں سے ہو کر کھانا اترتا ہے کون سا ہے، بجز علم طب جاننے والے کے کوئی بھی نہیں بتا سکتا اور طبیب کتنے ہیں والعبرۃ الاکثر (اعتبار اکثر کا ہوتا ہے) مسلم قاعدہ ہے تو جبکہ مجرائے طعام[۱] کا ہم کو علم تک نہیں تو اس فعل کو جو اس پر موقوف ہے اختیاری کہنا کیا معنی؟ اور جن کو بوجہ طب کے جاننے دیکھ لینے کے علم بھی ہے کہ مجرائے طعام کون سا ہے، ان کے قبضہ میں بھی یہ بات نہیں اضطرار محض[۲] ہے۔ پس انسان اپنے اختیار سے ایسا کام کرتا ہے جس میں احتمال ہلاکت موجود ہے تو یہ اپنے ہاتھوں دن میں دو وقت، دونالی، بندوق سے اپنے اوپر فائر کرتا ہے، مگر حق تعالیٰ کا کرم ہے کہ اس کو اس سے بچا لیتے ہیں۔ ورنہ فی نفسہ یہ طریقہ ایسا خطرناک ہے کہ اگر پیٹ میں غذا پہنچانے کی کوئی ترکیب بھی عادۃً ہوتی ہے اور اس کے بعد امتحان کے لئے کسی خاص ایک انسان میں یہ طریقہ بتلایا جاتا کہ دیکھو یہ منہ ہے اور اس کے منتہا پر دو سوراخ ہیں، ایک سوراخ ہوا کی آمد و رفت کا ہے اور دوسرا کھانے کے اترنے کا، اور اس دوسرے سوراخ میں کھانے کا اتر جانا ایسا خطرناک ہے کہ فوراً موت ہے، پھر اس کے بعد اس سے نگلنے کی فرمائش کی جاتی اور اس کا اعلان بھی ہو جاتا تو باللہ العظیم[۳] یہ ایسا عجیب واقعہ ہوتا کہ دور دور سے لوگ دیکھنے کو اور تماشہ کو جمع ہوتے، اور بالیقین کہا جاتا ہے کہ جس انسان کے لئے یہ صورت تجویز ہوتی، جس وقت اس سے کہا جاتا کہ منہ میں لقمہ رکھ کر پیچھے کو سرکا، اور اس کو یقین دلایا جاتا کہ لقمہ پہلے سوراخ کے مجرا پر صرف گذر جائے گا دوسرے سوراخ میں ہرگز نہ جائے گا، تو لاکھ طرح سے اس کا اطمینان کرتے مگر اس کے مارے خوف کی وہ حالت ہوتی جیسے ایک شخص سے کہیں کہ تختہ پر کھڑا ہو کر پھانسی گلے میں ڈال لے اور یہ اطمینان رکھ کہ پھانسی گلے کو دبائے گی نہیں، تو وہ کانپنے لگے گا اور واللہ باللہ اپنے اختیار سے تو کبھی بھی اس فعل کو نہ کرے گا، ایسی حالت لقمہ نگلنے والے کی ہوتی ہے، مگر حق تعالیٰ کی نعمتوں اور فضل و کرم کا کیا ٹھکانا ہے کہ ایسے نازک کام کو کس خوبی سے انجام دیا ہے اور ایک دفعہ نہیں تمام عمر کے لئے نگلنے کا طریقہ ہر وقت کے لئے بھی قرار دے دیا جو عجیب تماشہ کے قابل بات تھی حتی کہ اس عادت مستمرہ[۴] سے انسان یہ سمجھنے لگا کہ نگلنا تو کچھ بھی خطرناک بات نہیں اور ہمارا اختیاری فعل ہے، باعث حیات[۵] ہے نہ کہ باعث ہلاکت دونوں وقت کھانا کھاتا ہے

[۱]:۔ کھانے کی نالی (کہ جس کو دیکھا تک نہیں)۔ [۲]:۔ غیر اختیاری ہے۔ [۳]:۔ عظیم اللہ کی قسم۔ [۴]:۔ مستقل عادت [۵]:۔ زندگی بنانے والا۔

اور کبھی اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ میں نے کیا کیا تھا اور کیا ہو گیا۔

صاحبو! ہم اپنے ہاتھوں ہلاکت کا کام کرتے ہیں، مگر حق تعالیٰ اس کو باعثِ حیات کر دیتے ہیں۔ دیکھئے اس کی قدر جب معلوم ہوتی ہے جب کبھی پھندا لگ جاتا ہے، کیا مصیبت ہوتی ہے آنکھیں باہر نکل آتی ہیں، دموں پر بن جاتی ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اپنے اختیار سے آدمی ایسی تکلیف مول لیتا ہے۔ اگر اختیاری بات ہوتی تو پھندا کیوں لگنے دیتا۔ ایک شخص کو تھانہ بھون میں ایک تقریب میں ایسا پھندا لگا کہ دم کے دم میں مر ہی گئے۔ تمام مجلس دعوت کی مکدر ہو گئی اور سب خوشی ملیا میٹ ہو گئی۔ کیا یہ فعل اختیاری تھا؟ صاحبو! بندہ کا فعل صرف ارادہ ہے، آگے ہر فعل کا فاعل اور ہی ہے، ان حالات کو دیکھ کر موٹی سی عقل والا یہی کہہ اٹھتا ہے کہ انسان بڑا مجبور اور ضعیف ہے جس زندگی پر ہم پھولے ہوئے ہیں وہ دو وقت ہمارے اختیار سے اس خطرہ میں ڈالی جاتی ہے، ہم دن میں دو وقت پھانسی لگتے ہیں مگر حق تعالیٰ کا فضل و کرم مستمر[۱] ہے کہ تمام عمر وہ پھانسی اپنا کام نہیں کرتی۔

عادت کے اختیاری نہ ہونے کی بدیہی مثال

کیوں صاحبو! دیکھا ہوگا کہ ہم ڈاک میں اپنا خط ڈالتے ہیں اور وہ برابر پہنچتا ہے، اور سینکڑوں ہزاروں دفعہ میں بھی شاید ایسا نہ ہوتا ہوگا کہ نہ پہنچے، مگر کیا کبھی آپ کے دل میں یہ خطرہ بھی گزرا ہے کہ ڈاک ہمارے اختیار میں ہے، ہرگز نہیں۔ تمہارا کام تو صرف خط ڈالنا تھا، پہنچانا کسی اور کا کام ہے۔ بس ایسے ہی ان افعال کو سمجھ لیجئے کہ ارادہ اور کسب تک تو اختیاری ہیں اور اسکے بعد ثمرہ[۲] کے درجہ میں غیر اختیاری ہیں۔ پس عادت مستمرہ[۳] کو دیکھ کر سمجھ لینا کہ ہمارا فعل سببِ حقیقی ہے، نتیجہ کے وجود کی سخت غلطی ہے، گو اس میں ایک دنیا مبتلا ہو مگر غلطی، غلطی ہی ہے کیا وجہ ہے کہ تمام عمر یہ دیکھنے کے بعد بھی کہ خط لیٹر بکس میں ڈالنے سے پہنچ جاتا ہے یہ کبھی خیال نہیں ہوتا کہ لیٹر بکس میں یہ اثر ہے یا خط میں یہ اثر ہے یا ڈاک پہنچانا ہمارا اختیاری فعل ہے، حالانکہ عادت مستمرہ کی رو سے خط لیٹر بکس میں ڈالنے پر ہمیشہ یہ نتیجہ متفرع[۴] ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دلیل مخالف کے ہوتے ہوئے عادت پر نظر کر کے اپنے آپ کو فاعلِ مختار قرار دینا صحیح نہیں۔ یہ تو نگلنے کی بات ہے کہ موت کا سامان ہے مگر حق تعالیٰ کی حفاظت سے حیات کا

۱:۔ ہمیشہ۔ ۲:۔ نتیجہ۔ ۳:۔ مسلسل عادت۔ ۴:۔ نکلتا ہے۔

سامان بن جاتا ہے۔ اب اس کے بعد دیکھئے کہ غذا معدہ میں پہنچی۔ سب جانتے ہیں کہ غذا معدہ میں کیوں پہنچائی جاتی ہے اس سے غرض بدل ما یتحلل ا کا پہنچنا ہوتا ہے یعنی بدن میں ہر وقت تحلیل ہوتی رہتی ہے اگر اس کے بعد دوسرے اجزاء بدن میں شامل نہ ہوتے جاویں تو بہت ہی تھوڑے وقت میں بدن ختم ہو جائے تو غذا سے غرض یہ ہے کہ جزوِ بدن بنے اور یہ اس پر موقوف ہے کہ غذا بدن کے مجانس اور مشاکل ۲ ہو۔

جوتی میں اگر پیوند لگانا ہو تو کسی نے یہ نہ دیکھا ہوگا کہ ایک لکڑی کا ٹکڑا اس میں باندھ دیا ہو اور جوتی درست ہوگئی، بلکہ چمڑہ ہی سے اس کی مرمت ہو سکتی ہے، تو بدن میں جن اجزاء سے پیوند لگانا ہے ان کا بدن کے مشابہ ہونا ضرور ہے، تو آدمی اگر خون پیتا تب تو کسی درجہ میں یہ خیال ہو سکتا تھا کہ تحلیل شدہ خون مادۂ بدن تھا اس کے مشاکل ۳ کو معدہ میں پہنچایا ہے، یہ جزوِ بدن بن سکتا ہے گو یہ بھی صحیح نہیں کیونکہ اگر انسان خون بھی پیئے تب بھی اس میں فعل طبیعت سے استحالہ ۴ ہو کر قابلیت جزوِ بدن بننے کی پیدا ہوتی ہے، کما برهن علیه فی موضعه (جیسا کہ اس پر اپنے مقام میں دلیل قائم کی گئی ہے)، مگر خیر پھر بھی خون کو کچھ صوری تو مشاکلت بدن کے ساتھ ہے لیکن خون انسان کی غذا نہیں ہے بلکہ انسان ایسی چیز کھاتا ہے جس کو ذرا بھی مجانست ۵ بدن کے ساتھ نہیں ہو سکتی، مثلاً روٹی، دال، چاول وغیرہ، اور اسی کا خون بن جاتا ہے۔ اب بتلایئے یہ خون کون بناتا ہے؟ اگر خدا تعالیٰ نے معدہ میں قوت مستحیل کرنے کی اور جگر میں اخلاط بنا لینے کی نہ رکھی ہوتی تو یہ لقمے سب ویسے ہی رکھے رہتے، اور عجب نہیں کہ معدہ اور جگر کو پھاڑ ڈالتے۔ چنانچہ کبھی کبھی اس کو دکھلا بھی دیتے ہیں، بعض دفعہ معدہ اور جگر کی اس قوت کو کم کر دیتے ہیں تو کیا کیا مصیبتیں ہوتی ہیں۔ پیٹ میں درد ہوتا ہے، بند لگ جاتا ہے ورم ہو جاتا ہے، پھوڑا بن جاتا ہے، وہ ایک لقمہ جو ہر روز غذا بنتا تھا آج بڑے بڑے ماہر طبیبوں اور ڈاکٹروں کے قابو میں نہیں آتا، جزوِ بدن تو کیا کوئی بنتا، اس کے نکال دینے اور بند کھول دینے پر بھی بعض وقت قدرت نہیں ہوتی اور تڑپ تڑپ کر آدمی مر جاتا ہے۔

قدرتِ خدا ہے کہ ایسی چیز جو اس قدر پریشان کرنے والی اور غیرِ جنس ہے، ہر روز دو وقت ہمارے پیٹ میں جاتی ہے اور بدل ما یتحلّل ۶ بنتی ہے، اور ہم کو خبر بھی نہیں ہوتی کہ اس وقت کیا

ا:۔ کہ وہ غذا جسم کے مفید اجزاء میں تبدیل کر کے بدن کو طاقت پہنچائے۔ ۲:۔ اسی جیسی اور ہم شکل۔ ۳:۔ ہم شکل۔ ۴:۔ تبدیل ہو کر۔ ۵:۔ مشابہت۔ ۶:۔ جسم کے جو اجزاء تحلیل یعنی ختم ہو گئے تھے (جاری ہے)

استحالہ ۱ ہوا اور اس کے بعد کیا ہوا؟ کس قدر عجیب بات ہے!۔اب انصاف سے فرمایئے کہ ان اسباب کے ہوتے ہوئے بقاء عجیب ہے یا ہلاک؟ ہلاک تو ذرا بھی عجیب نہیں کیونکہ دو وقت روزانہ اس کی تدبیر کی جاتی ہے، ہاں ان اسبابِ ہلاک کا الٹا اثر ہونا عجیب ہے، تو انسان کا مرجانا تو عجیب نہ ہوا، زندہ رہنا اور عمر کا امتداد بیشک عجیب ہوا، تو اب یہ توقع کہ میری عمر زیادہ ہونے والی ہے، اور یہ کہنا کہ وقت بہت ہے پھر عمل کرلیں گے، جلدی کیا ہے؟ یہ کہنا جوانی میں بھی بلکہ لڑکپن میں بھی غلطی ہے، مگر خیر بچپن اور جوانی میں تو کسی درجہ میں کچھ گنجائش بھی ہے اس وجہ سے کہ کبھی تو ایسا ہوتا ہی ہے کہ آدمی بڑھاپے کو پہنچ جاتا ہے۔

محتمل بات پر کسی کام کی بنا غلطی ہے

اس لئے بچہ اور جوان کو کسی قدر احتمال ہوسکتا ہے کہ میری عمر کا ایک حصہ اور باقی ہے لیکن بڑھاپے کے بعد کون سی حالت آنے والی ہے جس کی توقع کی جائے کہ ابھی تو بڑھاپا ہی آیا ہے اس کے بعد فلاں زمانہ آوے گا جو کچھ کرنا ہے آئندہ اس میں کرلیں گے۔ صاحبو! بڑھاپے کے بعد تو موت ہی ہے جو قاطعِ اعمال ۲ ہے، اس لئے اگر بڑھاپے میں بھی وہی حالت رہی، جو شباب میں تھی تو سخت افسوس کے قابل ہے، عارف شیرازی نے فرمایا ہے۔

شکست رنگِ شباب و ہنوز رعنائی　　　درآں دیار کہ بودی ہنوز آں جائی ۳

وہ رعنائی کیا ہے؟ یہ خیالات ہیں، امتدادِ عمر ۴ کی توقع، اور اعمال میں کوتاہی ہے، کیا صاحبو اس نیند سے جاگنے اور اس نشہ کے دور ہونے کیلئے اسی وقت کا انتظار ہے جو حدیث میں وارد ہے الناس نیام فاذا ماتوا انتبھو کہ لوگ سورہے ہیں مرکر جاگیں گے!۔

صاحبو! یاد رکھو اس وقت کا جاگنا محض بے سود ہوگا، اس سے پہلے ہی جاگ جاؤ۔ سو اخیر وقت جاگنے کا بڑھاپا ہے۔ اگر خداعِ نفس ۵ سے لڑکپن اور جوانی میں توقع امتدادِ عمر ۶ کا نشہ رہا تو بڑھاپے میں تو اس خداع ۷ کے چلنے کی بھی کچھ گنجائش نہیں، کیونکہ اس خداع ۸ کی بنا اس پر تھی کہ

(بقیہ) غذا اس کا بدل بن جاتی ہے۔ ۱:۔تبدیلی۔ ۲:۔اعمال کو ختم کرنے والی۔ ۳:۔جوانی کا رنگ روپ تو ختم ہوگیا ابھی تک تو رعنائی میں ہے جس دیار میں تو رہتا ہے سمجھتا ہے یہی میرے رہنے کی جگہ ہے۔ ۴:۔لمبی عمر۔ ۵:۔نفس کے دھوکہ کی وجہ سے۔ ۶:۔عمر لمبی ہونے کا نشہ۔ ۷، ۸:۔دھوکہ۔

ابھی عمر کے حصوں میں سے ایک یا دو حصہ باقی ہیں، مگر اب تو یہ اخیر دور ہے، اب یہ خداع ا کس بنا پر چل سکتا ہے ہم لوگوں کو کچھ تو ہوش سنبھالنا چاہئے، عمر برابر گزرتی چلی جارہی ہے، اور جو وقت گزرجاتا ہے وہ وقت سے خارج اور اتنا بعید ہوجاتا ہے کہ اس سے زیادہ کوئی چیز بعید نہیں ''ما أبعد ما فات وما أقرب ما هو آت'' (جو عمر فوت ہوگئی وہ کس قدر بعید ہے اور جو آنے والی ہے وہ کس قدر قریب ہے)۔

جس عمر کی توقع میں ہم لوگ بیٹھے ہیں وہ ایسی تیز رفتار ہے کہ اس کے اجزاء ہم پر برابر گزرتے چلے جاتے ہیں اور نظر بھی نہیں آتے۔ پس جو کام آئندہ کرنا ہے اس کی خبر اسی وقت سے لینا چاہئے، کیونکہ زمانہ کے آئندہ اجزاء بہت جلد آنے والے ہیں، اور جب آکر زمانۂ حال میں شمار ہونے لگیں گے تو طرفۃ العین ۲ میں حال سے ماضی بن جاوینگے اور اتنے دور ہوجاویں گے کہ دنیا بھی چاہے کہ ایک جزو کو اس میں جو ابھی ایک منٹ بلکہ ایک سیکنڈ پہلے موجود تھا پکڑ لے تو ممکن نہیں۔

عمر تھوڑی ہے مگر نفس اس کو لمبی دکھلاتا ہے

غرض عمر کے تین حصوں میں سے یعنی لڑکپن اور جوانی اور بڑھاپے میں سے بڑھاپے کو یہ خاص امتیاز ہے کہ لڑکپن میں تو چنداں ہوش ہی نہیں ہوتا اور جوانی میں باوجود ہوش ہونے کے طبعاً آدمی کو یہ خیال ضرور رہتا ہے کہ عمر ایک ممتد ۳ شئے ہے جس کا ایک حصہ ابھی باقی ہے لیکن بڑھاپا آجانے کے بعد کون سے حصہ کا انتظار کیا جاسکتا ہے مگر آدمی میں طبعاً یہ غفلت رکھی ہوئی ہے کہ آئندہ زمانہ کو ممتد اور طویل سمجھتا ہے حالانکہ یہ ایسی غلطی ہے کہ خود ہی اس کا غلط ہونا محسوس ہوجاتا ہے کیونکہ یہ بھی طبعی بات ہے کہ زمانۂ ماضی کو ہیچ ۴ اور غیر ممتد سمجھتا ہے گنوار سے بھی پوچھا جائے کہ تمہاری عمر تو بہت ہوگی اور بڑا زمانہ تم نے دیکھا تو کہے گا اجی سب باتیں خواب وخیال ہوگئیں کل کی بات ہے کہ ہم بچے تھے اور جوان ہوئے اور یہ ہوا اور وہ ہوا۔ ایک مقدمہ تو یہ ہے اور دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ اگر زمانہ کی حقیقت پر نظر کی جاوے تو ماضی و مستقبل میں کچھ فرق نہیں بس جب ماضی کو حقیر سمجھتے ہو تو مستقبل کو بھی حقیر سمجھو اور واقعہ بھی یہی ہے کہ زمانہ بہت قلیل شئے اور ناقابل اعتبار چیز ہے اور اس میں ماضی اور مستقبل میں کچھ تفاوت ۵ نہیں مگر کوئی مانع خارجی ہے جس کی وجہ سے مستقبل ہم کو بڑا

۱:۔ دھوکہ۔ ۲:۔ پلک جھپکنے۔ ۳:۔ لمبی۔ ۴:۔ کچھ بھی نہیں۔ ۵:۔ فرق۔

اور ممتد دکھائی دیتا ہے جب وہ مانع رفع ہو جاتا ہے تو اصلی حالت نظر آنے لگتی ہے وہ مانع سوائے غفلت اور خداع نفس کے کیا ہے؟

جب اس خداع سے نفس نے انسان کو اعمال سے روک دیا پھر وہ مستقبل ماضی بن گیا تو اب اپنی واقعیت پر نظر آنے لگا اب اس کو طویل اور ممتد دکھانے میں نفس کا کوئی نفع نہیں اس لئے اب سب باتیں خواب وخیال نظر آنے لگیں اور گزشتہ عمر ایک لمحہ جیسی معلوم ہونے لگی پس عاقل وہ ہے جو ماضی پر مستقبل کو قیاس کرے اور سمجھ لے کہ جیسے وہ خواب وخیال ہو گیا ایسے ہی آئندہ زمانہ بھی خواب وخیال سے زیادہ نہیں۔ غرض بڑھاپا ایسا وقت ہے جو ختم عمر کی خبر لاتا ہے اور عمر کو واقعی حالت میں دکھاتا ہے کہ ساری عمر ایک لمحہ سے زیادہ نہیں معلوم ہوتی اس واسطے آیت میں بڑھاپے کا ذکر فرمایا کہ آج تم دنیا کی طرف تمنائے عود[۱] کرتے ہو حالانکہ تمہیں موت سے پہلے یاد دہانی بھی کرادی گئی تھی اور بڑھاپے میں عمر کی اصلی حالت بھی دکھلا دی گئی تھی مگر تمہیں عقل نہ آئی اور اخیر عمر میں اعمال صالحہ نہ کئے اب اس تمنا سے کیا ہوتا ہے؟

اور اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بڈھوں ہی سے یہ خطاب ہے کیونکہ یہاں دو جملے مذکور ہیں ایک اولم نعمر کم ما یتذکر فیہ من تذکر اور دوسرا جاء کم النذیر اور دونوں میں عطف من قبیل عطف الخاص علی العام[۲] ہے معنی یہ ہوئے کہ ہم نے تم کو اتنی عمر دی تھی جس میں تذکر[۳] ممکن تھا اور اتنی عمر ملنا جوانوں کو بھی عام ہے پھر اس میں بعض پر تو بڑھاپا بھی آ گیا پس مدار فائدہ نعمر کم مایتذکر ہے نہ کہ جاء کم النذیر اس سے اس خیال کا رد ہو گیا کہ آیت کے مخاطب بوڑھے ہی ہیں جوان نہیں ہیں خوب سمجھ لینا چاہئے کہ ہر وہ شخص اس کا مخاطب ہے جس کو اتنی عمر دی گئی ہو جو تذکر کیلئے کافی ہو اور اس عمر کا بیان بھی اسی ما یتذکر فیہ من تذکر کے ساتھ ساتھ ہو گیا کہ وہ تذکر کی کتنی عمر ہے سو یہ دیکھ لیا جائے کہ کس عمر کے لوگوں کو شرع نے مؤمن ومتذکر[۴] ہونے کا مکلّف بنایا ہے سو بچے کا ایمان تو معتبر نہیں اس کے یہ معنی نہیں کہ بچہ مؤمن ہو تو اس کو مؤمن نہیں کہیں گے بلکہ یہ معنی ہیں کہ ابھی وہ غیر مکلّف ہے پس شرعاً بلوغ سے انسان احکام شرعیہ کا مخاطب ہوتا ہے تو معنی یہ ہوئے کہ ہم نے تم کو بلوغ کی عمر دی تھی جس میں سمجھنے والے بات کو سمجھ سکتے تھے پھر تم کیوں نہیں سمجھے تم نے غفلت کیوں

۱: لوٹنے۔ ۲: یعنی آیت کا یہ دوسرا حصہ پہلے حصہ میں داخل تھا مگر اسے خاص طور سے علیحدہ بھی ذکر کر دیا گیا۔ ۳: نصیحت حاصل کرنا۔ ۴: نصیحت حاصل کرنے والا۔

کی معلوم ہوا کہ سن بلوغ کو پہنچنا اولم نعمرکم کے خطاب کو کافی ہے اور یہی اصل محط فائدہ[۱] ہے ہاں خاص کر بوڑھوں کی حالت زیادہ افسوس کے قابل ضرور ہے کیونکہ وہ اولم نعمرکم کے خطاب کے ساتھ جاءکم النذیر کے خطاب کے بھی مخاطب ہوگئے اس لئے ان کی حالت خاصہ کو اس حالت عامہ کے بعد بیان فرمایا یہ ایسا ہے کہ ایک چور تو وہ ہو کہ ضرورت وافلاس کی وجہ سے چوری کرے اور ایک مالدار ہے جو بے ضرورت محض شرارت وخباثت نفس سے چوری کرے تو کوئی اس سے کہے بھلے آدمی برے کام کا انجام نہ سوچا اور کچھ نہوت[۲] بھی تو نہیں جو خواہ مخواہ اپنے پیر میں آپ کلہاڑی ماری۔ اس جملہ کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ جس کو نہوت[۳] ہو اس کو چوری کرنے میں کچھ الزام نہیں بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ چوری تو ہر حال میں موجب الزام ہے خواہ ہوت ہو یا نہ ہوت[۴] مگر ہوت[۵] کی صورت میں زیادہ الزام ہے اس سے خوب اچھی طرح سمجھ میں آگیا ہوگا کہ اولم نعمرکم کیساتھ جاءکم النذیر کو کیا تعلق ہے۔

مؤاخذہ تو صرف بلوغ تک پہنچنے سے بھی ہوسکتا ہے کیونکہ سمجھ آنے کیلئے بلوغ کا زمانہ بھی کافی ہے لیکن اگر بڑھاپے کی عمر کو بھی پہنچ جاوے تو مزید الزام کا مستوجب[۶] ہے۔ پس جوان بھی بحالت عدم تذکر اس خطاب سے بچ نہیں سکتے۔

اب اس مضمون کو ایک دوسرے عنوان سے سمجھئے وہ یہ کہ جوانی اور بڑھاپے میں فرق کرنے کی کیا وجہ؟ جبکہ ہر جزوِ عمر میں یہ احتمال ہے کہ اخیر ہو اگر ہوسکتا ہے تو صرف اتنا فرق کہ اور عمروں میں جیسے یہ احتمال ہے کہ یہ اخیر ہو ایسے ہی یہ بھی احتمال ہے کہ اخیر نہ ہو بلکہ اس حصہ کے ختم ہونے کے بعد دوسرا یا تیسرا حصہ بھی مل جائے اور بڑھاپے میں وہ دوسرا احتمال بھی نہیں کہ شاید یہ اخیر نہ ہو یہ توقع نہیں کیونکہ وہ یقیناً اخیر ہے۔ بس یہ فرق ہوسکتا ہے اور یہ فرق کسی درجہ میں ہے ضرور لیکن یہ فرق قابل اعتبار نہیں کیونکہ جب یہ احتمال تسلیم کرلیا گیا کہ شاید یہ اخیر ہو اور یہ احتمال مضرت[۷] کا احتمال ہے۔

نقصان دہ چیز میں احتمال بھی کافی ہے جیسے چوری سے پہلے دروازہ بند کرنا

اور عقلی قاعدہ ہے کہ مضرات میں بچنے کیلئے احتمال بھی کافی ہوتا ہے تمام دنیا کے کام اسی

---

[۱]:۔ فائدہ کی بنیاد۔ [۲]:۔ فقیری۔ [۳]:۔ یعنی جو فقیر ہو۔ [۴]:۔ مال ہو یا نہ ہو۔ [۵]:۔ مال ہونے۔
[۶]:۔ ثابت کرنے والا۔ [۷]:۔ نقصان۔

قاعدہ پر مبنی ہیں اپنے تمام افعال و اعمال کو دیکھ لیجئے انکی بنا اسی پر ہوگی کہ ضرر محتمل کے دفع کا انتظام پہلے کیا جاتا ہے دیکھئے بچہ جب تک ماں باپ کے پاس پرورش پاتا ہے اور خود اپنا گھر الگ نہیں کرتا ماں باپ اسی وقت سے اس کے کسب معاش کیلئے پڑھانا، لکھانا شروع کرتے ہیں حالانکہ اس وقت اس کو روپیہ کمانے کی ضرورت بھی نہیں ہے مگر اس احتمال ضرر کی وجہ سے پڑھاتے، لکھاتے ہیں کہ خود گھر کرنے کے وقت اگر اس کو ضرورت پڑی تو کام کیسے چلے گا اور یہ نقصان اور تکلیف اٹھاوے گا۔

دیکھئے ضرر محتمل کیلئے کتنا پہلے سے انتظام ہوتا ہے اور ایک بہت ہی موٹی سی نظیر کواڑ اور قفل اور پہرہ دار ہیں کہ حفاظت کیلئے ان چیزوں کا ہونا ضروری سمجھا جاتا ہے۔کواڑ اسی وقت سے لگائے جاتے ہیں جب سے کہ مکان بنتا ہے چاہئے ابھی برسوں رہنے کا بھی ارادہ نہ ہو اور پہرہ دار خزانہ پر اسی وقت سے مقرر کر دئے جاتے ہیں جس وقت سے خزانہ رکھنے کا ارادہ ہوتا ہے گو ابھی رکھا نہ ہو رکھنے سے پہلے اس کا انتظام کر لیا جاتا ہے اور بعد میں خزانہ رکھا جاتا ہے حالانکہ یقینی بات ہے کہ اس وقت ضرر یقینی نہیں، محض درجہ احتمال میں ہے کہ شاید وقت پر انتظام نہ ہو سکے مگر اس ضرر محتمل کو یقینی کی جگہ سمجھ کر حفاظت کا سامان کیا جاتا ہے کسی کو یہ نہ دیکھا سنا ہوگا کہ کواڑ مکان میں چوری ہونے کے وقت لگائے ہوں جب چور گھر میں گھس آئے تو کواڑ کیا کام دیں گے۔ بیوقوف سے بیوقوف بھی جب مکان بناتا ہے تو چاہئے برسوں رہنے کا بھی ارادہ نہ ہو تب بھی کواڑ تعمیر کے ساتھ ہی لگا دیتا ہے گویا کواڑ مکان کی تعمیر کا جزو ہے۔

دیکھ لیجئے یہ سب ضرر محتمل کے انتظام ہیں تو اگر مان بھی لیا جاوے کہ بڑھاپے اور دیگر حصۂ عمر میں یہ فرق ہے کہ بڑھاپے میں مرجانا یقینی ہے اور دیگر حصص میں محتمل تب بھی اس فرق سے دونوں کے احتمال میں تو کچھ فرق نہیں ہو سکتا ضرر محتمل ہی حکم لگا دینے اور اسکے مقتضیات پر عمل کرنے کیلئے کافی ہے ورنہ اسی شخص کی سی مثال ہوگی کہ جب چوروں کا آجانا یقینی ہو گیا تو کواڑ چڑھانے کو کھڑا ہوا اور جب خزانہ لٹنے لگے اور ڈاکو آچڑھیں، تب پہرہ دار کو ڈھونڈتا ہے تو جوانی اور بڑھاپے میں کچھ فرق نہ ہوا کہ جوانی میں فنا[1] محتمل ہے اور یہ بھی جب ہے کہ جوانی میں فنا ضعیف درجہ میں محتمل ہو اور آج کل تو فنا کے وقوع[2] میں جوان اور بوڑھا دونوں قریب برابر کے ہو رہے ہیں جیسا کہ مشاہد ہے مگر خیر ہم مان لیتے ہیں کہ جوانی اور بڑھاپے میں احتمال کی قوت اور ضعف کا کچھ فرق ہے۔ مگر خود یہ فرق غیر

---

[1]: موت۔ [2]: موت آنے میں۔

معتد بہ ہے اور اس فرق پر ہرگز کوئی حکم نہیں کیا جاسکتا تو عقلمندی کی بات یہ ہے کہ ہر جزوِ عمر کو یہی سمجھے کہ بس یہ اخیر حصہ ہے۔

شاید ہمیں نفس نفس آخریں بود [۱]

ہر شخص خواہ کسی عمر کا ہو موت کا منتظر رہے اور اسکے مقتضا پر عمل کرے۔ ہر وقت ایسی حالت میں رہنا چاہئے کہ اگر بڑھاپے سے بھی زیادہ قرب موت کی یقین دلانے والی کوئی اور دلیل موجود ہو جاوے تو جو حالت اس وقت ہو وہ حالت ہر شخص کی ہر وقت ہونی چاہئے مثلاً کسی کو بذریعہ کشف معلوم ہو جاوے کہ دو دن زندگی کے اور ہیں یا کوئی بڑا حاذق طبیب کہہ دے کہ اب زندگی نہیں ہو سکتی صرف دو چار دن کی حیات اور ہے تو اس وقت دیکھنا چاہئے کہ اس کی کیا حالت ہو حالانکہ کشف اور طبی تحقیق دونوں غلطی کے احتمال سے خالی نہیں مگر پھر بھی اس وقت اس کی یہ حالت ہوگی کہ اگر وہ شخص دنیا دار ہے تو کچھ لکھنا پڑھنا، وصیت کرنا، دینا لینا ہے فوراً شروع کر دے گا اور اگر دین دار ہے تو سب کاموں کو چھوڑ کر آخرت کی اصلاح کرے گا، حقوق ادا کرے گا، نمازوں کی قضا یا فدیہ دینا شروع کرے گا، روزے قضا کرے گا خصوصاً معاصی کو تو بالکل ہی ترک کر دے گا بلکہ معصیت کا تو بالکل خیال بھی نہیں آئے گا بس ایک گوشہ میں بیٹھ کر ذکر میں مشغول ہو جاوے گا۔

سو احتمال کا بھی اثر ایسا ہونا چاہئے خصوص جبکہ وہ احتمال کسی مصیبت عظمیٰ کا ہو جیسے آخرت کی عقوبت [۲] سو آخرت کے عذابوں اور مصیبتوں کے اعتقاد کا مقتضا [۳] یہ ہے کہ اگر اس میں ذرا بھی احتمال ہو تو اس کا انتظام بہت پورا اور بہت پہلے سے کیا جاوے کیونکہ ضرر محتمل کے افراد میں شدت و ضعف [۴] کے فرق کے اعتبار سے بھی احتیاط کے درجات میں فرق ہو جاتا ہے مثلاً کسی کام مین آدمی کو مال کے ضائع ہونے کا احتمال ہو تو اس سے اتنا ہراس [۵] نہ ہوگا جتنا کہ اس کام سے ہوگا جس میں احتمال پھانسی پانے کا ہو اور اسی ہراس کے فرق کے موافق دونوں کے انتظاموں میں فرق ہوگا تو جبکہ معلوم ہے کہ آخرت کی ادنی مصیبت بھی دنیا کی بڑی سے بڑی مصیبت سے زیادہ ہے جسکی ایک دن کی بھی سزا کا اگر حکم ہو گیا تو وہاں کا دن دنیا کے ہزار سال کے برابر ہے وان یوماً عند ربک کالف سنة مما تعدون [۶] (تحقیق تمہارے پروردگار کے نزدیک ایک دن مثل ایک ہزار سال کے ہے جسکو تم دنیا میں

---

[۱]: شاید یہی سانس آخری سانس ہو۔ [۲]: سزا، عذاب۔ [۳]: تقاضا [۴]: یعنی نقصان کا خطرہ کبھی زیادہ ہوتا ہے کبھی کم، اسی کے فرق سے آدمی احتیاط میں بھی فرق کرتا ہے۔ [۵]: ڈر۔ [۶]: سورۃ السجدۃ، ۵

شمار کرتے ہو) تو آخرت کے محتمل ضرر سے بچنے کیلئے بھی کس قدر اہتمام اور بچنے کی تدابیر کرنے کی ضرورت ہوگی کہ دنیا کے کسی یقینی ضرر کیلئے بھی نہ ہوگی۔

اس تقریر سے اچھی طرح یہ بات ذہن نشین ہوگئی ہوگی کہ جوانی اور بڑھاپے میں ایسا فرق کرنا غلطی ہے جس سے جوانی کا زمانہ غفلت ہی میں گزارا جائے لیکن افسوس ہے کہ ہم لوگوں کی حالت بالکل اس کے خلاف ہے جوانی کو تو کیا کہا جاوے بڑھاپے میں بھی کچھ فکر نہیں بلکہ حالت تو یہ بتا رہی ہے کہ بڑھاپے میں جوانی سے بھی زیادہ بے فکری ہے بوڑھوں کے آجکل وہ منصوبے ہیں کہ جوانوں کے بھی نہیں۔

نفس بڑھاپے کو بھی ممتد بتاتا ہے

عقل سے تو کوئی وجہ بڑھاپے میں بے فکری کی ثابت نہیں ہوتی یہاں ایک مہمل وجہ یہ ہے کہ بڑھاپے کو بھی تو کچھ امتداد ہوتا ہے یعنی یہ نہیں ہوتا کہ ایک بال میں سفیدی آئی اور آدمی مر گیا بلکہ برس، چھے مہینہ، سال، دو سال، چار سال زندہ رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ زمانہ ذو امتداد[1] ہے۔

صاحبو! یہ صرف نفس کا خداع[2] ہے امتداد اس کو کہنا چاہئے کہ کام پورا کر کے وقت بچ رہے یعنی کام تھوڑا ہو اور وقت بہت ہو مثلاً کسی کو ریل پر جانا ہے اور دو دن پہلے سے ارادہ ہے اور کام صرف یہ ہے کہ بستر اباندھے اور سٹیشن پر پہنچ جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ ابھی وقت بہت ہے جلدی کیا ہے اس دو دن کو ممتد زمانہ کہہ سکتے ہیں برخلاف اس کے کہ ایک شخص اپنی اولاد کو مختلف علوم کی تعلیم دلانا چاہتا ہے جن میں فرض کیجئے دس برس درکار ہیں پس ہر چند کہ دس برس کا زمانہ ظاہر میں بہت ممتد ہے لیکن ان کاموں کو دیکھ کر جو اس زمانہ کیلئے تجویز ہوئے ہیں کہا جا سکتا ہے کہ وقت تھوڑا ہے اور عقل کا فتوی تو یہی ہے باقی اگر کوئی ایسا کرے کہ دس برس کے دن یا گھنٹے اور منٹ نکالے جو تعداد میں بہت کثیر ہوں اور ان کی کثرت عدد کو دیکھ کر اطمینان کر لے کہ زمانہ بہت ہے اور کام نہ کرے تو جو کچھ اس کا ہوگا ظاہر ہے۔

صاحبو! کیا فرق ہے اس شخص کی حالت میں اور ہماری حالت میں اگر ہم کو یہ بھی معلوم ہو جائے کہ ہماری عمر کے پچاس برس باقی ہیں تب بھی اس زمانہ کو ممتد سمجھنا غلطی ہے کیونکہ جو کام اس

۱: لمبا۔ ۲: دھوکہ۔

وقت میں کرنے ہیں وہ بہت زیادہ ہیں پھر کیا وجہ کہ جو شخص تعلیم سے امتداد وقت کے بھروسہ بیٹھ رہے اس کو تو بے وقوف کہا جائے اور ہم اپنے آپ کو عقل مند کہیں یہ صرف غفلت اور خداع نفس ہے کہ وہ عمر کے ہر جزو میں یہی کہہ دیتا ہے کہ یہ جزوِ اخیر نہیں ہوش کی بات یہ تھی کہ ہم ہر جزو کو بھی جسکے آگے دوسرے جزو کا آنا عادۃً معلوم ہے اخیر ہی سمجھتے تا کہ اپنا کام تیار ہو جائے اگر کام تیار ہو گیا اور یہ جزوِ اخیر نہ نکلا تو آئندہ جو اجزاء آوینگے ان میں بے فکری رہے گی پریشانی نہ ہو گی۔

آج کا کام کل پر ٹالنے والے کو کبھی راحت نہیں

اور جو شخص آج کا کام کل پر ٹالتا ہے اس کو کبھی راحت نہیں ہو سکتی کیونکہ کل کیلئے دوسرا کام ہے اس میں آج اور کل دونوں کا کام نہیں ہو سکتا۔ اور اخیر محنت کر کے ایک دن میں دو دن کا کام بھی ہو سکتا ہے لیکن اگر اس نے کل بھی کچھ نہ کیا اور پرسوں پر ٹالا اور اسی طرح ٹالتا رہا تو بتلایئے اس سے کس طرح کام پورا ہو سکتا ہے کسی طرح بھی نہیں۔ پس جوانوں کو بھی غفلت ہرگز جائز نہیں اولم نعمرکم ما یتذکر فیہ (کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی کہ جس میں نصیحت حاصل کرنے والا نصیحت حاصل کر لیتا) میں تذکرا کے مخاطب وہ بھی ہیں۔ بیان یہ تھا کہ گو اولم نعمرکم (کیا ہم نے تم کو اتنی عمر نہ دی تھی) میں خطاب کفار کو ہے لیکن وجہ خطاب میں جو بھی کوئی شریک ہو سب اس میں شامل ہیں۔

پس سعادت کی بات تو یہ ہے کہ آدمی دوسرے کے خطاب سے بھی فائدہ اٹھاوے اور اگر خود ہی پٹ کر عقل آئی تو کیا آئی۔ دیکھئے عدالت میں مجرم کو سزا دی جاتی ہے اور اس کا اعلان کیا جاتا ہے اس اعلان کی غرض یہی ہے کہ وہ لوگ جو مجرم نہیں ہیں، متاثر ہوں۔

کفار کو خطاب مسلمانوں کی عبرت کیلئے

تو عقل کی بات یہی ہے کہ مجرم کی مخاطبت سن کر غیر مجرم اپنے کان کھول لے، نہ یہ کہ اس خیال میں رہے مجھکو تو سزا کا مخاطب نہیں بنایا کیونکہ اس صورت مین اعلان کی منفعت باطل ہو جاتی ہے۔

غرض یہ تو معلوم ہے کہ ہمارے اندر غفلت موجود ہے اور تنبہ[۲] کی ضرورت بھی سب کو مسلم[۳]

---

[۱]: نصیحت حاصل کرنا۔ [۲]: خبردار ہوشیار ہونے۔ [۳]: طے شدہ۔

ہے اور تنبہ کا طریقہ مؤثرہ تجربہ سے یہی ہے کہ ہر جزوِ عمر کو اخیر سمجھا جائے اور یہ عقلی مسئلہ ہے کہ مقدمۃ الواجب واجب [1] تو یہ خیال رکھنا من وجہ واجب ہوا اور یہ بات قرآن میں تو استدلال سے ثابت ہوئی ہے مگر حدیث میں اس کا حکم مصرح ہے، جناب رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں ''اذا قمت فی صلوتک فصل صلوۃ مؤدع'' یعنی جب نماز میں کھڑے ہو تو اس طرح نماز پڑھو جیسے دنیا کو رخصت کر رہے ہو، یعنی یہ سمجھو کہ یہ عمر کا جزو اخیر ہے۔ اس حدیث میں اگرچہ ''صلوۃ'' کا ذکر فرمایا گیا ہے لیکن علت پر نظر کر کے تمام اعمال کو عام ہے نماز کا ذکر بوجہ اس کی فضیلت کے فرمایا ورنہ ہر عمل میں اس مضمون کے پیش نظر رکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ غفلت بدوں اس کے زائل نہیں ہو سکتی اور ازالۂ غفلت کی ہر عمل میں ضرورت ہے۔

پس آدمی جو عمل بھی کرے یہ سمجھ کر کرے کہ شاید اس کے بعد اس عمل کی نوبت نہ آوے جب یہ خیال ہوگا تو دیکھئے نماز کیسی پڑھے گا۔ جس شخص کو عصر کے بعد مغرب کی امید نہ ہو تو وہ عصر کو ایسا پڑھے گا کہ رکوع اور خشوع اور جملہ ارکان کا پورا حق ادا کر دے گا یہ طبعی بات ہے کہ انسان اخیر عمل کو بہت اچھی طرح کرنا چاہتا ہے چنانچہ جب کسی شخص کی پنشن کا وقت آتا ہے تو وہ آخری زمانۂ ملازمت میں کس خوبی اور محنت سے کام کرتا ہے تاکہ حکام اخیر عمل کو دیکھ کر پنشن کے ساتھ کچھ انعام بھی دے دیں۔ اسی طرح مسلمان کو جب یہ معلوم ہو جاوے کہ بس اب میرا اخیر وقت ہے تو وہ آخری نماز کو بہت ہی عمدگی سے ادا کرتا ہے اس لئے تعدیۂ [2] حکم کے مطابق گویا حضور ﷺ یہ فرماتے ہیں کہ تم ہر عمل کو آخری ہی سمجھ کر کیا کرو۔

اس سے خوبی نکلتی ہے حضور ﷺ کی تعلیم کی کہ ہم کو ایسا گر بتلا دیا جس سے کوئی بھی عمل ناقص نہ رہے مگر افسوس ہمارا عمل اس پر بالکل نہیں حتی کہ اگر بیمار بھی ہونگے تو بجائے اس کے کہ عمر کا خاتمہ سمجھیں، ہر نماز میں یہ سمجھتے ہیں کہ دوسری نماز بھی تو آئے گی اس کو اچھا کر کے پڑھ لیں گے۔ اسی طرح عمر ختم ہو جاتی ہے اور کوئی بھی نماز درست نہیں ہوتی۔ کاش بجائے اس کے اس کا عکس ہوتا کہ تندرستی میں بھی ہر عمل کو اخیر سمجھ کر کرتے گو واقع میں وہ اخیر نہ ہوتا اس سے حرج کیا ہوتا بلکہ فائدہ تھا کہ ہر عمل کی اصلاح ہو جاتی۔

بعض غیر واقعی باتیں بضرورت مان لی جاتی ہیں جیسے اکثر قواعد صرف ونحو

---

[1]: واجب کا مقدمہ بھی واجب ہوتا ہے۔ [2]: یعنی یہی بات دوسرے اعمال میں بھی ہوگی۔

غالباً آپ سب لوگ جانتے ہیں کہ بعض باتیں فرضی اور غیر واقعی کسی ایسی مصلحت سے جس کا حاصل ہونا بلا ان فرضیات کے ممکن نہیں ہے مان لی جاتی ہیں۔ دیکھئے صرف ونحو میں کس قدر فرضیات[1] ہیں کہتے ہیں۔ ''قَالَ'' اصل میں ''قَوَلَ'' تھا اور ''زیدٌ قائم'' میں ''ھو'' پوشیدہ ہے کوئی پوچھے کہ کون سے نحو کے امام نے اس ''ھو'' کو دیکھا ہے اور انہوں نے کس طرح دیکھا اور ہم سے کیا اسے پردہ لگا کہ پوشیدہ ہوگیا، اور ''قَال'' کون سے بادشاہ کے زمانے میں ''قَوَل'' تھا علیٰ ہذا صدہا[2] قواعد صرف ونحو کے ایسے ہیں بلکہ زیادہ حصہ ان علوم کا ایسی ہی باتیں ہیں مگر ان کو اس مصلحت سے مان لیا گیا ہے کہ غیر عربی کو عربی زبان آجائے چنانچہ واقعی آجاتی ہے۔

ایسے ہی علم طب کو دیکھئے کہ غذا معدہ میں جاتی ہے اور وہاں سے جگر میں اور وہاں سے رگوں میں اور تمام اعضاء کے فعل بیان کرتے ہیں کوئی جذب کرتا ہے، کوئی دفع کرتا ہے، کوئی تقسیم کرتا ہے گو میں ان باتوں کو غلط نہ کہوں مگر کسی کی دیکھی ہوئی بھی نہیں۔ علم تشریح سے اتنا معلوم ہوسکتا ہے کہ انسان میں اتنے اعضاء ہیں، اتنی رگیں ہیں باقی یہ کہ اس کا عمل کیا ہے اور اُس کا عمل کیا، یہ باتیں ظن وتخمین سے کسی حالت میں نہیں بڑھ سکتیں لیکن ان کو بڑے بڑے عقلمند مانتے ہیں بلکہ اطباء کی رسائی فہم[3] کی داد دیتے ہیں اور کوئی فقیر بھی یہ فتویٰ نہیں لگاتا کہ یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ بولنا ناجائز ہے بلکہ مسجد میں بیٹھ کر یہ جھوٹ پڑھایا جاتا ہے وجہ کیا ہے کہ اس سے بہت سے کارآمد اور ضروری علوم حاصل ہوتے ہیں اور بہت سے مصالح معالجہ[4] اس پر مرتب ہوتے ہیں۔

پس ثابت ہوا کہ اگر کسی ضرورت سے ایک فرضی بات بھی تسلیم کر لی جائے تو مضائقہ نہیں تو اگر یہ خیال کہ ہر جزوِ عمر کو آدمی اخیر سمجھا کرے واقع کے مطابق بھی نہ ہوتب بھی اس ضرورت سے کہ موجب اصلاح اعمال ہے مان لینے کے قابل ہے چہ جائے کہ صرف فرضی بات بھی نہیں ہے کیونکہ ایسے واقعات دن رات ہوتے ہیں کہ آدمی عمر کو ممتد سمجھ کر کوئی کام شروع کرتا ہے اور عمر کے خاتمہ کا وقت آجاتا ہے اور سب کام ناتمام رہ جاتا ہے۔ حق تعالیٰ نے کسی کو یہ یقینی علم نہیں دیا کہ میری عمر کا کتنا حصہ باقی ہے جب یہ علم نہیں ہے تو احتمال ہی کا ہو، واقعیت بھی رکھتا ہے تو اس کی حقیقت غیر واقعی فرض کرنا نہیں بلکہ واقعی مستقبل کو درجہ احتمال میں حال تجویز کر لینا ہے۔

غرض حضور ﷺ کی تعلیم واقعی بات کی ہوئی نہ کہ ایک بات کو زبردستی منوالیا گیا بلکہ آپ نے

۱: فرض کی ہوئی باتیں۔ ۲: اسی طرح ۳: سمجھ بوجھ۔ ۴: علاج کی مصلحتیں۔

اس بات کو یاد دلایا جس کو ہماری عقل خود بھی مانتی ہے کیونکہ ابھی اوپر بیان ہوا ہے کہ عقلاً مضرت کا احتمال بھی لزوم احتیاط وحفاظت میں تیقن کے برابر ہے تو جب ہر جزو عمر میں اخیر ہونے کا احتمال ہے تو یہ احتمال عقلاً تیقن ا کے حکم میں ہے اب فرمایئے کیا گنجائش ہے عمر کو ممتد سمجھنے کی اور اگر ایسا کیا جائے تو اس پر غفلت کا حکم کیوں نہ لگے گا۔

نفس کو عمل پر آمادہ کرنے کا ایک حیلہ

یہاں سے صوفیاء نے ایک مراقبہ ایجاد کیا ہے اور وہ درحقیقت سنت مذکورہ سے ثابت ہے جیسے احکام اجتہادیہ میں استنباط کی نسبت مجتہدین کی طرف کی جاتی ہے مگر واقع میں وہ نصوص ہی کے مدلول ہیں اسی طرح کہا گیا ہے ''القیاس مظهر لا مثبت'' (قیاس حکم کو ظاہر کرنے والا ہے نہ کہ ثابت کرنے والا) وہ مراقبہ یہ ہے کہ صوفیاء نے نفس سے کام لینے کیلئے ایک حیلہ تجویز کیا ہے کہ نفس سے اولاً ہی یہ نہ کہو کہ دو گھنٹہ کام کرنا ہے بلکہ اول اس سے یہ کہو کہ پاؤ گھنٹہ ذکر کر لے جب پاؤ گھنٹہ ہو گیا پھر کہو کہ پاؤ گھنٹہ اور کر لے۔ اسی طرح جتنا وقت درکار ہوتا ہے اتنے وقت تک نفس کو کام میں لگاتے ہیں اور نفس پر گراں نہیں ہوتا۔

اس کی ایسی مثال ہے کہ ایک آدمی کے پاس پچاس روٹیاں رکھ دی جائیں تو وہ دو چار سے زیادہ نہ کھا سکے گا اور اگر آدھی آدھی روٹی لائی جائے تو وہ سیروں آٹا کھا جائے گا تجربہ کر لیا جائے اسی طرح ذکر میں بھی سارا وقت نفس کے سامنے ایک دم سے پیش نہ کرو بلکہ پاؤ پاؤ گھنٹہ پیش کرتے رہو اس طرح وہ گھنٹوں میں بھی نہ تھکے گا، اسی طرح سفر میں جاؤ تو نفس سے کہو کہ اس گاؤں تک ذکر کر لے۔ جب وہاں پہنچے تو پھر کہو کہ اس اگلے گاؤں تک اور کر لے اسی طرح سارا سفر ختم کر دیا ویسے تو نفس کام نہیں کرتا اگر تم یہ کہتے کہ سارے سفر میں ذکر کرنا ہوگا مگر اس حیلہ سے کام کر لیا اور کچھ بار بھی نہ ہوا سب اجزاء کو ملا کر دیکھا جائے تو گھنٹے تو بہت سے ہو گئے مگر نفس آمادہ اس واسطے ہو گیا کہ تم نے ہر جزو میں اس کو تھوڑا کام دیا اور اس جزو کو اس نے کام کا اخیر سمجھا تو اگر نماز بموجب تعلیم حدیث کے پڑھو گے تو نماز کامل بھی ہو جائے گی اور نفس پر بار بھی نہ ہوگا۔

معلوم ہوا کہ ہر جزو کو اخیر سمجھنا موجب سہولت بھی ہے یہی اصل ہے اس مراقبہ کی اور یہ ''فصل صلوة مودع''۔ ۲ ''نماز پڑھو دنیا کو رخصت کرنے والے کی طرح''، سے ثابت ہو گیا اور

ا: یعنی نقصان کا اندیشہ ہو تو احتیاط کا تقاضا یہ ہے کہ اسے یقینی سمجھ کر اس سے حفاظت کی تدابیر (جاری ہے)

اوپر میں بیان کر آیا ہوں کہ بطور استدلال کے قرآن سے بھی یہ مضمون ثابت ہے تو یہ مراقبہ قرآن وحدیث دونوں کے موافق ہوا۔

اب یہ بات اور قابل غور ہے کہ ''فصل صلوۃ مودع''. ''نماز پڑھو دنیا کو رخصت کرنے والے کی طرح''، پر عمل جب ہی ہوگا کہ باقی عمر کو طویل نہ سمجھے جیسا کہ ظاہر ہے اور میں نے یہ بیان اس وقت اس واسطے اختیار کیا ہے تا کہ کام کی ضرورت کے ساتھ کام کرنے میں سہولت کا طریقہ بھی معلوم ہو۔

یہ مضمون قرآن وحدیث میں بہت جگہ موجود ہے لیکن ہم غور نہیں کرتے پس قرآن وحدیث کو بھی غفلت کی نظر سے دیکھتے ہیں تذکرا کی نظر سے نہیں دیکھتے کیونکہ وہ محتاج استحضار ہے اور اس غفلت سے بجز عقائد کے باقی ہمارے حالات سب کے سب ہی بگڑے ہوئے ہیں عقائد تو بحمد اللہ صحیح ہیں لیکن عبادات اخلاق، معاملات، معاشرات جن میں استحضار کی حاجت ہے کوئی بھی درست نہیں ان سب کے نہ ہونے کی وجہ اکثر یہی ہے کہ ہم کو وقت کے ٹالنے کی عادت ہے جو کوئی کسی گناہ میں مبتلا ہے وہ اسکے چھوڑنے کو آئندہ پر محمول کرتا ہے۔

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم   باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم ۲؎

اور جو کسی طاعت میں قاصر ہے وہ کہتا ہے کہ ایک ہفتہ کے بعد شروع کرونگا۔ بعض جاہلوں سے نماز کیلئے کہا جاتا ہے تو کہتے ہیں کپڑے دھلنے گئے ہیں جمعہ کو آجاویں گے تب سے نماز شروع کریں گے بعض اس سے بھی بڑھ کر کہتے ہیں کہ اب کی عید سے شروع کریں گے۔ شاید ان کے پاس کوئی پروانہ آگیا ہے کہ اب کی عید تک یہ زندہ رہیں گے۔ جو شخص اللہ ورسول ﷺ کو مانتا ہو اسکے ٹالنے کے کیا معنی جب کہ اللہ ورسول ﷺ سے ان وعدوں کے ترتب کا بھی قوی اندیشہ ہے جو معاصی کے متعلق ہیں تو اب محض نفس کی بے حیائی اور شرارت ہے کہ ایک بات کو تسلیم کر کے پھر اس کے خلاف کی طرف چلتا ہے۔ بعض لوگ حج کا ارادہ رکھتے ہیں اور حج کو اپنے اوپر فرض بھی جان چکے ہیں لیکن اپنے کسی دوست سے کہتے ہیں کہ ہم تم دونوں ساتھ چلیں گے۔ میں کہتا ہوں کہ اس دوست کو

(بقیہ) اختیار کی جائے۔ ۲؎: اس طرح نماز پڑھو جیسے تم اب دنیا سے جا رہے ہو۔

(متعلقہ صفحہ ہذا) ۱؎: نصیحت حاصل کرنے۔ ۲؎: ترجمہ: ''میں ہر رات کہتا ہوں کہ کل کو یہ کام ترک کر دوں گا۔ پھر جب کل آتی ہے تو کہتا ہوں آج نہیں بلکہ کل کو کروں گا''۔

چاہئے کہ ان سے لکھوالے کہ میں اور تم اس وقت تک زندہ بھی رہیں گے ذرا ہم بھی تو دیکھیں وہ اس مضمون کو کیونکر لکھتے ہیں اور اپنی اور اس کی زندگی کا یقین کس طرح دلاتے ہیں غرض تمام غلطی کی جڑ یہ ہے کہ ہم اپنی عمر کو طویل اور ممتد سمجھتے ہیں۔ لہذا جی چاہا کہ اس کی اصلاح کردی جائے اسکی اصلاح یہی ہے کہ ہر جزء عمر کو اخیر سمجھنا چاہئے یہ اجمالی اصلاح ہے اسکی تفصیل آپ خود کر سکتے ہیں ایک دفعہ غور کر کے دیکھئے کہ اگر کسی طرح آپ کو کسی صاحب کشف یا نجومی یا طبیب کے کہنے سے ضعیف سا شائبہ بھی پڑ جائے کہ آج شام تک زندگی ختم ہے تو اس وقت میں آپ کی کیا حالت ہوگی سوائے ضروریات کے کسی چیز کی طرف بھی خیال نہ جائے گا لیکن اب جو ہم لمبے چوڑے قصے لئے بیٹھے ہیں اسکی وجہ صرف یہی ہے کہ غفلت کی عادت ڈال لی ہے ذہن کبھی اس طرف جاتا ہی نہیں کہ ایک دن عمر ختم بھی ہوگی حالانکہ ہر شخص کے نزدیک یہ مسلم ہے کہ عمر ختم ہوگی بلکہ یہ معلوم ہے کہ اس کیلئے کوئی قاعدہ بھی مقرر نہیں کہ کب ختم ہوگی اچھے خاصے ہٹے، کٹے جب کہ قوی ایسے ہیں کہ کوئی کہہ نہیں سکتا کہ یہ سو برس سے پہلے مریں گے ذراسی دیر میں مرجاتے ہیں۔ بالخصوص ہیضہ اور طاعون کے زمانہ میں یہ تماشے ہر شخص کے دیکھے ہوئے ہیں کہ اچھے اچھے شہ زور نوجوان صبح کو اچھے خاصے ملے اور شام کو دنیا سے رخصت ہو گئے کسی محقق تجربہ کار کو اب تک کوئی ایسا قاعدہ نہیں ملا جس سے عمر کا اندازہ کرسکیں باوجود ان باتوں کے مسلم ہونے کے عمر کے امتداد کا خیال غفلت کے سوا کس بات پر مبنی ہوسکتا ہے جو ایسی ظاہر باتوں کو چھپا دیتی ہے۔

امور دنیا تین طرح کے ہیں ضروی اور آسائش و آرائش

ایک شبہ لوگوں کو یہ پڑا ہے کہ اگر ہر وقت موت کا خیال رہے تو سب کاموں سے جاتا رہے بس جنگل میں پڑا موت کو سوچتا رہے اس صورت میں تمدن کا تو نام ونشان بھی نہ رہے گا کیونکہ ہر چیز قابل ترک نظر آئے گی اس کا حل یہ ہے کہ شریعت نے صرف موت کے تذکر کی تعلیم دے کر نہیں چھوڑا بلکہ امور کی تفصیل کما حقہ بیان کردی ہے جن سے بچنے کی ضرورت ہے اور اس بچنے کیلئے تذکر موت کو ذریعہ تجویز کیا ہے۔

سو سمجھ لیجئے کہ امور دنیا کئی قسم کے ہیں۔ ایک ضروریات ایک سامانِ آسائش[1] اور آرائش[2] اور ایک فضولیات۔ سو ضروریات کا بہم پہنچانا تو آدمی کیلئے واجب اور ضروری ہے صرف یہی نہیں کہ

---

[1]: آرام وراحت۔ [2]: دکھاوا، زینت۔

شریعت ان کی اجازت دیتی ہے بلکہ ان کا امر کرتی ہے اور واجب قرار دیتی ہے مثلاً کوئی شخص بیوی، بچے رکھتا ہے تو اس کو اجازت نہیں دیتی کہ ان کی خدمت چھوڑ کر جنگل میں جا کر بیٹھ جائے اور اگر کوئی ایسا کرے تو اسے معذور بھی قرار نہیں دیتی بلکہ گناہ گار کہتی ہے اور سامانِ آسائش و آرائش کا حکم یہ ہے کہ ان کو جائز کہتی ہے لیکن ان میں انہماک یعنی زیادت اشتغال کو پسند نہیں کرتی اس وجہ سے کہ نفس ہر شخص کے ساتھ لگا ہوا ہے وہ انہماک کی صورت میں انہی تک بس نہیں کرے گا بلکہ اس حد تک پہنچائیگا جو ممنوع ہے یعنی فضولیات اور ممنوعات تو انہماک مذکور سے نهی لغیرہ[۱] ہوئی اور فی نفسہ رخصت ہے۔ ذرا غور سے کام لیجئے تو معلوم ہوگا کہ شریعت میں کما حقہ سہولت ہے جبکہ ضرویات اور آسائش اور آرائش سب کی اجازت ہے تو بجز فضولیات کے اور کون سی چیز باقی ہے جسکے اعتبار سے شریعت میں تنگی کہی جائے فضولیات سے روکنا کسی عاقل کے نزدیک بھی تنگی نہیں ہوسکتی۔

شریعت بہت وسیع قانون ہے

میں تو کہتا ہوں ایسا وسیع کوئی قانون نہیں جیسی شریعت ہے ممنوعات صرف وہ امور رہ گئے ہیں جو آدمی کو ہلاک کرنے والے ہیں تو کیا مہلکات سے منع کرنا بھی تنگی ہے۔ شریعت نے سب باتوں کی ایسی تفصیل بتلا دی ہے کہ آپ کو کچھ زیادہ سوچنا ہی نہیں پڑتا۔ آنکھ بند کر کے ایک راستہ پر چلے جایئے کہیں بھی دھوکہ نہیں ہے اسی پر تو شکایت ہے کہ باوجود اتنی وسعت کے بھی حدود سے تجاوز کیا جا رہا ہے ہم لوگ اتنا بھی نہیں کرتے کہ کسی کام کے کرنے سے پہلے اتنا سوچ لیا کریں کہ یہ ضرورت میں داخل ہے یا آسائش و آرائش میں یا ممنوعات[۲] میں۔ اگر اتنا بھی کریں کہ ممنوعات کو چھوڑ دیا کریں تو کوئی شکایت کا موقع نہ رہے لیکن صبح سے شام تک صرف دو چار دن ہی کا محاسبہ کر کے دیکھئے تو معلوم ہو جائے گا کہ کوئی دن ممنوعات سے خالی نہیں رہتا۔

آخر سوچئے تو کہ یہ ممنوعات کیوں صادر ہوئے ہر فعل کا ایک منشاء ہوتا ہے اس کا منشأ سوا اس بات کے اور کیا ہے جسپر دیر سے تقریر ہو رہی ہے کہ ہم کو موت کا خیال نہیں اور ذہن میں یہ بات اچھی طرح سے بیٹھی ہوئی ہے کہ ابھی عمر بہت ہے غرض قانون شرعی تو خاطر خواہ وسیع ہے، یہ الزام اس پر نہیں آتا کہ اگر موت کو یاد کر کے شریعت کو دستور العمل بنالیں تو دنیاوی زندگی بھی نہ ہو سکے گی شریعت تو اکثر چیزوں سے روکے گی، میں دعوے سے کہتا ہوں کہ شریعت پر چلنے سے کوئی

---

[۱]: کسی دوسری خرابی کی وجہ سے ممنوع [۲]: وہ چیزیں جن سے شریعت نے روکا ہے۔

ضروری اور مفید کام بند نہیں ہوسکتا۔ اسی لئے یہی گمان غلط ہے کہ سب چیزیں چھوٹ جائیں گی البتہ جن چیزوں کے چھوڑنے کیلئے تذکر موت کو ذریعہ بنایا ہے یعنی فضولیات وممنوعات جسکی بنا غفلت ہے زوال غفلت سے ایسی چیزیں بے شک چھوٹ جائیں گی سو اس سے دنیا تو نہ چھوٹے گی اور اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ موت کی یاد اگر غالب آ گئی تو اس کے غلبہ سے ضروریات بھی چھوٹ جائیں گی۔

اسکا جواب یہ ہے کہ اس غلبہ سے طاعات کا زیادہ اہتمام ہوگا اور ضروری دنیا کا کسب طاعت ہے تو اس کا تو زیادہ اہتمام ہوگا نہ کہ وہ متروک ہو جائے گی البتہ دلچسپی بیشک نہ رہے گی۔ سو دلچسپی خود مطلوب نہیں نہ ضروری دنیا کا موقوف علیہا[۱] ہے بہرحال موت کی یاد سے ضروری تمدن نہیں مٹ سکتا نہ ضروری تمدن سے روکا جاسکتا ہے مگر یہ سو برس کے منصوبے کیسے تراشے جاتے ہیں بس اس کو روکا جاتا ہے ذرا اپنے حالات میں غور کر کے دیکھئے کہ سینکڑوں برس کی تیاریاں کی جاتی ہیں اور اس بے تمیزی کے ساتھ کہ اس میں حلال وحرام کچھ بھی نہیں دیکھا جاتا باقی ضروی تمدن سو میں نے اوپر بیان کر دیا کہ ضروریات کیلئے سامان مہیا کرنا مضائقہ نہیں بلکہ آرام وآسائش تک بھی مضائقہ نہیں لیکن کوئی حد تو ہونی چاہئے کوئی کام ایسا نہیں ہوسکتا جس کیلئے کوئی حد نہ ہو۔ دیکھئے کھانا کھانا کتنا ضروری ہے کہ موقوف علیہ حیات کا ہے اسکی بھی حد مقرر ہے اگر کوئی چاہے کہ مطلق العنان[۲] ہو کر کھائے اور جو کوئی اسے ٹوکے تو جواب میں یہ کہے کہ تم کھانے جیسی چیز سے منع کرتے ہو تو بتلائیے آپ اس کا کیا جواب دیں گے یہی نا کہ ہم ضرورت کو منع نہیں کرتے بلکہ حد سے آگے بڑھنے کو منع کرتے ہیں جس کا نتیجہ ہے کہ تم مبتلائے ہیضہ ہو کر مر جاؤ گے۔ میں کہتا ہوں کہ شریعت کو بھی ہم سے اسی بات کی شکایت ہے کہ ہم لوگ دنیا کے سامان میں قدر ضرورت اور قدر راحت پر اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ہم کو دنیا کا ہیضہ ہو گیا ہے جس سے ہلاکت کا اندیشہ ہے ہم لوگوں نے اپنے منصوبوں کیلئے ایسی آزادی کیوں اختیار کر لی کہ اس کیلئے کوئی معیار اور طریقہ ہی نہیں رہا کوئی اندازہ تو ہونا چاہئے۔

دیکھئے میں اس شکایت کیلئے ایک نظیر دیتا ہوں جس سے بہت افسوس ہوگا بیمہ کمپنی جس کی بنا ہی طول امل[۳] پر ہے اور جس کو ہم لوگ جوا کہتے ہیں آپ خود دیکھ لیجئے کہ جب کوئی بیمہ کراتا ہے تو کمپنی والے کیسی کیسی شرطیں کراتے ہیں، قوی کو دیکھتے ہیں، ڈاکٹروں کو دکھلاتے ہیں بہت سے اصول ہیں جن کی پابندی کے بعد بیمہ کرتے ہیں۔ دوسرے لفظ میں اس کا ترجمہ یہ ہے کہ بہت سی شرطوں اور

۱:۔اس پر موقوف ہیں۔ ۲:۔اندھا دھند۔ ۳:۔لمبی امید

قاعدوں کے ساتھ امتدادعمر کو تسلیم کرتے ہیں تو جس جماعت کے تمام افعال کی بنیاد امتدادِ عمر پر ہو انکے واسطے تو کچھ قواعد ہوں اور اور تعجب کی بات ہے کہ وہ مسلمان جو امتدادِ عمر کے قائل بھی نہیں اور اس کو خیال باطل سمجھتے ہیں ان کیلئے کوئی بھی قاعدہ نہ ہو ان کے افعال ایسے ممتد ہوں کہ قائلینِ امتداد کے افعال بھی ان کے برابر نہ ہوسکیں۔ حیرت کی بات ہے۔

میں کہتا ہوں کہ اگر آپ ہر وقت کو وقتِ آخر بھی نہ سمجھیں تب بھی کسی قاعدے پر تو آپ کو چلنا چاہئے۔ طبیب یا ڈاکٹر سے اپنی عمر کا اندازہ کرایئے یا قوی سے اندازہ کرکے کام کیجئے پھر دنیا کو اتنا ہی پھیلا دیجئے کہ طبیب یا ڈاکٹر کے بتائے ہوئے وقت تک کیلئے کافی ہو اور دین کی بھی ذمہ داریاں اس میں پوری کیجئے۔ شکایت تو اس بات کی ہے کہ اس طرف مطلق خیال نہیں کسی نے اتنا ہی کرکے دکھایا ہو تب بھی ہم معذور سمجھتے بیمہ کمپنی والے کو تو ایک طریقہ اور انداز کی ضرورت ہو اور دیندار کو ضرورت نہ ہو۔

تعجب کی بات ہے غفلت اسی کو کہتے ہیں کہ ایک بات مسلم ہے مگر اس کے مقتضاء پر عمل نہیں جیسے کسی کو خبر مل جائے کہ صبح کو میرے ہاں ڈاکہ پڑے گا اور مخبر اعتماد کے قابل بھی ہو جس سے یقین ہو جائے کہ ضرور ایسا ہوگا لیکن اس خبر کے مقتضاء پر عمل نہ ہو کوئی طریقہ اس کے انسداد کا نہ کیا جائے اور پیر پھلائے سوتے رہیں تو اس کو کیا کہتے ہیں اسکا نام ہی غفلت ہے۔ بیمہ کمپنی کو ہم جواریوں کا مجمع کہتے ہیں لیکن ان میں قواعد کا انضباط اور اپنے تمام افعال کی دیکھ بھال اور تحدید کرنا، کوئی کام بے سوچے سمجھے نہ کرنا، جو قواعد مقرر کرلینا اس کا ذمہ دار رہنا بلفظِ دیگر عہدہ کو پورا کرنا، یہ لاکھ روپے کی بات ہے اور جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں ان میں کسی بات کی بھی پابندی نہیں نہ ان کے قول کا اعتبار نہ فعل کا کیونکہ جو بات تمام عیبوں کی اصل ہے وہ ان میں موجود ہے یعنی آزادی اور غفلت اور اس جواری میں ایک عیب ضرور ہے مگر تمام ہنروں کی اصل بھی موجود ہے یعنی پابندی اور اپنے افعال کی نگہداشت ان ثقہ لوگوں میں غفلت ہے اور اس جواری میں تیقظ[۱] یہ دونوں کیسے برابر ہوسکتے ہیں افسوس کہ ہم ایک جواری کے برابر بھی نہیں اس بیداری کی صفت میں وہ ہم سے اچھا ہے۔ اسی مضمون میں عرفی کا شعر ہے۔

بقمارخانہ رفتم ہمہ پاکباز دیدم ‌ ‌ ‌ چوں بصومعہ رسیدم ہمہ یافتم ریائی[۲]

---

[۱]۔ بیداری۔ [۲]۔ یعنی جب میں شرابخانہ میں گیا تو سب کو پاکباز یعنی شرابخانوں کے اصول کا پابند پایا جب عبادت خانہ میں پہنچا تو سب میں ریاء یعنی اصول کا غیر پابند پایا۔

یہ شعر تھا تو اور مقام کا مگر یہاں خوب کھپ گیا یعنی ایک خاص صفت پاکبازی کی یعنی وفائے عہد قمار خانہ والوں میں ایسی پائی جو صومعہ والوں میں نہیں تھی اب اس شعر پر کوئی اشکال نہیں رہا کیونکہ وہ ہر جہت سے ان کو پاکباز نہیں کہتے بلکہ صرف ایک صفت کے لحاظ سے پاکباز کہہ دیا اور اس سے حدیث من ترک الصلوۃ متعمداً فقد کفر (جس شخص نے نماز کو قصداً ترک کر دیا وہ کافر ہوگیا) پر سے بھی اشکال رفع ہوگیا معنی یہ ہوئے کہ تارک صلوۃ میں ایک فعل کفار کا موجود ہے یعنی ترک صلوۃ کیونکہ یہ کام کفار ہی کا ہے اسی وجہ سے اس پر کفر کا اطلاق فرمایا اس سے تارکِ صلوۃ کا کافر ہونا لازم نہیں آیا جیسے جواریوں میں ایک صفت پاکباز ہونے سے ان کا پاکباز ہونا لازم نہیں آتا۔

اس میں شک نہیں کہ ہم لوگ باوجود دین دار کہلانے کے غفلت میں مبتلاء ہیں جوام الامراض[۱] ہے نماز روزہ سب کرتے ہیں مگر یہ غفلت ضرور ساتھ رہتی ہے نماز میں ہیں مگر اس کا تصور کبھی نہیں آتا کہ ایک دن تو مر جائیں گے لاؤ نماز کو ٹھیک طور سے پڑھ لیں ایمان سے کہیے اور دلوں کو ٹٹول کر دیکھ لیجئے کہ کبھی بھی یہ خیال آتا ہے آخر جب ایک بات یقینی ہے تو تمام عمر میں کبھی تو اس کا واہمہ[۲] گزرنا چاہئے بچپن میں تو اتنا بھی تھا کہ جنازہ کو دیکھ کر ڈرتے تھے اب جنازہ کو دیکھ کر بھی خوف نہیں ہوتا۔

جنازہ سامنے اور خوف نہیں

ہماری حالت بتاتی ہے کہ ہمارے دل میں یہ خیال اچھی طرح مرکوز[۳] ہے کہ یہ چارپائی اور گڑھا اور یہ کفن اس مرنے والے کیلئے تھا ہم اس سے مستثنیٰ[۴] ہیں۔ جنازہ سامنے ہے اور دنیا کے بکھیڑے زبان پر ہیں۔ جو اس سے قرابت رکھتے ہیں ان کو تو سب سے بڑی فکر یہ ہے کہ میراث لے لیں۔ گو معلوم ہے کہ میراث فرائض کے موافق بٹے گی مگر دل نہیں مانتا اور یہ فکر ہے کہ جتنا ہاتھ لگے دبا لو اس کی حق تعالی نے بھی شکایت فرمائی ہے ''وتأ کلون التراث اکلاً لما وتحبون المال حباً جماً'' [۵] (میراث کا مال سارا سمیٹ کر کھا جاتے ہو اور مال سے بہت ہی محبت رکھتے ہو) اور جن کو کوئی قرابت نہیں ان کو اگر کچھ اور شغل نہ ہو تو چھری ہی کے مقدمے لے بیٹھتے ہیں جنکو مقدمہ سے بھی مس نہیں وہ تیری میری شکایت غیبت ہی شروع کر دیتے ہیں کوئی پوچھے کہ ایک بڑا سنگین مقدمہ تو سامنے موجود ہے اسکو دیکھ کر کچھ اپنی حالت تو سنبھالی ہوتی۔ دیکھئے جب کسی کو پھانسی ہوتی ہے تو

۱:۔تمام بیماریوں کی جڑ۔ ۲:۔وہم، خیال۔ ۳:۔جما ہوا ہے۔ ۴:۔علیحدہ۔ ۵:۔سورۃ الفجر، ۱۹، ۲۰

دیکھنے والے کانپنے لگتے ہیں حالانکہ یہ یقینی بات ہے کہ ان پر کوئی آفت آنے والی نہیں۔

جنازہ سے دنیا کی اور آخرت کی عبرت پکڑنی چاہیئے

اسی طرح جب مردہ سامنے رکھا جاتا ہے تو کیا باعتبار دنیا کے اور کیا باعتبار آخرت کے سب طرح اس سے عبرت پکڑنی چاہیئے دنیا کے اعتبار سے تو اس طرح کہ یہ ایک ہمارا ہم جنس ہی ہے دنیا میں اس کے یہ تعلقات تھے بیوی رکھتا تھا، بچے رکھتا تھا دوست احباب سے محبت کا تعلق تھا۔ بہت سے لمبے چوڑے کام اس نے شروع کر رکھے تھے مگر ایک موت نے سب کاموں اور سب تعلقات کا اور ہزار آرزوؤں کا خون کر دیا جس عورت کو اس نے بیوہ چھوڑا اور جن بچوں کو یتیم چھوڑا اور جن احباب کا عیش منغص[1] کیا۔ کیا وہ سب اسے یاد کریں گے؟ اور دھاڑیں مار مار کر روئیں گے؟ مگر اسکو جواب دینے کی اور ایک نظر دیکھ لینے کی بھی اجازت نہیں رہی تو ایسی چیزوں پر کیا نظر ڈالنا جو اس طرح سے چھوڑا دی جائیں گی۔

جنازے سے دینی عبرت

یہ وہ خیال ہے کہ بعض ایسے لوگوں نے جن کو دین سے مس بھی نہ تھا اس خیال سے دنیا کو چھوڑ دیا اور جنگل اور پہاڑ اختیار کر لئے اور آخرت کے اعتبار سے اس طرح کہ ایک ہمارا ہم جنس ہے جسکے عمل آج ختم ہو گئے حق تعالیٰ نے اس کو پیدا کیا تھا اور اتنی عمر دی تھی جن اوامر ونواہی سے اسکو مخاطب کیا تھا معلوم نہیں کتنوں کی تکمیل کی اور کتنوں سے قاصر رہا ظاہر یہ ہے کہ بہت سے کاموں میں قاصر رہا اب نہ معلوم حق تعالیٰ کا معاملہ اس کے ساتھ کیا ہوگا یہ مسلّم بات ہے کہ شان رحمت غالب ہے لیکن اگر محاسبہ کے وقت جواب طلب فرمادیں تو یہ کیا کہے گا۔ یہی بات ہم کو بھی پیش آنی ہے بلکہ اتنا اور اندیشہ ہے کہ یہ تو اپنی بری بھلی عمر کاٹ کر ظاہراً ایمان کے ساتھ رخصت ہولیا ہم کو یہی معلوم نہیں کہ کیا کیا باتیں پیش آئیں اور خاتمہ کے وقت کیا حالت ہو۔

صاحبو! یہ خیال ایسا ہے کہ اگر مؤمن کے دل میں جھوٹ موٹ کو بھی گزر جائے تو سلگ اٹھے۔ دیکھئے حضرت عثمانؓ صحابی ہیں اور جلیل القدر صحابی ہیں اور عشرہ مبشرہ میں سے ہیں اور حضور ﷺ سے دامادی کا دوہرا تعلق ہے اسی وجہ سے ذوالنورین مشہور ہیں جب آپ کسی قبر پر تشریف لے

---

[1] ۔ گدلا، خراب۔

جاتے تو اس قدر روتے کہ ریش مبارک تر ہو جاتی۔ جب یہ قصہ حدیث میں آتا ہے تو طالب علم پوچھا کرتے ہیں کہ اس قدر رونے کی اور خوف کی کیا وجہ تھی بلکہ بعض بیہودہ اور فلسفی مزاج رکھنے والے طالبعلم تو یہاں تک کہہ بیٹھتے ہیں کہ اس سے تو نعوذ باللہ حضرت عثمانؓ کے ایمان اور تصدیق میں شبہ ہوتا ہے کیونکہ جب حضور ﷺ کی زبان مبارک سے اپنے ناجی ا؎ اور جنتی ہونے کی بشارت سن چکے ہیں پھر اس قدر رونا کیوں سوائے اس کے کہ اس خبر میں کچھ احتمال ہے۔

ایسے احمقوں کا جواب زبان سے نہیں دینا چاہئے بلکہ ان کو پھانسی گھر میں کھڑا کر دینا چاہئے اور بقسم پوچھنا چاہئے کہ پھانسی والے کو دیکھ کر تمہارا قلب اپنی حالت پر ہے یا نہیں بس اس وقت ان کو اس شبہ کا جواب کافی مل جائے گا کہ باوجود اپنے اوپر یہ خطرہ نہ ہونے کے دل کانپتا ہے کیونکہ وہ صورت اور موقع ہی ایسا ہے تو اگر حضرت عثمانؓ کا دل باوجود نجات کا یقین ہونے کے قبر کے اہوال دیکھ کر کانپتا ہو تو کیا تعجب ہے ان کے غایت خوف ۲؎ اور تصدیق بالاخبار الواردة ۳؎ کی دلیل ہے۔ نہ معلوم ہم لوگوں کو جنازہ دیکھ کر کیوں ہیبت نہیں ہوتی جبکہ نجات کی خبر تو کیا امید ہونا بھی مشکل ہے۔

بات یہ ہے کہ معاصی کے اثر سے قلب بالکل بے حس ہو گیا ہے کہ ایسی حالت میں بھی کوئی نیک خیال نہیں آتا بلکہ وہی خیال جوش مارتے ہیں جنکا ہر وقت مشغلہ ہے حالانکہ ان سے کہا جا سکتا ہے کہ اپنے نفع کا خیال نہ سہی اس بیچارے میت کی ہمدردی کے واسطے سہی اتنی دیر جو خالی بیٹھے رہو گے جس میں وقت کاٹنے کیلئے تم مقدمے اور غیبتیں شروع کرتے ہو اس میں کچھ کلمہ کلام کوئی سا پارہ یا سورت یا اللہ کا نام ہی پڑھ کر اس کو بخش دو تو اس کا کچھ زادِ راہ ہو جائے جس کا وہ اس وقت حد درجہ محتاج ہے کیونکہ حدیث میں ہے "المیت کالغریق" یعنی مردہ ڈوبنے والے کی طرح ہے کہ تنکے کا سہارا دیکھتا ہے۔ زبان تمہارے قبضہ میں ہے اور اس کے قبضہ سے نکل چکی ہے اسکی قدر کوئی میت سے پوچھے وہ بیچارہ تمنا کرتا ہو گا کہ اتنی دیر کیلئے حیات مجھ کو پھر دیدی جائے کہ ایک دفعہ اللہ کہہ لوں آپ جو اتنا وقت فضولیات میں کھو رہے ہیں اسکی حسرت کوئی مردہ سے پوچھے کہ اسکی روح کیا کہتی ہو گی کہ زبان ان کے قبضہ میں ہے مگر باوجود تعلقاتِ نسب اور محبت وغیرہ کے ان کی زبان نہیں کٹتی کہ کچھ دیر اللہ اللہ کر لیں اور اس کا ثواب مجھ کو بخش دیں۔ صاحبو! یہ کیسی ہمدردی ہے یا ہمدردی ایک لفظ ہے جسکے معنی کچھ نہیں۔ دیکھ لیا آپ نے ہماری غفلت کی یہ حالت ہے کہ سامانِ تذکرہ ۴؎ موجود ہے اور

ا؎: نجات پانے والا۔ ۲؎: انتہائی خوف۔ ۳؎: جو حدیثیں اہوالِ قبر کے بارے میں وارد ہوئی ہیں ان کی تصدیق کرنا۔ ۴؎: نصیحت

پھر بھی تذکر نہیں ہوتا تو اسکی کیا امید ہے کہ بلا سامان موجود ہوئے یہ تصور کریں گے کہ ایک دن ہم بھی مریں گے اور بات ہمارے سب آحاد میں مشترک ہے بچوں کو تو حس ہی نہیں نو جوانوں کے دل میں یہ سمایا ہوا ہے کہ ابھی ایک درجہ عمر کا اور باقی ہے بوڑھوں کو گو یہ بات حاصل نہیں مگر غفلت ان کی بھی نو جوانوں سے کم نہیں عورتوں کا اپنے آپ کو کوسنا تمنا لقاء اللہ نہیں بلکہ بے صبری ہے۔

مردوں کی بھی یہی حالت ہے اور عورتوں کی بھی یہی حالت ہے ہاں تکلیف کے وقت موت کو یاد کرتے ہیں کہ اللہ اس تکلیف کو اٹھالے بعض پڑھے لکھوں کو اس میں شبہ ہو جاتا ہے کہ یہ تمنائے موت ہے اور تمنائے موت میں کیا حرج ہے چنانچہ بعض اہل اللہ سے منقول ہے جیسا ایک صاحب کہتے ہیں ۔

خرم آں روز کزیں منزل ویراں بروم جان بجاناں بدہم وخرم وشاداں بروم!

اور حدیث میں آیا ہے من احب لقاء اللہ احب اللہ لقائہ (جو شخص اللہ تعالیٰ سے ملنے کو محبوب رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس سے ملنے کو محبوب رکھتے ہیں) اس سے صاف ظاہر ہے کہ موت کی تمنا کوئی بری چیز نہیں بلکہ مستحسن ہے اس شبہ کا حل یہ ہے کہ یہ تمنائے موت نہیں بلکہ حقیقت اسکی مصیبت کی ناگواری ہے ضعیف طبیعتوں کی بلکہ عام طور سے انسانی طبیعت کی خاصیت ہے کہ نفع عاجل کے سامنے آجل۲ کا خیال نہیں کرتا اسی طرح ضرر عاجل کا دفعیہ جلد چاہتا ہے خواہ ضرر آجل۳ اس سے بھی زیادہ لازم آجائے۔ دیکھئے تکلیف کیوقت آدمی خود کشی کر لیتا ہے حالانکہ موت ومابعد الموت ایسی چیز ہے کہ اس تکلیف سے بدرجہا زیادہ ہے لیکن اس خیال سے کہ یہ موجودہ کلفت رفع ہو جائے اس کا ارتکاب بھی کر بیٹھتا ہے ایسے ہی یہ کہنا کہ اللہ اٹھالے اس وجہ سے نہیں کہ حق تعالیٰ کے سامنے ان کو تمنا ہے بلکہ یہ بھی جانتے ہیں کہ خدا تعالیٰ کے یہاں جا کر جوتیاں ہی پڑیں گی کیونکہ عملی حالت اچھی نہیں مگر ان جوتیوں کا خیال نہیں کرتے اور موجودہ مصیبت سے خلاص چاہتے ہیں یہ ہے حقیقت اس تمنائے موت کی جو بعض لوگ مصیبت کے وقت کیا کرتے ہیں نہ تمنائے موت ہے نہ کچھ ہے بلکہ کراہت

۱:۔ ترجمہ: جس دن دنیا سے کوچ کروں وہ دن بہت اچھا ہے جان محبوب حقیقی پر جان نثار کروں اور خوشی وخرم کروں ۔ ۲:۔ فوری فائدہ کے سامنے آنے والے فائدہ۔ ۳:۔ فوری نقصان کا فوری حل چاہتا ہے خواہ بعد میں کتنا ہی بڑا نقصان ہو جائے۔

مصیبت اور بے صبری ہے جو شرعاً مذموم ہے ورنہ میں کہتا ہوں کہ حیات ایسی پیاری اور موت ایسی ناگوار کہ اگر انکو کوئی ایسی چیز مل جاوے جس کو کوئی جھوٹ موٹ کہہ دے کہ یہ اکسیر ہے جسکے کھانے کے بعد موت نہیں آئے گی تو یہ تمنا چھوڑ کر اسکو فوراً کھالیں گے باوجودیکہ دل اندر سے اس کی تکذیب بھی کرتا ہوگا کہ موت کی بھی کوئی دوا ہوسکتی ہے لیکن احتیاطاً ہی کھالیں گے۔

زندگی سے محبت کی حالت

ہمارے یہاں ایک بڑھیا کی ایک لڑکی سے تکرار ہوئی لڑکی نے کہا اللہ کرے تو مرجائے تو بڑھیا کو بڑا ناگوار ہوا رونے لگی اور گھر والوں سے شکایت کی کہ یہ لڑکی مجھ کو کہتی ہے کہ یوں ہو جا (مرنے کا نام نہیں لیا) اے اللہ سنیو مت حالانکہ وہ اتنی بوڑھی تھی کہ کمر تک جھک گئی تھی مگر پھر بھی اسے زندگی کی تمنا اور امید اور موت سے نفرت وکراہت تھی۔ خدا تعالی نے خود فرمایا ہے یود احدهم لو یعمر الف سنة یعنی مشرکین میں سے بعض لوگوں کی یہ حالت ہے کہ وہ یہ چاہتا ہے کہ ہزار برس کی عمر ہو حق تعالی نے تو یہ حالت کفار کی نقل فرمائی ہے مگر افسوس یہ ہم لوگوں میں بھی موجود ہے۔

دیکھئے جب کسی کو دعا دیتے ہیں تو یہ کہ ہزار برس جیئے اس جملہ میں ہزار کا لفظ بھی تحدید کیلئے نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ طبعی عمر میں بھی نہ مرنا کیونکہ اس سے زیادہ بلکہ اتنی بھی کہیں عمر طبعی نہیں ہے اس واسطے ہزار کے لفظ کو اختیار کیا ہے اگر اس سے بھی زیادہ زمانہ عمر طبعی کا ہوتو اور آگے کی دعا دیتے حالت یہ ہے کہ مرنے کو جی ہی نہیں چاہتا خیر تمنائے موت تو اولیاء کا کام ہے ہم لوگ تمنا نہیں کرتے مگر کبھی سوچتے تو کہ ہمیں موت آئیگی بلکہ یہ حالت ہے کہ اگر موت کا خیال بھی آجاوے تو ڈرتے ہیں حتی کہ اگر کوئی ڈاکٹر کہہ دے کہ تم دس برس میں مرجاؤ گے اس سے پہلے نہ مرو گے تو ابھی سے ہول سوار ہو جائے یہ غفلت ہے کہ میعادِ موت[1] کا تصور بھی نہیں کرتے اب غور کر لیجئے کہ آپ کی اس حالت سے ان لوگوں کی حالت جن کو آپ جواری کہتے ہیں یعنی بیمہ کمپنی والے اچھے ہیں یا نہیں وہ ہر کام کو سوچ کر کرتے ہیں اور ان کے سارے کام موت ہی کے متعلق ہیں مگر اسکی مدت کا اندازہ کرکے معاملہ کرتے ہیں اور ہم لوگ باوجود اس بات کے جاننے کے کہ ہمارے کام بھی سارے موت تک ہیں اندازہ کرکے بھی کام نہیں کرتے بلکہ ابدالآباد[2] کا انتظام کرتے ہیں اس فضیلت کے لحاظ سے تو ان کے پیر چومنے چاہییں۔

۱:۔ موت کے وقت۔ ۲:۔ ہمیشہ ہمیشہ رہنے۔

قصہ حضرت جنیدؒ

حضرت جنید بغدادیؒ کا قصہ ہے (جو عارف ہوتا ہے اس کو بری بات میں بھی اچھی بات مل جاتی ہے) کہ انہوں نے ایک چور کو دیکھا کہ سولی پر چڑھا ہوا ہے آپ نے پوچھا کیا قصہ ہے لوگوں نے کہا یہ وہ شخص ہے جس نے ایک دفعہ چوری کی اسکا ہاتھ کاٹ دیا گیا دوبارہ کی تو پیر کاٹ دیا گیا تیسری اور چوتھی مرتبہ میں دوسرا ہاتھ اور پیر بھی کاٹ دیے گئے مگر کم بخت پھر بھی باز نہ آیا پانچویں مرتبہ بھی چوری کی بادشاہ نے تنگ آکر سولی کا حکم دے دیا آپ نے اس کے پیر چوم لئے لوگوں نے کہا حضرت ایسے فاسق کے ساتھ یہ برتاؤ؟ آپ نے فرمایا میں اس کے پیر نہیں چومتا بلکہ اس کی استقامت کے پیر چومتا ہوں کیونکہ اس نے وہ عمل کیا۔

دست از طلب ندارم تا کارِ من بر آید

ہاتھ کرم سے نہ روکوں گا جب تک میرا کام پورا نہ ہو جائے

اس نے جان دی مگر آن نہ دی کاش ہم طریق حق پر ایسے ہی مستقیم ہو جائیں دیکھئے جس کو حق تعالیٰ نے نظر دی ہے وہ برائی کے اندر سے بھی بھلائی نکال لیتا ہے ہم لوگوں کو نظر نہیں ہے اس واسطے دوسروں کے تو عیب چھانٹتے پھرتے ہیں کسی کو جواری کہتے ہیں کسی کو نشہ باز اور اگر نظر ہو تو پہلے اپنے عیب کو دیکھیں اس وقت معلوم ہو کہ ہماری حالت ان جواریوں سے بھی زیادہ گری ہوئی ہے اور ان جواریوں کو اس بات میں اپنا امام بنالیں اور پیر چوم لیں کہ ان میں غفلت نہیں۔ غرض ہم لوگ موت سے بالکل غافل ہیں کیا بچے اور کیا جوان اور کیا بوڑھے۔

بڈھوں کا یہ لفظ کہ ہم چراغ سحری ہیں صرف زبان ہی پر ہے

البتہ بوڑھے بطور محاورہ کے کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو چراغِ سحری[۱] ہیں مگر یہ لفظ ہی لفظ ہے جو زبان پر ہے اور قلب اس سے خالی ہے۔ غور کر کے دیکھئے تو بڈھوں کو جوانوں سے زیادہ دنیا کی ہوس ہے۔ اس لفظ کو سن کر جوانوں پر ایک عجیب بے فکری کا اثر ہوتا ہے کہ خیر ہم کو چراغِ سحری نہیں ہیں سحر تک روشن رہیں گے مگر ایک نوجوان بزرگ نے اس کے جواب میں خوب کہا۔ کسی بڈھے نے ان کے سامنے کہا تھا کہ ہم تو چراغ سحری ہیں۔ کہا حضرت آپ ساری رات جل تو لئے ہم تو چراغِ شام ہیں ایک جھونکے میں ختم کہ ایک رات بھی جلنے نہ پائے۔ یہ لطیفہ مجھے بہت پسند آیا بہر حال بڈھوں کا یہ کہنا صرف ایک مہذب لفظ ہے جو بلا عملی ثبوت کے کچھ کار آمد نہیں۔ وہ یہ لفظ بھی غفلت کے ساتھ کہتے

---

[۱]۔ صبح کے وقت کا چراغ۔

ہیں ورنہ اگر ان کے دل میں یہ آجائے کہ ہم چراغِ سحری ہیں تو بے چینی ہو جائے اور اس کی عملی حالت بتادے کہ یہ شخص بے چین ہے اور اپنے کو چراغ سحری سمجھ رہا ہے میرا مطلب یہ نہیں کہ کھانا، پینا، دکانداری سب چھوڑ دو ہاں یہ ضرور ہے کہ غفلت اور خوابِ خرگوش کو دماغ سے نکال دو اور بے چین رہو اس پر لوگ کہا کرتے ہیں کہ اگر دل میں اطمینان نہ ہو تو دنیا کے کام کیسے چلیں اسکا ایک بہت موٹا سا جواب ہے کہ جو لوگ اس خیال کو رکھتے ہیں اور بے چین رہتے ہیں ان کا کون سا کام بند ہے۔

موت کی فکر کسی کام سے مانع نہیں

ایک زندہ مثال بہت اچھی یاد آئی جس سے اچھی طرح واضح ہو جائے گا کہ دل بے چینی اور دل برداشتگی اور موت کی یاد کسی ضروری کام کو مانع نہیں۔ وہ زندہ مثال یہ ہے کہ طاعون اور ہیضہ کے زمانے سب لوگوں نے دیکھ لئے جس زمانے میں طاعون ہیضہ ہوتا ہے کونسا کام بند ہو جاتا ہے۔ انصاف سے کہیے کہ کونسا کام بند ہو گیا تھا کیا کھانا، پینا، پہننا، بیوی، بچے چھوٹ گئے تھے کوئی چیز بھی نہیں چھوٹی تھی ہاں یہ ضرور تھا کہ دل کسی وقت کسی چیز میں نہیں لگتا تھا دنیا کے سب کام برابر ہوتے تھے مگر دل پر ہر وقت موت سوار تھی۔ حدیث میں حضور ﷺ کا فرمان ہے **اذا أصبحت فلا تحدث نفسک بالمساء و اذا أمسیت فلا تحدث نفسک بالصباح** یعنی جب صبح ہو تو شام کے منصوبے مت لگاؤ اور جب شام ہو تو صبح کے منصوبے مت سوچو۔ یہ تعلیم اہل ظاہر کے دل میں نہیں بیٹھتی اور طرح طرح کے اشکال پیش کرتے ہیں مگر خدا بھلا کرے طاعون کا (مگر لائے نہیں جہاں ہو وہیں خوش رہے) اس نے سب اشکال رفع کر دیے طاعون سے سب میں یہ حالت پیدا ہو گئی تھی کہ صبح کو ملتے تو شام کی امید نہیں شام کو ملتے تو صبح کی امید نہیں ہر کس و ناکس کی طبیعت پر ہراس چھایا ہوا، نہ کھانے میں مزہ، نہ پینے میں مزہ، نہ لمبے چوڑے منصوبے بلکہ معاملات میں تخفیف سود لینے والوں نے قرض دینا بند کر دیا کہ خدا جانے اصل بھی وصول ہو یا نہ۔ میں اس کو زیادہ طول نہیں دیتا ایک زندہ نظیر پیش کر کے بتلاتا ہوں کہ بس زمانۂ طاعون کے برابر ہراس پیدا کرلو اس سے زیادہ کی ضرورت نہیں اس مادۂ طاعون میں سارے اشکالات کا دفیعہ عملی طور پر دیکھ لیا اب تذکرۂ موت کے مضمون پر بھی کوئی اشکال نہ رہا اپنی ذات میں تجربہ ہو گیا کہ امور متضادہ اکٹھے تھے جس تضاد کے اجتماع سے اشکال کیا جاتا تھا وہ خود اپنی آنکھوں سے مجتمع دیکھ لیا معاملات اور دنیا سے یکسوئی بھی تھی اور دنیاداری بھی تھی فرمائیے کون سا کام آپ نے چھوڑ دیا تھا بلکہ کون سا کام کم کر دیا تھا یا گاڑھا گزی

پہننا شروع کر دیا تھا یا برف پینا چھوڑ دیا تھا یا شادی بیاہ بند ہو گئے تھے یا تجارتیں روک دی گئی تھیں یا پکے مکانوں کو چھوڑ کر جھونپڑے اختیار کر لئے تھے یہ کچھ بھی نہیں ہوا تھا سب کام بدستور سابق تھے مگر ساتھ ہی اسکے بے چینی اور یاس بھی تھی عملی۔

دنیا سے قطعِ تعلقی اور تحصیلِ معاش متضاد نہیں

اور وقوعی طور پر معلوم ہو گیا تھا کہ قطع عن الدنیا (دنیا سے تعلق قطع کرنا) اور تحصیلِ معاش[1] دونوں متضاد نہیں ورنہ جمع کیسے ہوتے؟ میں یہی رائے دیتا ہوں کہ ایسی حالت پیدا کر لیجئے اور یہ نہ سمجھئے کہ اس سے دنیا کے کام بند ہو جائیں گے بلکہ اب میں ترقی کر کے کہتا ہوں کہ اس سے خود دنیا بھی زیادہ اور اچھی صورت سے حاصل ہو گی کیونکہ آفات کم آویں گی اس واسطے کہ جملہ آفات کا اصل الاصول حب دنیا اور حب مال ہے۔

اگر یہ حالت ایک بہت بڑے مجمع کے سب آحاد[2] میں پیدا ہو جائے اور کسی میں حب دنیا نہ رہے یا کم ہو جاوے تو بے کھٹکے زندگی بسر کریں چوری، ڈاکہ، بے ایمانی، حق تلفی کچھ بھی نہ رہے تو بتلایئے ان دنیا داروں کے ہر کام کو کتنی ترقی ہوئی یہ ایسا گر ہے کہ گو اہل دنیا اس کو نہ مانیں مگر عقلِ سلیم تسلیم کرتی ہے اور تسلیم کیسے نہ کرے واقعات اس کے مؤید ہیں حضرات صحابہؓ کو ہمیشہ موت پیش نظر تھی پھر تاریخ سے ان کی دنیوی ترقی کا حال معلوم کر لیجئے غرض فکر پیدا کرنیکی ضرورت ہے اور یاس وہراس طاعون کے زمانے کا سا ہونا چاہئے۔

فکرِ موت کے نتائج

اس کا اثر یہ ہو گا کہ گناہ چھوٹ جاویں گے اور قلب میں سلامتی پیدا ہو جائے گی جتنا یاس وہراس اور جتنی سلامتی ہو اتنے ہی گناہ چھوٹ جائیں گے اگر کامل ہو تو کل گناہ ورنہ بقدر اسکے۔ اندازہ کر کے دیکھئے طاعون کے زمانہ میں عوام پر بھی یہ اثر ہوتا ہے کہ کم سے کم نماز پڑھنے لگتے ہیں، اخلاق میں نرمی آجاتی ہے کوئی چار باتیں بھی کہہ لے تو خاموش ہو جاتے ہیں دوسری مثال لیجئے کسی کا بیٹا مر گیا تو اس کا کوئی کام بند نہیں ہوتا مگر ایسا مضمحل ہو جاتا ہے کہ کسی کام کو دل نہیں چاہتا گویا بالکل ڈھیلا ہو جاتا ہے کھاتا، پیتا بھی ہے، بولتا بھی ہے، ہنستا بھی ہے مگر سب تلخ پہلے کی حالت میں اور

---

[1]:۔ زندگی کی چیزیں کمانا۔ [2]:۔ افراد۔

اس حالت میں بڑا فرق ہوتا ہے کھل کر بات نہیں کرتا زیادہ بولتا نہیں بلکہ اگر کوئی زیادہ بات کرنا چاہتا ہے تو کہتا ہے ارے بھائی کیوں دق کیا چھوٹوں بڑوں سب کو بابا اور بھائی بتاتا ہے دیکھئے سب کام دنیا کے ہوتے ہیں مگر کس طرح۔ جب اور کام دنیا کے کم ہو جاتے ہیں تو گناہ بھی کم و بیش ہو جاتے ہیں اور آخرت کی فکر ہونے لگتی ہے اگر کبھی کسی اہلِ علم کی صحبت پائی ہے اور احکام شرعیہ کان میں پڑے ہوئے ہیں تو سب گناہ چھوٹ جاتے ہیں۔

دیکھئے نظیر دے کر بتلا دیا گیا کہ ترکِ دنیا اور معیشت دونوں جمع ہو سکتی ہیں۔ پس جیسے کہ دنیا کی محبت تمام گناہوں کی جڑ ہے ایسے ہی قطع التفات الی الدنیا (دنیا کی طرف التفات کرنے کو قطع کرنا) اور فکرِ آخرت تمام نیکیوں کی اصل ہے فکرموت کا یہ اثر ہے کہ آدمی گناہ چھوڑ دے گا اگر کچھ روزہ، نماز ذمہ ہے تو اس کے قضا یا عدم قدرت کی حالت میں فدیہ کی فکر ہوگی اور قرض ہے تو اس کے ادا کی فکر ہوگی اور عفو تقصیرات[۱] کی کرائے گا۔

موت کی فکر گناہوں کی تقلیل ہوگی یا ترک ہوگا اور مباحات میں تقلیل

امر مشترک یہ ہے کہ گناہوں کی تقلیل[۲] ہو جائے گی یا بالکل ترک ہو جائیں گے اور دوسرا اثر یہ ہوگا کہ مباحات میں تقلیل کرے گا مثلاً کسی کو یقین ہو جائے کہ میں دو مہینے میں مر جاؤں گا تو تفاخر اور دھوم دھام کے کام ہرگز نہ کرے گا کیونکہ یہ کام دل کی تازگی کے ہیں۔ لذیذ کھانوں کو اگرچہ چھوڑے گا نہیں مگر ان سے دلچسپی بھی نہ ہوگی صرف دفع الوقتی کرے گا صرف ضرورت پر نظر رہے گی آپ کو اتنی تقریر سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ میں بالکل ترک دنیا کو نہیں کہتا بلکہ اس میں انہماک کو منع کرتا ہوں دنیا کی عمر کو پورا کر لو اور اسمیں بھی یہ نہیں کہ تکلیف اٹھاؤ، ہاں تقلیل ضرور کرو اور دنیا سے دلچسپی نہ رکھو دیکھئے طاعون کے زمانے میں یا اس دوسری مثال میں جس کا لڑکا مر گیا ہو کون سا ضروری کام نہ رہا تھا کیا سردی گرمی کی حس باقی نہ رہی تھی یا کھانے پینے کی حاجت کا احساس نہ رہا تھا مگر یہ ضرور رہوا تھا کہ یہ پروانہ رہی تھی کہ کون سا لحاف ہو اس کی گوٹ بدصورت ہے یا کسی قدر میلا ہے یا لحاف اوڑھنا خلاف شان ہے شال باف چاہیئے کھانا کھاتے وقت یہ اہتمام نہیں رہا کہ چینی کے برتنوں میں ہو اور اقسام اقسام کے کھانے ہوں جیسے الٹا سیدھا ملے پیٹ بھر لیا خلاصہ یہ کہ نخرے نہیں رہے باقی کام سب بدستور رہے پس اسی زمانہ کی سی زندگی ہونی چاہیئے۔

۱:۔ گناہوں کی معافی ۲:۔ کمی

زیادہ سامان کرنا دھوم دھڑ کے کرنا بے فکری کی دلیل ہے

لمبے چوڑے منصوبے سوچنا اور آسایش کے زیادہ سامان کرنا دھوم دھام کے کام کرنا تفاخر اور ریا کرنا یہ سب بے فکری کے دلائل ہیں اور میں پورے اعتماد سے کہتا ہوں کہ دنیا کا کوئی کام بھی ان پر موقوف نہیں یہ سب کام یقیناً ضرورت سے زیادہ ہیں اور جب ہی ہو سکتے ہیں جب آدمی موت کو بھول جائے۔ان کو چھوڑ دینے میں کیا حرج ہے۔

خلاصہ تقریر یہ ہوا کہ ہر جزو عمر کو اخیر سمجھو نہ بایں معنی کہ کھانا، مکان، شادی بیاہ، ملنا جلنا چھوڑ دو دنیا کے سارے کام کرو مگر مغموم اور مرجھائے ہوئے دل کے ساتھ نہ کہ تازہ دل کی طرح اور یہ بھی مباحات میں ہے باقی معاصی کی تو کسی حال میں اجازت نہیں دل بستگی کے ساتھ نہ دل برداشتگی کے ساتھ اور شریعت مقدسہ نے ان سب کی پوری پوری تفصیل فرمادی ہے اچھے برے کام سب بتلا دیے ہیں سو یہ تو دیکھ لینا چاہئے کہ وہ کام گناہ تو نہیں جب گناہ نہ ہو تو اس کی اجازت ہے اور شرعی کوئی فتوی اس پر نہ لگے گا اگر ہم لوگ اتنا بھی کرلیں تو بڑی ہمت ہے اسی طرح مباح اگر مفضی الی المعصیت (گناہ کی طرف پہنچانے والا) ہو جائے اس کو بھی ترک کر دیا جائے اور افضاء کی ایک صورت انہاک فی المباح (مباح میں منہمک ہونا) بھی ہے۔

چنانچہ تجربہ ہے کہ مباحات[۱] میں بھی نفس کو زیادہ آزادی دینے سے آدمی گناہ میں ضرور پڑ جاتا ہے اس واسطے یہ خیال رکھنا چاہئے کہ جس کام کو گناہ کہا گیا ہو اس کے تو بالکل پاس نہ جائے اور جس کو شریعت میں مباح فرمایا گیا ہو اس میں بھی مخلی بالطبع نہ ہو جائے بلکہ تقلیل[۲] رکھے نہ اس وجہ سے کہ مباحات کوئی بری چیز ہیں بلکہ افضاء الی المعاصی (گناہ کی طرف پہنچانے) کے خوف سے ان میں کمی کر دے۔

ترکِ گناہ اور تقلیلِ مباح کی عادت چاہئے

الغرض مباحات میں تقلیل اور گناہوں میں ترک اس کی عادت کرلو اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے حالات کا موازنہ کرو اور صبح سے شام تک کے ایک ایک فعل میں غور کرو پھر ان میں یہ دیکھو کہ کون سا فعل گناہ ہے اور کون سا مباح اور میں توسیع کرتا ہوں کہ ان افعال میں بھی جواز قسم گناہ

---

[۱]: جائز کام۔ [۲]: کمی۔

ہوں غور کرو کہ کون سا بڑا گناہ ہے اور کون سا چھوٹا بڑے گناہ تو ایک دم ترک کر و وہ قلیل بھی ہیں اور میں یہ بھی یقین دلاتا ہوں کہ بڑا گناہ کوئی ایسا نہیں جس پر معیشت دنیا موقوف ہو یعنی ان کے چھوڑ دینے سے دنیا کا کوئی حرج ہرگز لازم نہیں آئے گا اور چھوٹے گناہ چونکہ بہت سے ہیں شاید ایک دم سے نہ چھوڑ سکو تو ان کو تھوڑے تھوڑے کر کے چھوڑ دو۔

گو یہ بات میرے منہ سے نکلنے کی نہ تھی مگر خیر حق تعالیٰ معاف فرماویں بنیتِ اصلاح زبان پر آ گئی کیونکہ جو شخص ایک دم سے سارے کام نہ چھوڑ سکے اس کی اصلاح تدریجاً[۱] ہی کی جاتی ہے اور ہم بعض ضعیف القلب لوگوں کی یہ حالت ہے کہ اگر چھوٹے بڑے سب گناہوں کو ایک دم چھوڑ دیں تو بعض دفعہ اس سے کوئی تنگی پیش آتی ہے جس کا تحمل بوجہ ضعفِ قلب کے نہیں ہوتا اور اکتا کر کہہ دیتے ہیں کہ ترکِ معاصی ہمارے بس کا نہیں جو کچھ ہو، کرتے رہو۔ لیجئے پہلے تو تھوڑے ہی گناہ تھے اب سب ہی گناہوں میں پڑ گئے تو آپ خود ہی خیال کر سکتے ہیں کہ یہ چال اچھی ہے یا وہ چال۔

گناہوں کو بتدریج چھوڑنے کی مثال

دیکھئے کپڑے پر نجاست لگ جاتی ہے اور خشک ہو جاتی ہے تو پہلے اس کو پانی سے نرم کرتے اور ملتے ہیں اس میں کچھ دیر لگتی ہے مگر نجاست چھوٹ جاتی ہے اور اگر ایک دم چھڑانا چاہیں تو ممکن ہے کہ کپڑا بھی اس کے ساتھ پھٹ جائے ممکن کا لفظ اس لئے کہا کہ ہو سکتا ہے کسی کے پاس کوئی ایسی ترکیب بھی ہو کہ ایک دم کپڑے سے نجاست چھوٹ جائے اور کپڑے پر کچھ آزار بھی نہ آئے چنانچہ ایسی صنعتیں بہت ہیں بعض کپڑوں کے دھبے ایسے ہوتے ہیں کہ کپڑوں سے کسی طرح نہیں چھوٹتے لیکن جو اسکا اتار جانتا ہے وہ اسکو کسی (تدبیر) سے چھڑا دیتا ہے علی ہذا ایسے واقعات ہوتے ہیں کہ کسی کامل کے تصرف سے یا اپنی ہمت سے کسی نے سب گناہ چھوڑ دیے ہیں تو ایسا شخص ترک میں تدریج کیوں کرے۔ باقی ضعفاء[۲] اگر تمام عمر میں بھی گناہوں کو چھوڑ دیں تو بڑی کامیابی ہے۔ ایسوں کیلئے تدریجی چال[۳] بھی بسا غنیمت ہے۔ یہ اس واسطے بیان کر دیا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں چھوٹے گناہوں میں سے بعض کو منع کرتا ہوں اور بعض کی اجازت دیتا ہوں (نعوذ باللہ) یہ نہیں بلکہ میں تو سب گناہوں کو یکساں سمجھتا ہوں مگر بعض چھوڑنے والوں میں اتنی ہمت نہیں کہ سب کو ایک دم چھوڑ دیں اس لئے ان کو بتدریج چلنے کی رائے دیتا ہوں تو یہ گناہ کی اجازت نہ ہوئی بلکہ سب گناہوں کے چھوڑنے کی

۱: درجہ بدرجہ۔ ۲: کمزور لوگ۔ ۳: درجہ بدرجہ چلنا۔

ایک تدبیر ہے اور نہایت مفید تدبیر ہے ضعیف آدمی اس چال سے چلنے میں کبھی نہ کبھی کامیابی حاصل کر ہی لیتا ہے اور ایک دم بوجھ پڑنے سے بعض اوقات ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔

وجہ یہ ہے کہ انسان پر بعض اوقات ایک حالت کا غلبہ ہوتا ہے کہ شوق میں آکر بہت سی طاعات شروع کر دیں اور کل گناہوں سے یک دم تائب ہو گیا پھر وہ شوق کی حالت رفع ہو جاتی ہے اور یہ شخص دنیا کے تعلقات میں پہلے سے پھنسا ہوتا ہے اس لئے سب گناہوں کو چھوڑنا اس وقت بہت بار معلوم ہوتا ہے اور وہ حالت اور وہ ذوق اب رہا نہیں تو جب یہ دیکھتا ہے کہ مجھ سے ترک تعلقات نہیں ہو سکتا پھر وہ دوبارہ ان تعلقات میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اب تفصیل بھی نہیں کرتا اور بلا لحاظ چھوٹے اور بڑے اور مکروہ اور حرام کے سب میں پڑ جاتا ہے اور کہتا ہے کہ ترک دنیا ہمارے بس کا کام نہیں جس طرح کام چل رہا تھا چلنے دو بلکہ بعض اوقات اس توبہ پر پچھتاتا ہے کہ اسکی بدولت یہ تنگی پیش آئی۔

گناہ چھوڑنے کا طریقہ

اور یہ حالت نہایت ہی منکر حالت ہے توبہ نہ کرنا اتنا بڑا جرم نہ تھا جتنا کہ توبہ کر کے پچھتانا جرم ہے آپ ہی بتایئے کہ ایسے شخص کیلئے سب گناہوں کو یک دم چھوڑنا اچھا ہے یا تھوڑا تھوڑا چھوڑنا اور ایسا ہم نے دیکھا ہے کہ تھوڑا تھوڑا چھوڑنے والا بالکل نیک اور صالح بن گیا تو اگر چہ یہ میرے منہ سے نکلنے کی بات نہ تھی مگر کام کی بات ضرور ہے اور خدارا اس کے سمجھنے میں غلطی نہ کیجئے گا اور اس سے کسی گناہ کی اجازت اخذ نہ کیجئے گا اور میں ایک دوسرا توسع[1] کرتا ہوں وہ یہ ہے کہ ایک گناہ تو وہ ہے جس کے ترک سے کوئی دنیوی تکلیف ہوتی ہے جیسے ایک شخص جس کی آمدنی دس روپیہ ہے اور خرچ بیس روپیہ ہے اس سے کہا جائے کہ مال حرام سے بچو تو فاقہ کی تکلیف برداشت کرنا اسکو مشکل ہے گو یہ عذر ارتکاب معصیت[2] کیلئے کافی نہیں مگر خیر میں ارخاء للعنان[3] (باگ ڈھیلی چھوڑنے کی بنا پر) اسکو عذر ہی قرار دیتا ہوں لیکن وہ گناہ جن کے ترک میں تکلیف بھی نہیں ان کے نہ چھوڑنے کا کیا سبب اور وہ کون سی بات ہے جس کو ان کیلئے ایک دن کے واسطے بھی عذر کہا جائے جیسے ڈاڑھی منڈانا، ٹخنوں سے نیچا پاجامہ پہننا، غیبت وغیرہ کرنا ان کے چھوڑنے میں کون سی تکلیف ہوتی ہے۔ بس یہ دوسری قسم کے گناہ ایک دم اور آج ہی چھوڑ دیجئے۔ میں اس کو مخاطب بناتا ہوں جس کو اپنی اصلاح کی ذرا بھی فکر

۱: گنجائش کی بات بتاتا ہوں۔ ۲: گناہ کرنے۔ ۳: دوسرے کی بات مانتے ہوئے۔

ہو افسوس آجکل اس کی بھی کافی کمی ہے اور مجھ کو بڑی شکایت اس کی بھی ہے کہ ہم لوگوں کو غور کرنے کی عادت بالکل نہیں رہی حالانکہ جو کوئی اپنی اصلاح کا طالب ہے عورت ہو یا مرد اس واسطے پہلی سیڑھی یہی ہے کہ تفکر[1] کی عادت ڈالے۔

اور اپنے تمام افعال میں غور کرے کہ کونسے اچھے ہیں اور کون سے برے پھر ان بروں کی فہرست بنائے تو یہ افعال[2] دو ہی قسم کے نکلیں گے۔ ایک وہ ہوں گے جن کے چھوڑنے میں تکلیف ہے اور دوسرے وہ جن کے چھوڑنے میں تکلیف نہیں سو اس دوسری قسم کو تو ایک دم الگ کرے کیونکہ ان کے واسطے کسی قسم کا عذر ہی نہیں اور اگر یہ بھی نہیں ہوسکتا تو پھر کوئی دوسرا تو منہ میں لقمہ دینے کیلئے آنے سے رہا۔ آخر مکلّف[3] ہونا کیا معنیٰ؟۔

غیبت اور شیخی کے چھوڑنے میں کون سی تکلیف ہے

مثلاً میں کہتا ہوں غیبت اور شیخی کے چھوڑنے میں کون سی تکلیف ہے مگر یہ بھی نہیں چھوڑا جاتا بالمخصوص یہ شیخی کا مرض عورتوں میں تو بہت ہی ہے اور یہ عجیب فرقہ ہے جہاں مصالح کے سبب ضرورت ہے شیخی کی (یعنی شیخی کی صورت کی) وہاں تو بے حس بن جاتی ہیں ایک بی بی تھیں جو خود پائنتی پر بیٹھی رہتیں اور ماما[4] سرہانے بیٹھی رہتی حالانکہ عام طور پر نوکروں کے ساتھ ایسا برتاؤ ان کے دماغ کو تباہ کر دیتا ہے۔

ہر شخص کو سرہانے نہ بٹھانا چاہیے

ایک جگہ ایک مجمع میں میری مجلس میں ایک معمولی شخص صدر مقام پر[5] بیٹھ گیا میں نے اس کو اٹھا دیا جسمیں دو مصلحتیں تھیں ایک یہ کہ دوسرے اس جگہ مستحق موجود تھے جو بمصلحت وہاں بٹھائے جانے تھے دوسرے یہ کہ جب وہ شخص اسکا عادی ہوگا تو کہیں مار کھائے گا یہ اس شخص کی آبرو بچانے کی تدبیر ہے ممکن ہے کہ میری یہ توجیہات بہانۂ نفس[6] ہوں میں تنزیۂ نفس[7] نہیں کرتا اور اپنے فعل کو خواہ مخواہ مستحسن[8] نہیں کہتا نفس کی شرارتیں ایسی پوشیدہ ہوتی ہیں کہ ہم کو تو کیا بڑے بڑے مبصرین کو بھی بعض وقت دھوکہ ہو جاتا ہے اسی واسطے اکابر ہمیشہ اس سے ڈرتے رہے ہیں حضرت یوسفؑ نے اپنی

---

[1]: سوچ بچار۔ [2]: کام۔ [3]: ذمہ دار ہونا۔ [4]: نوکرانی۔ [5]: اونچی جگہ، مرکزی جگہ۔
[6]: میری یہ باتیں نفس کا بہانہ ہوں۔ [7]: میں اپنے نفس کو پاک صاف نہیں سمجھتا۔ [8]: اچھا۔

عصمت بیان کرنے کے بعد حالانکہ بالکل واقعی تھی یہ بھی فرمایا و ما أبرئ نفسی (میں اپنے نفس کو بری اور پاک نہیں بتلاتا)۔ خیر نیت میری کچھ بھی ہو مگر ہر حال میں مصلحت اس میں ضرور ہے۔

حفظ مراتب رہنے سے انتظام میں خلل نہیں پڑتا؟

حفظ مراتب بھی ایک چیز ہے جس کے مرعی[۱] نہ رکھنے سے ضروری انتظام میں خلل پڑ جاتا ہے۔ اس لئے بدتمیزی کیا ضروری ہے کہ ماما کو سرہانے بٹھایا جائے؟ نوکر کی توہین تو نہ کرے مگر اپنے برابر کرنا بھی کچھ ضروری نہیں کوئی شاید یہ خیال کرے وہ بی بی ایسی متواضع تھیں کہ اپنے آپ کو ماما کے برابر نہیں سمجھتیں تھیں اس کا پتہ ان کے دوسرے برتاؤ سے چل سکتا ہے وہ یہ کہ جب اسی ماما کو جس کو سرہانے بٹھاتی ہیں خفا ہوتی تھیں خواہ اس کا قصور بھی نہ ہو تو جتنے اختیارات ہیں سب صرف کر ڈالتی تھیں عورتوں کے بڑے اختیارات زبان پر ہوتے ہیں۔ جب ذرا سی بات پر اسی ماما کو دیدوں پھوٹی، خاک ملی، جھاڑو ماری کہہ ڈالتی ہیں تو یہ تواضع کیسی۔

اصل یہ ہے کہ تواضع وغیرہ کچھ نہیں حقیقت اس کی بے حسی ہے کیونکہ تواضع اور شیخی[۲] ضدیں ہیں دونوں جمع نہیں ہوسکتیں دیدوں پھوٹی[۳] کہنے کے وقت تو اس کو جوتی کے برابر بھی نہیں سمجھتیں جو کہ یقیناً شیخی ہے اور باوجود اس کے اسکو سرہانے بٹھاتی ہیں جب شیخی موجود ہے تو اس کی ضد کیسے موجود ہو سکتی ہے تو ضرور اس سرہانے بٹھانے کی وجہ تواضع کے سوا کچھ اور ہے اور وہ بجز بے حسی کے اور کیا ہے کوئی کام بھی اپنے موقع پر نہیں۔ شیخی جس موقع پر کارآمد ہے یعنی حفظ مراتب میں وہاں اس کا ظہور نہیں ہوتا وہاں بے نفس بن جاتے ہیں یہ بے نفسی نہیں بلکہ بے حسی اور بدتمیزی ہے اور جس موقع پر شیخی ممنوع اور مذموم ہے وہاں استعمال کیا جاتا ہے۔

شیخی عورتوں کی طبیعت میں داخل ہے

اور یہ ذمیمہ عورتوں کی تو گویا سرشت[۴] میں داخل ہے اٹھنے میں، بیٹھنے میں، بولنے میں، چالنے میں اور زیور میں تو ایسا اس شیخی کو نباہا ہے کہ اس کی بناوٹوں کی بنا اسی پر ہے۔ زیور بلا باجہ کا نہ پہنیں گی باجہ میں فائدہ یہ ہے کہ جب کہیں جائیں تو پہلے سے مردوں عورتوں سب کو آپ کی تشریف آوری کی اطلاع ہو جائے۔ جب کہیں جائیں تو ڈولی سے اترتے ہی گھر میں اطلاع کیلئے یہ کہا جاتا

---

[۱]۔ خیال نہ رکھنے۔ [۲]۔ تواضع اور تکبر۔ [۳]۔ تیری آنکھ پھوٹے۔ [۴]۔ طبیعت۔

ہے کہ بیگم صاحبہ آئی ہیں۔ کون ان سے پوچھے کہ کون سے ملک کی بیگم ہیں یا یہ لفظ نواب بے ملک کا ترجمہ ہے۔ وہاں پہنچ کر ایسی جگہ بیٹھیں گی کہ سب کی نظر ان پر پڑے ہاتھ، کان ضرور دکھلائیں گی۔ ہاتھ کسی چیز میں گھرا ہوا بھی ہو تب بھی کسی بہانہ سے نکالیں گی۔ گلا اور کان گو ڈھکے ہوں مگر گرمی کے بہانہ یا کسی ضرورت کے بہانہ کھول کر ضرور دکھلائیں گی کہ ہمارے پاس اتنا زیور ہے اور اگر بی بی بہت ہی مہذب ہوں اور قسمت سے بہشتی زیور پڑھی ہوئی ہوں اور دکھاوے اور شیخی کی مذمت ان کو یاد ہو تو خدا سلامت رکھے باریک کپڑوں کو وہ ان کے بلا ارادہ ہی سب بناؤ سنگھار دکھلا دیتے ہیں اور اگر کسی کی نظر نہ بھی پڑی تو کھجلی اٹھا کر کان تو دکھا ہی دیں گی جس سے اندازہ کیا جائے کہ جب اتنا زیور ان کے کان میں ہے تو گھر میں روپیہ تو نہ معلوم کتنا ہوگا۔ قیاس کن زگلستان من بہار مرا[۱] چاہے گھر میں خاک نہ ہو روپیہ کے بجائے چوہے ہی قلابازیاں کھاتے ہوں۔ یہ گناہ تو ہاتھ پیر سے کیے پھر وہاں بیٹھے ہی سوائے غیبت کے اور دوسرا مشغلہ ہی نہیں۔

ان عورتوں کو شیخی کے موقع دو ملتے ہیں ایک خوشی کا ایک غمی کا۔ انہی دو موقعوں میں اجتماع ہوتا ہے۔ اسی واسطے میں بلا ضرورت شرعی ان کا اجتماع ہی مناسب نہیں سمجھتا اور اجتماع ہو بھی تو شیخی سے بچنے کیلئے ایک ترکیب میں نے مردوں کو سکھلائی ہے گو عورتیں اس سے بہت خفا ہوتی ہیں مگر وہ شیخی کا علاج ہے۔

عورتوں کی شیخی مٹانے کا ایک علاج

وہ ترکیب یہ ہے کہ عورتوں کو یہ تو مت کہو کہ جمع نہ ہوں یہ تو ہونا مشکل ہے اور اس میں وہ معذور بھی ہیں کیونکہ الجنس یمیل الی الجنس[۲] عورت کا دوسری بیبیوں سے ملنے کو کبھی تو جی چاہتا ہی ہے مگر یہ کرو کہ کہیں جاتے وقت کپڑے نہ بدلنے دیا کرو اس کیلئے مردانہ حکومت سے کام لو اور جب کہیں جائیں تو سر پر کھڑے ہو کر مجبور کرو کہ کپڑے نہ بدلنے پائیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ گھر میں تو بھنگنوں اور ماماؤں کی طرح رہیں اور ڈولی آتے ہی بن سنور کر بیگم صاحبہ بن جائیں۔ ہر چیز کی کوئی غایت اور غرض ہوتی ہے ان سے کوئی پوچھے کہ اچھے کپڑے پہننے کی غرض اور غایت کیا صرف غیروں کو دکھانا ہی ہے۔ تعجب ہے کہ جس کے واسطے یہ کپڑا بنا اور جس کے دام لگے، اس کے سامنے تو کبھی نہ پہنا جائے اور غیروں کے سامنے پہنا جائے۔ یہ باتیں ذرا شرم کی سی ہیں مگر ضرورت اصلاح

۱:۔ میرے چمن ہی سے میری بہار کو قیاس کرلو۔ ۲:۔ جنس کا میلان اپنی جنس ہی کی طرف ہوتا ہے

کیلئے کہی جاتی ہیں حیرت ہے کہ خاوند سے کبھی سیدھے منہ نہ بولیں کبھی اچھا کپڑا اس کے سامنے نہ پہنیں اور دوسروں کے گھر میں جائیں تو شیریں زباں بھی بن جائیں اور کپڑے بھی ایک سے ایک بڑھے چڑھے پہن کر جائیں کام آویں غیروں کے اور دام لگیں خاوند کے یہ کیا انصاف ہے۔

ایک حکایت

اس تصنع ۱ کی یہاں تک نوبت پہنچ گئی ہے کہ ہمارے وطن میں ایک بی بی چرخہ کات رہیں تھیں اور اس زمانہ میں ان کی ساس مرگئی تھیں تو کوئی عورت جوان کے یہاں تعزیت کیلئے آئی، آہٹ پاتے ہی چرخہ کو اٹھا اور اندھے باؤلوں کی طرح ایک کوٹھڑی میں پھینک، آگے سے کواڑ بند کر دیے تاکہ مہمان کو معلوم نہ ہو کیوں بیبیو! اول تو کیا آپس میں تمہیں اوروں کے گھر کی اور اوروں کو تمہارے گھر کی یہ خبر نہیں کہ یہ چرخہ کاتتی ہے دوسرے چرخہ کاتنا ایسا عیب کیا ہے جس کو چھپانے کی ضرورت ہو جب سے بیبیوں نے اس قسم کی محنتیں چھوڑ دیں تندرستیاں خراب ہوگئیں ہمیشہ دوا کا قدح ۲ منہ سے لگا رہتا ہے اور جن قوموں میں اب بھی ان کا رواج ہے دیکھو کیسی تندرست ہیں خدا غارت کرے اس شیخی کو دین کا گناہ تو ہے ہی دنیاوی نتائج بھی اس کے ایسے ہیں کہ صحت جیسی چیز غارت ہوگئی۔

غرض مردوں سے میں یہ کہتا ہوں کہ ان کی اس شیخی مٹانے کی یہ تدبیر کرو کہ کہیں جاتے وقت ان کو کپڑے نہ بدلنے دو اور عورتیں بھی سن لیں کہ اگر کپڑے بالکل ہی میلے ہوں تو خیر بدل لو وہ بھی سادے ورنہ ہرگز نہ بدلو سیدھے سادھے کپڑوں میں مل آیا کرو ملنے سے جو غرض ہے وہ اس صورت میں بھی حاصل ہوگی اور اخلاق کی درستی علاوہ برآں ذرا کر کے دیکھو تو اس کے فوائد معلوم ہوں گے۔

اور اگر یہ خیال ہو کہ اس میں ہماری حقارت ہوگی تو ایک جواب تو اس کا یہ ہے کہ نفس کی تو حقارت ہی ہونی چاہئے اور دوسرا جواب تسلی بخش یہ ہے کہ جب ایک بستی کی بستی میں یہ رواج ہو جائے گا کہ سیدھی سادھی طرح سے مل لیا کریں گے تو انگشت نمائی اور تحقیر ۳ بھی نہ رہے گی اور کیوں بیبیو! اگر ایک غریب عورت جو مزدور کی بی بی ہے وہ کہیں ٹھاٹھ سامان سے بھی جاتی ہے حتی کہ بیگم بھوپال ہی کیوں نہ بن جائے مگر جن بیبیوں کو اس کے گھر کی حالت معلوم ہے وہ تو یہی کہیں گی کہ نگوڑی مانگے کا کپڑا اور زیور پہن کر آئی ہے اس پر اتراتی ہے۔

۱:۔ بناوٹ، تکلف۔ ۲:۔ پیالہ۔ ۳:۔ یعنی نہ لوگ انگلیاں اٹھائیں گے اور نہ حقارت سے دیکھیں گے۔

مگر پھر بھی اس تصنع ۱ میں ایسا عورتوں کو غلو ۲ ہوا ہے کہ اس تصنع کے اہتمام میں خاوند کی اچھی سے اچھی آمدنی بھی ان کو کافی نہیں ہوتی اور سب آمدنی لیکر مرد کو بیوقوف بنانا چاہتی ہیں جو مرد ان کی مرضی کے موافق چلے اور ان سے حساب کتاب نہ لے اور آنکھ بند کر کے خرچ کرنے کو دے وہ ان کے نزدیک بہت اچھا ہے آپس میں بیٹھ کر فخر کرتی ہیں کہ میرے میاں تو ایسے ہیں کہ دے کر پوچھتے بھی نہیں کہ کہاں خرچ کیا جو مرد الّو اور احمق ہو وہ ان کے نزدیک اچھا ہے اور جو منتظم ۳ ہو اور دیکھ بھال کر خرچ کرے تو اس کو کہتی ہیں کہ ہمارے میاں بڑے جلاد ہیں، بڑے ظالم ہیں کیا مجال ہے کہ ہم کبھی پیٹ بھر کر کھا بھی لیں۔ ہم تو اس کے راج میں کھانے پینے کو بھی ترس گئے۔ غرض ان کو ریا اور سمعہ اور تفاخر ۴ میں آزاد چھوڑ دو جب تو خیر ہے ورنہ پھر منہ بھی سیدھا نہیں اور ظاہر ہے کہ یہ باتیں کس قدر معیوب ۵ ہیں جن کو دنیا کے عقلاء نے بھی عیب کہا ہے۔ کسی اخلاقی کتاب کو اٹھا کر دیکھئے یہی لکھا ہوگا کہ ان عیبوں سے بچو مگر یہ عیب ایسے مرکوز ۶ ہیں کہ کوئی بات بھی عورتوں کی ان سے خالی نہیں۔ ان کا دن رات تفاخر ۷ ہی میں گزرتا ہے خاوند پر تفاخر، جائیداد پر تفاخر، مکان پر تفاخر، نسب پر تفاخر۔

دین دار تعلیم یافتہ عورتوں میں بھی شیخی کا مرض ہے

اور یہ مرض صرف جاہل ہی عورتوں تک محدود نہیں پڑھی لکھیوں میں بھی موجود ہے حتی کہ جو اپنے کو دین دار اور عالم سمجھتی ہیں ان میں بھی موجود ہے۔ مجمعوں میں بیٹھ کر کہتی ہیں میں نے مشکوۃ شریف پڑھی ہے میں نے جلالین پڑھی ہے۔ ایک جگہ کی عورتیں بہت تعلیم یافتہ اور دین دار ہیں اور باعمل بھی ہیں لیکن مشکل یہ ہے کہ آجکل عمل بالدین کے معنی صرف نماز روزہ کے رہ گئے ہیں باقی رہے اخلاق سو ان کی طرف کسی کا یہ خیال بھی نہیں جاتا کہ ان کو بھی کچھ دین سے علاقہ ہے خیر جو معنی بھی ہوں وہاں کی عورتیں بہت دین دار ہیں۔

ان عورتوں نے مجھ سے وعظ کی فرمائش کی تو مجھ کو بہت سوچنا پڑا کہ ان کو کس چیز کی اصلاح کی ضرورت ہے جس کا میں بیان کروں بہت سوچ کر سمجھ میں آیا کہ اور ظاہری امراض ان میں نہ سہی مگر شیخی اور فضول خرچی ان میں ضرور ہے میں نے اسی کا وعظ کہا اس کو سن کر ان مستورات نے میرے پاس کہلا بھیجا کہ ہماری آج آنکھیں کھلیں اور مجھے یہ عیب اس طرح معلوم ہوا تھا کہ ہمارے یہاں وہ

۱: تکلف ۲: حد سے بہت بڑھ جانا۔ ۳: انتقام کرنے والا۔ ۴: دکھاوا، شہرت اور بڑائی بگھارنے۔
۵: عیب والی، بری۔ ۶: جم گئے ہیں۔ ۷: بڑائی جتانے میں۔

عورتیں ایک روز صبح سے شام تک کام کرتی رہیں اور یہی مشغلہ رہا ایک کہتی تھی کہ میں نے مشکوٰۃ پڑھی ہے دوسری کہتی تھی کہ میں نے شرح وقایہ پڑھا ہے۔ تیسری کہتی تھی میں نے جلالین شریف پڑھی ہے میں نے دل میں دعا کی اے اللہ! ان کے منہ سے وعظ کی فرمائش ہو چنانچہ شام ہی کو وعظ کی فرمائش ہوئی۔ بیان ہوا۔ الحمد للہ بہت نفع ہوا سب نے بہت دعائیں دیں یہ ان کے قرآن وحدیث کے پڑھنے کی برکت تھی کہ ان کو نفع محسوس ہوا اور کہنا بھی دل سوزی سے تھا اس کا بھی اثر ہوتا ہے جب پڑھی لکھی بیبیوں تک میں تفاخر اس طرح رچا ہوا ہے تو دنیا داروں میں کیوں نہ ہو اسی تفاخر سے عورتوں کو بار بار کپڑے بدلنا گھنٹوں وقت اس میں صرف کرنا زیور بہت وزنی لادنا باوجود فی نفسہ شاق[۱] ہونے کے ان کو آسان ہے۔

شادی بیاہ کی رسوم کی بناء تفاخر پر ہے

غرض ہر کام میں شیخی اور تفاخر موجود ہے عورتوں میں زیادہ اور مردوں میں بھی کافی درجہ میں ان شادی بیاہ کی رسموں کو اور تقریبات کو دیکھ لیجئے کہ ہر رسم کا مبنی تفاخر ہی پر ہے جہیز دیں گے بیٹی کو لیکن دکھائیں گے تمام برادری کو۔ ایک جگہ نیوتہ دیا گیا جس میں تین گنیاں تھیں۔ اول گنیاں دیں لیکن ساتھ ہی خیال آیا کہ ان تین گنیوں کو کون دیکھے گا اس واسطے ان کو روپیہ بنا کر سینی میں رکھ کر بھیجے گئے تاکہ اہل مجمع کی نظریں تو پڑیں۔ باجہ گاجہ اور جتنے سامان شادی بیاہ کے ہیں سب کی بناء اسی تفاخر اور نمود پر ہے اور یہ تفاخر گو مرد بھی کرتے ہیں مگر اصل جڑ اس میں عورتیں ہی ہیں یہ اس فن کی امام ہیں اور ایسی مشاق اور تجربہ کار ہیں کہ نہایت آسانی سے تعلیم دے سکتی ہیں جو آدمی جس فن کا ماہر ہوتا ہے اس کو اس فن کے کلیات خوب منکشف ہوتے ہیں یہ ایک کلیہ میں سب کچھ سکھا دیتی ہیں جب ان سے پوچھا جائے کہ شادی بیاہ میں کیا کیا کرنا ہے تو ایک ذرا سا کلیہ چٹکلہ سا بتا دیتی ہیں کہ زیادہ نہیں اپنی شان کے موافق تو کرلو یہ کلیہ نہیں بلکہ کلہیا ہے اور کلہیا بھی ایسی ہے کہ ہاتھی بھی اس میں سما جاوے یہ تو اتنا سا جملہ کہہ کر الگ ہوگئیں کرنے والے نے جب اس کی شرح پوچھی تو وہ اتنی طویل ہوئی کہ ہزاروں جزئیات اس میں سے نکل آئیں جن سے دنیا کی بھی بربادی ہو اور آخرت کا بھی کوئی گناہ نہیں بچا یہ شیطان کا ساشیرہ ہے۔

شیطان کے شیرہ کا قصہ

---

[۱]: مشقت دور ہونے کے باوجود۔

جسکا ایک قصہ ہے کہ شیطان سے کسی نے کہا کہ میاں تم بڑے فساد کراتے ہو کشت و خون کرا دیتے ہو گھر کے گھر برباد کرا دیتے ہو شیطان نے کہا کہ مجھے مفت بدنام کر رکھا ہے میں تو کچھ بھی نہیں کرتا چلو میں تمہیں نمونہ دکھلاؤں۔ حلوائی کی دکان پر پہنچے، شیطان نے ایک انگلی بھر شیرہ دیوار پر لگا دیا اس شیرہ پر مکھیاں آ بیٹھیں ان مکھیوں پر ایک چھپکلی آ گئی اتفاق سے دکان دار کی بلی آ گئی وہ چھپکلی پر دوڑی ایک خریدار سوار کے ساتھ کتا تھا وہ بلی پر جھپٹا حلوائی نے غصے میں آ کر ایک پتھر اس کتے کو مار دیا اس کتے کے مالک یعنی سوار کو جوش جو آیا اس نے حلوائی کے ایک تلوار ماری بازار والوں نے جمع ہو کر اس سوار کو قتل کر دیا فوج میں خبر ہو گئی انہوں نے بازار والوں کا قتل عام شروع کر دیا۔ شیطان نے کہا دیکھا انصاف سے کہیے میرا کیا قصور میں نے تو ایک انگلی بھر شیرہ لگا دیا تھا اور شیرہ لگانا کوئی جرم نہیں اور اس قصہ میں تو ایک انگلی بھر شیرہ تھا جس کا طول یہاں تک کھنچا اور عورتوں کے قبضہ میں تو اسکی ایک بھری ہوئی مشک ہے جب چاہا ذرا سا نکال دیا پھر اس کو مردوں نے بڑھا لیا۔ دیکھئے انہوں نے تو ایک لفظ یہ کہہ دیا تھا کہ اپنی شان کے موافق کر لو جس کو مردوں نے شرح کرا کر کے اتنا بڑھایا کہ ریاستیں کی ریاستیں غارت ہو گئیں۔ ہزاروں کبیرہ گناہ سرزد ہو گئے اور عورتوں کو ایک آسانی یہ بھی ہے کہ ان پر کوئی فتوی نہیں لگتا کیونکہ فتوی لگانے والے مولوی ہیں اور عورتیں پردہ کی وجہ سے ان کے سامنے نہیں ہاں کوئی مولون ہو تو روکے لہذا میں روکتا ہوں۔

عورتوں کو رسوم نہ کرنا آسان ہے

اور بیبیوں سے درخواست کرتا ہوں کہ ان کو چاہئے کہ مردوں کو روکیں انکا روکنا بہت زیادہ مؤثر ہے ایک تو اس وجہ سے کہ اصل بانی ان قصوں کی یہی ہیں جب یہ خود رکیں گی اور مردوں کو روکیں گی تو کوئی بھی قصہ نہ ہوگا۔ علاوہ بریں ان کا لب ولہجہ مؤثر ہے یا بلاغت عورتوں پر ختم ہے۔ فصاحت تو نہیں ہے کیونکہ فصاحت کیلئے الفاظ کی عمدگی شرط ہے اس سے آجکل مستورات بوجہ بے علمی کے بے بہرہ ہیں ہاں بلاغت بمعنی تاثیر عنوان نہ کہ اصطلاحی جو کہ فصاحت پر موقوف ہے یہ پوری پوری ہے اس لئے ان کا کلام بے حد مؤثر ہوتا ہے ان کا کہنا دل میں گھس جاتا ہے اس لئے اگر یہ چاہیں تو بہت جلد روک سکتی ہیں اور مردوں نے ان کاموں میں امام بنا بھی انہی کو رکھا ہے خود کچھ بھی نہیں کرتے تمام کام تقریبات کے عورتوں سے پوچھ کر کرتے ہیں۔ کانپور میں ایک بارات آئی تو لڑکی والے سے احباب نے پوچھا بارات کہاں ٹھہرائیں اس نے کہا کہ اس میں تمہیں کیا دخل ہے ننھی کی اماں سے پوچھ لو اتنی سی بات کیلئے بھی ننھی چنی کی اماں سے پوچھنے کی ضرورت ہے غرض مردوں

نے ایسی اپنی مہار عورتوں کے ہاتھ میں دی ہے کہ اتنی اتنی سی بات میں بھی ان کے خلاف نہیں چل سکتے حالانکہ ان کو شریعت سے پوچھ کر کام کرنا چاہئے تھا بتکدہ سے نکل کر مسجد میں آنا چاہئے تھا۔ مگر یہ تو پیرانی صاحبہ سے یہ پوچھ رہے ہیں۔

از مدرسہ بکعبہ روم یا بمیکدہ　　اے پیر رہ بگو کہ طریق صواب چیست

ترجمہ: (مدرسہ سے کعبہ کی طرف جاؤں یا میکدہ کی طرف۔ اے رہنما! بتلائے کہ کونسا طریقہ درست ہے)

شادی وغیرہ میں پردہ ہی ندارد ہو جاتا ہے

کبھی کسی مرد نے کسی مولوی سے جا کر نہ پوچھا کہ شادی میں فلاں فلاں کام کریں یا نہ۔ یہ استفتے[۱] عورتوں ہی سے ہوتے ہیں۔ پھر جیسی وہ مفتی ہیں ویسے ہی فتوی بھی ہوتے ہیں۔ مردوں کو تو یوں بے وقوف بناتی ہیں اور خود تقریبات میں ایسی منہمک ہوتی ہیں کہ پردہ بھی نہیں رہتا۔ بہشتی اور کمینوں کیلئے تو رواج ہی یہی ہے کہ بیبیاں نہیں اٹھتیں اور پردہ بھی نہیں کرتیں۔

بہشتی کا گھر میں منہ پر کپڑا ڈال کر آنا

وہ آنیوالا پردہ کر لیتا ہے اس طرح کہ اپنے منہ پر ایک کپڑا ڈال لیتا ہے یہ ترکیب اس معنی کر تو بڑی عقل کی بات ہے کہ پچاس شخصوں کو اٹھنا اور پردہ کرنا مشکل بجائے اس کے ایک ہی کو کرنا پڑتا ہے مگر کوئی عقلمندان سے پوچھے کہ کیا وہ کپڑا ایسا ہوتا ہے جس میں کچھ نظر نہ آوے اور پردہ کیلئے کافی ہو جاوے۔ اگر وہ کپڑا ایسا ہے تو وہ منہ پر ڈال کر چلتا کیسے ہے؟ راستہ کیسے دیکھتا ہے؟ اور پانی ڈالنے کو گھڑونچی تک کیسے پہنچ جاتا ہے؟ جبکہ بیچ میں پلنگ، پیڑھی اور تمام سامان پھیلا پڑا ہوتا ہے۔ یہ تو بہت ہی موٹی بات ہے جب وہ پلنگ، پیڑھی اور راستہ کو دیکھتا ہے تو بیبیوں کو کیسے نہیں دیکھتا؟ پھر جب اس کا دیکھنا گوارا ہے تو اس تکلیف کی ضرورت ہی کیا ہے کہ کپڑا منہ پر ڈالے بس زمانہ تقریب تک اس سے پردہ بالکل ہی کیوں نہ اٹھا دیا جائے یہ تو کمینوں[۲] کے ساتھ برتاؤ ہے اور ایرا غیرا مہمان وغیرہ سے بھی گو قصد[۳] پردہ وغیرہ کا ہوتا ہے مگر طوفان بے تمیزی میں پردہ وردہ کچھ نہیں رہتا کسی کا سامنا پڑا تو بڑا پردہ یہ ہے کہ کسی کی کمر کے پیچھے منہ چھپا لیا۔ غرض حد سے زیادہ بے تمیزی ہوتی ہے۔

تقریبات میں ظاہری مفاسد بھی ہیں اور باطنی بھی

۱: سوالات۔　۲: کام کاج کرنے والوں۔　۳: ارادہ۔

میں نے ان تقریبات میں ظاہری مفاسد بھی دیکھے اور باطنی بھی۔ ظاہری تو یہ کہ بے تمیزیاں اور باطنی تفاخر، ریا، سمعہ، تصنع وغیرہ وغیرہ اوران باطنی مفاسد میں سے تو شاید کوئی بھی مستثنیٰ رہ جاتا ہو لہٰذا میں نے اپنے وطن میں حتی الامکان کل تقریبات کی رسوم اڑا دیں اور چونکہ بات صحیح اور عقل و نقل سب کے موافق ہے اس واسطے بحمد اللہ تعالیٰ کامیابی ہوئی ایک شخص نے مجھ سے بطور اشکال کے کہا کہ ہم خوشی میں ایک کافی رقم خرچ کرنا چاہتے ہیں اور جبکہ خدا نے مال دیا ہے تو کیوں نہ خرچ کریں سو ان طریقوں کو آپ منع کرتے ہیں آخر کوئی طریقہ خرچ کا بھی تو بتائیے۔ میں نے کہا جناب یہ طریقے تو مجموعۂ معاصی[1] ہیں اور خلاف عقل بھی ہیں۔ اگر آپ کو خرچ کرنا ہی مقصود ہے تو اس کا طریقہ عقل کے موافق یہ ہے کہ ایک فہرست بنائیے غرباء کی اور جتنی رقم آپ کو خرچ کرنی ہو ان کو بانٹ دیجئے۔ دیکھئے کتنی شہرت بھی ہو جائے گی گو اس کی نیت نہ ہونا چاہئے اور نفع بھی کس قدر پہنچے گا اور موجودہ رسمیں اور طریقے تو ایسے لغو[2] ہیں کہ جن سے نہ کسی کا فائدہ ہو اور نہ شہرت۔ فائدہ ہونے کا ثبوت تو یہ دیکھ لیجئے کہ ریاستیں کی ریاستیں ایک ایک تقریب میں غارت ہو گئیں اور شہرت کی حالت یہ ہے کہ آج کسی نے ہزار روپے تقریب میں لگائے کل کو دوسرے نے ایک ذراسی بات اور ایجاد کر لی تو کہتے ہیں فلاں نے کیا کیا تھا۔ صاحبو! نفی شہرت کی یہ رائے بھی **علی سبیل التنزل**[3] (تنزل کے طور پر) تھی رسوم کا خلاف عقل بتلانے کیلئے ورنہ خود شہرت ہی کیا چیز ہے شہرت خود ایک مذموم چیز ہے اور یہ بھی من جملہ انہی مفاسد کے ہے جو تقریبات میں ہوتے ہیں پھر قطع نظر عدم جواز کے خود اپنی ذات میں تو سب کی سب ایسی ہیں کہ اگر کسی کے دل میں دین ہو تو خود ہی ان سے وحشت ہونے لگے خواہ جائز بھی ہوں لیکن اگر قلب کو تعلق دوسری طرف ہے تو شغل قلب[4] ہونے کیوجہ سے دیندار کے قلب کو اس طرف میلان ہرگز نہ ہوگا یہ ایک بڑا فتویٰ قلب کا ہے جس کو گہرا تعلق دین سے ہوگا وہ بخوبی اس وحشت کو محسوس کر سکتا ہے۔

دین سے تعلق گہرا ہونا چاہئے

اور اگر کسی کو ایسا تعلق نہ ہو تو اس کو یہ تعلق بڑھانا اور پیدا کرنا چاہئے یہ کوئی عذر نہیں کہ ہم کو گہرا تعلق نہیں کیا دین ایسی چیز ہے جس سے گہرا تعلق نہ ہو اور جس کے قلب کو دین سے تعلق ہوتا ہے وہ دنیا سے مرجھایا ہوتا ہے۔ پھر مرجھایا ہوا دل کہیں شہرت کو ڈھونڈے گا۔ دنیا کے کاموں میں تو اسکا

---

[1]۔ گناہوں کا مجموعہ۔ [2]۔ فضول۔ [3]۔ نیچے اتر کر یعنی مجبوری میں۔ [4]۔ دل مشغول ہونے۔

قول یہ ہوگا۔

کار دنیا کسے تمام نکرد ہر چہ گیرید مختصر گیرید!

اور وہ دنیا کے ہر کام میں اختصار ڈھونڈے گا جیسے آدمی پاخانہ میں جاتا ہے کہ کام تو پورا کرتا ہے اور بلا قضائے حاجت وہاں سے نہیں اٹھتا مگر ہر وقت اسی خیال میں رہتا ہے کہ کب فراغت ہو اور یہاں سے نکلوں اور کوئی ضرورت سے زیادہ وہاں بیٹھے تو یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ اس کو اس مکان سے یا مافی المکان۲ سے دلچسپی ہے اور بے فکر اور بے حس ہے۔

دنیا کے کاموں میں اختصار ہونا چاہئے

اسی طرح ہم لوگ اگر دنیا کے کاروبار زیادہ پھیلائیں تو کیسے نہیں کہا جائے گا کہ یہ بے فکری اور بے حسی ہے جو آیت میں نے پڑھی ہے اس میں تعلیم اسی بات کی ہے کہ بے فکر مت رہو جب بیفکری نہ ہوگی تو ہر کام میں اختصار ہوگا۔

البتہ ہر شخص کا اختصار جدا جدا ہے غریب کا اختصار اور ہے اور امیر کا اور مگر یہ یقیناً کہا جا سکتا ہے کہ ہر فرقہ نے جتنا سامان بڑھا رکھا ہے یہ حد سے تجاوز اور بے فکری کی دلیل ہے جو اس تعلیم کے خلاف ہے جو اس آیت میں ہے غرض ہم کو فکر آخرت کی ضرور ہونا چاہئے اور اس فکر کے دو اثر میں نے بیان کئے۔ ترکِ گناہ۳ اور تقلیلِ مباح۴ اور اصل مقصد بھی دونوں ہیں جس طرح بھی ہوں اور اسکا ذریعہ تذکرۂ موت ہے لیکن وہ صرف ذریعہ ہے سو اگر کسی کو بدوں تذکر موت کے مقصود حاصل ہو جائے تو اس کو تذکر موت کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ تو وسیلۂ مقصود ہے خود مقصود نہیں لیکن عام طور پر تجربہ سے ثابت ہے کہ ذکر موت سے زیادہ کوئی چیز اس فکر میں سہولت پیدا کرنے والی نہیں اسی واسطے حدیث میں فرمایا اکثروا ذکر ھازم اللذات الموت (کثرت سے لذات کو توڑنے والی یعنی موت کو یاد رکھو)۔

دیکھئے حضور ﷺ نے موت کو ھازم اللذات (یعنی لذات کو توڑنے والی) فرمایا ہے پس ہر لذت میں اس کو یاد رکھئے کہ ایک دن موت بھی آئے گی جو تمام لذات کا خاتمہ کر دے گی۔ جس کو موت پیش نظر ہوگی وہ اگر حلوہ اور گھی بھی کھائے گا تو اس کو منافع تو حاصل ہوں گے مگر زبان سے

۱:۔ دنیا کے کام کو کوئی پورا نہ کر سکا جو کچھ اختیار کرو مختصر اختیار کرو۔ ۲:۔ اس جگہ کی گندگی۔ ۳:۔ یعنی گناہ چھوڑیں اور جائز چیزیں بھی کم کریں۔

چٹخارے نہ لیگا اس کی تحصیل کیلئے یہ مراقبہ آیت میں تعلیم فرمایا گیا اور یہ ایسا مراقبہ ہے جس سے یہ دونوں مقصود یعنی ترکِ گناہ اور تقلیل مباح بہت ہی سہولت سے حاصل ہو سکتے ہیں بلکہ یہ ایسی چیز ہے کہ نماز اور عبادات کی اصلاح کیلئے کافی ہے اس کے منافع کی فہرست کی کچھ ضرورت نہیں خود ذکر موت ہی سب کچھ سکھا دے گا باقی فی نفس الامر (حقیقت میں) ذکر موت ذریعہ ہے اور اصل مقصود وہی ہے جو میں نے عرض کیا اور ذریعہ بالذات مقصود نہیں ہوتا اس میں تبدیلی بھی ممکن ہوتی ہے اس لئے مقصود اس ذریعہ ہی پر موقوف نہیں جس ذریعہ سے حاصل ہو سکے اجازت ہے لیکن چونکہ اس میں سہولت ہے اس واسطے یہ طریقہ تعلیم فرمایا گیا جیسے عراقی نے اسی مصلحت کیلئے ایک طریق کی درخواست کی ہے۔

صنمارہ قلندر سزاوار بمن نمائی کہ دراز و دور دیدم رہ ورسم پارسائی

(ترجمہ: مجھے تو طریق عشق میں چلایئے زہد خشک کا طریقہ دور دراز کا طریقہ ہے)

پارسائی طریق سلوک کو کہتے ہیں اور رہ قلندر جذب کو۔ طریقۂ جذب چونکہ اقرب طرق ہے اس واسطے اس کا سوال کرتے ہیں گو بالذات مقصود نہیں اسی طرح مقصود مذکور فی المقام کی تحصیل کیلئے ممکن ہے اور بھی طریقے ہوں لیکن مراقبۂ مذکور سے زیادہ سہولت ہو جاتی ہے یہ حق تعالیٰ کی رحمت ہے کہ مقصود کے ساتھ اس کے ذرائع بھی بیان فرما دیتے ہیں اور ذرائع میں سے بھی جو زیادہ اسہل اور موصل الی المقصود ہو اسکی تعلیم فرماتے ہیں۔ تقریر بالا سے آیت میں اس مراقبہ کے مذکور ہونے پر متنبہ کیا گیا ہے۔

خلاصۂ وعظ

تمام تقریر کا خلاصہ یہ ہوا کہ ہم کو مراقبۂ موت کی ضرورت ہے اور میں اس کا بہت آسان طریقہ بتلاتا ہوں جس سے آپ کے کسی کام میں بھی حرج نہ ہوگا۔

مراقبۂ موت

اس مراقبہ کیلئے آپ وہ وقت دیجئے جو آپ سے بے کار ہو اور وہ سونے کا وقت ہے جب پلنگ پر لیٹئے تو دس پندرہ منٹ اس مراقبہ کیلئے دید یجئے کہ سوچئے کہ یہ سونا مشابہ موت کے ہے مع تفصیل ان امور کے جو موت کے وقت پیش آتے ہیں کہ اس طرح بیمار ہو کر پلنگ پر پڑنا ہوگا دنیا کے سب کام جیسے اس وقت ختم ہو گئے اس وقت بھی ختم ہو جائیں گے دینا لینا اور حقوق باقی رہ گئے ہیں سو

کر ان سے پیچھا نہیں چھوٹتا ایسے ہی موت سے بھی ان سے رہائی نہ ہوگی نیز ان باتوں کو تفصیل وار یاد کیجئے جو موت کے بعد پیش آئیں گی جو خبر صحیح سے ثابت ہیں اور جو یقیناً آنے والی ہیں اس کو ذہن میں حاضر کیجئے کہ مرنے کے بعد تمام قوی معطل ہو جائیں گے۔ ہمارا چلتا پھرتا جسم مٹی کا ڈھیر ہو جائے گا جس کو چار آدمی کندھوں پر لے چلیں گے۔

پھر ہم کو اپنے عزیز قریب اپنے ہاتھوں سے ایک تاریک گھڑے میں ڈال آئیں گے اور مٹی دے کر تنہا چھوڑ آئیں گے پھر منکر نکیر سے سابقہ پڑے گا یہ کیسی سخت منزل ہے خدا جانے ان سے کیا معاملہ گزرے پھر خاک میں مل جانا ہوگا اور قیامت تک اسی طرح رہنا ہوگا پھر قیامت آئے گی اور ایک ایک بات پر جواب دہی کرنی ہوگی میدان حشر میں گرمی کی یہ حالت ہوگی میزان قائم ہوگی پل صراط پر چلنا ہوگا غرض ان تمام واقعات کو جو ''قیامت نامہ'' میں اور دیگر کتب میں مذکور ہیں ذہن حاضر کیجئے اور روزمرہ اس کا التزام کیجئے ان شاء اللہ بہت جلد تنبہ ہوگا اور فکر پیدا ہو جائے گی۔

جب فکر ہوگی تو دل کو خود بخود اس طرف چلے گا کہ ان احوال سے بچنے کی کچھ تدبیر ہونی چاہئے۔ان تدبیروں کے معلوم کرنے کیلئے علم دین کا شوق ہوگا اور ہمت ہوگی اور اعمال خود بخود ہونے لگیں گے اور اگر ہو سکے تو بزرگوں کے کلمات مذکورۂ موت پڑھا کیجئے مثلاً یہ اشعار ہیں

کل ہوس اس طرح سے ترغیب دیتی تھی مجھے
خوب ملک روس اور کیا سرزمین طوس ہے
گر میسر ہو تو کیا عشرت سے کیجئے زندگی
اس طرف آوازِ طبل اس طرف صدائے کوس ہے
صبح سے تا شام چلتا ہو مئے گلگلوں کا دور
شب ہوئی تو ماہرویوں سے کنار و بوس ہے
سنتے ہی عبرت یہ بولی ایک تماشہ میں تجھے
چل دکھاؤں تو جو قید آز کا محبوس ہے
لے گئی یک بارگی گورِ غریباں کی طرف
جس جگہ جانِ تمنا سو طرح مایوس ہے
مرقدیں دو تین دکھلا کر لگی کہنے مجھے
یہ سکندر ہے یہ دارا ہے یہ کیکاؤس ہے
پوچھ تو ان سے کہ جاہ وحشمت دنیا سے آج
کچھ بھی ان کے ساتھ غیر از حسرت وافسوس ہے

خلاصہ یہ کہ عمر کا کوئی حصہ ہو جوانی ہو یا بڑھاپا کوئی بھی جزو ہو اس کو اخیر حصہ سمجھے اور بوڑھوں کو تو خصوصیت کے ساتھ اپنی عمر کے زمانہ کو ختم ہی سمجھنا چاہئے کیونکہ بڑھاپے کے بعد پھر زندگی نہیں بلکہ قبر کا اندھیرا ہے اور اس آیت میں ایک تفسیر کی بنا پر بوڑھوں کو خصوصیت کے ساتھ خطاب کیا

گیا ہے جیسا کہ تفصیلاً اوپر گزر چکا اور چونکہ بڑھاپا، اجزاؤں میں سے شام کے زیادہ مشابہ ہے کہ وہ دن کا خاتمہ ہے اسی لئے اس وعظ کا نام ''شامِ خورشید'' مناسب معلوم ہوتا ہے پس ہمیشہ یہ نظر میں رکھے کہ زندگی کا دن ختم ہو رہا ہے اس کے بعد قیامت سے پہلے پھر طلوع نہ ہوگا اسی وقت میں جو کچھ ہوسکتا ہے کر لینا چاہئے کیونکہ قیامت کے دن کا طلوع ہمارے لئے بے کار ہے کیونکہ وہ دار العمل نہیں، دار الجزاء ہے اب ختم کرتا ہوں دعا کیجئے کہ حق تعالیٰ فہم سلیم اور علم نافع وہمت قویہ عطا فرماویں اور اس پر نتیجہ اصلاح مرتب فرمائیں۔ امین۔

التماس از جامع

اس وعظ کا نام عربی ''دواء العیوب'' ہے ختم ۴ بج کر ۲۲ منٹ پر ہوا اس کے بعد نماز عصر کیلئے تشریف لے گئے بعد نماز عصر راقم سے فرمایا کہ اس نام کو یعنی ''شامِ خورشید'' کو مناسبت یہ بھی ہے کہ مشکوۃ میں حدیث باب عذاب القبر میں آیا ہے کہ میت کو قبر میں وقت غروب شمس کا متخیل ہوتا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ غروب شمس وقت ختم نہار ہے جس طرح یہ وقت عمر ختم ہے تو آفتاب مشابہ عمر کے ہوا اور موت مشابۂ غروب اس واسطے نام ''شام خورشید'' رکھا گیا کیونکہ اس میں مہتم بالشان بیان عمر کے اخیر حصہ یعنی بڑھاپے کا ہے۔ راقم کہتا ہے کہ یہ وعظ میرٹھ میں اس سفر کے اخیر حصہ میں ہوا جو بالقصد باغپت ضلع میرٹھ کیلئے بفرمائش راؤ جمشید علی خان صاحب رئیس باغپت کے ہوا اس سفر میں ایک وعظ باغپت میں راؤ صاحب موصوف کی کوٹھی پر بھی تحت آیت ان فی ذلک لذکری لمن کان له قلب او القی السمع وھو شھید ہوا تھا اس کا فارسی نام ''جام جمشید'' اور عربی نام ''جلاء القلوب'' تجویز فرمایا تھا۔

اور اسی سفر میں دوسرا وعظ بمقام کاٹھہ ضلع میرٹھ تحت آیت ان الذین یتلون کتاب الله الی قوله یرجون تجارة لن تبور ہوا تھا۔ اس کا فارسی نام ''صبحِ امید'' اور عربی نام ''رجاء الغیوب'' تحریر فرمایا تھا اور وعظ ہذا کا نام ''دواء العیوب'' اور لقب ''شامِ خورشید'' ہے چونکہ یہ تینوں وعظ ایک ہی سفر میں ہوئے تھے اور تینوں کے عربی فارسی نام باہم موزوں ہیں اس واسطے حضرت والا نے فرمایا کہ مناسب ہے کہ تینوں وعظ طبع بھی یکجا ہوں شامِ خورشید کو ایک مناسبت یہ بھی ہے کہ اس سفر کا اول وعظ جمشید علی خان صاحب کے نام پر اور اخیر وعظ ان کے والد صاحب مرحوم خورشید علی خان صاحب کے نام پر ہو گیا گو قصداً یہ رعایت نہیں رکھی گئی۔

فقط حکیم محمد مصطفیٰ بجنوری

ہم سے عہد لیا گیا

یعنی

الدُّرُّ المنضود

ترجمہ

البحر المورود فی المواثیق والعہود

تالیف:

حضرت علامہ عبدالوہاب شعرانیؒ (متوفی ۹۷۳ھ)

ترجمہ:

شیخ الاسلام حضرت مولانا ظفر احمد عثمانیؒ (متوفی ۱۳۹۴ھ)

ادارہ اسلامیات کراچی، لاہور

قیمت 330

اشرف الاحکام

تتمہ امداد الفتاویٰ

حضرت تھانوی قدس سرہ کی بیسیوں کتب اور سینکڑوں مواعظ وملفوظات
سے اہم فقہی مسائل کا جامع اور مفید انتخاب

ازافادات

حکیم الامت حضرۃ مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ

جمع و ترتیب

جناب حضرت محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہم

ادارہ اسلامیات کراچی لاہور

قیمت 270

اِسلام کے بنیادی احکام

عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت اور
اخلاق سے متعلق اہم اسلامی تعلیمات کا مجموعہ

از افادات
حکیم الامت حضرت مولانا محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

جمع و ترتیب:
محمد اقبال صاحب مدظلہم
صدر صیانۃ المسلمین ہارون آباد

اِدارہ اسلامیات کراچی۔ لاہور

قیمت 180

اکابر علمائے برصغیر پاک و ہند کے علوم و معارف کلماتِ حکمت اور
ملفوظات و واقعات کا گراں قدر اور نایاب ذخیرہ

معارفِ الاکابر

① افادات حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی، قدس سرہٗ (معارفِ امدادیہ)
② افادات حضرت مولانا شیخ محمد محدث تھانوی قدس سرہٗ
③ افادات حضرت حافظ محمد ضامن شہید قدس سرہٗ
④ افادات حضرت مولانا فتح محمد تھانوی قدس سرہٗ
⑤ افادات حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس سرہٗ (معارفِ نانوتوی)
⑥ افادات حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی قدس سرہٗ (معارفِ یعقوبی)
⑦ افادات حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ (معارفِ گنگوہی)
⑧ افادات حضرت مولانا فضل رحمٰن گنج مرادآبادی قدس سرہٗ
⑨ افادات حضرت شیخ الہند مولانا محمود حسن قدس سرہٗ (معارفِ شیخ الہند)

بروایت حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

جمع و ترتیب

محمد اقبال قریشی صاحب مدظلہٗ

ادارہ اسلامیات ۱۹۰ انارکلی لاہور ۲ پاکستان
فون: ۷۳۲۴۷۸۵ ۷۲۴۳۹۹۱ ۷۳۵۳۲۵۵

وَقُل لِّعِبَادِي يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ

مآثرِ حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ

ترمیم و اضافہ شدہ آخری ایڈیشن

حکیم الامت مجدد ملت حضرت شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز

کی سوانح حیات اور خانقاہِ اشرفیہ کا تفصیلی خاکہ، آپ کی خصوصیات زندگانی تصوف و سلوک کے ضوابط، اجتہادی و تجدیدی انفرادیت، اندازِ تعلیم و تربیت، دیگر مفید مضامین و ملفوظات کا انتخاب اور ان کی تشریحات کو خاص ترتیب کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے

ارشادات و افادات

حضرت عارف باللہ ڈاکٹر محمد عبد الحی صاحب عارفی قدس اللہ سرہٗ

خلیفۂ مجاز حضرت حکیم الامت مولانا شاہ محمد اشرف علی تھانوی قدس سرہ العزیز

مرتب: جناب مسعود احسن علوی مرحوم

ادارۂ اسلامیات

انارکلی لاہور ۲

ادارۂ اسلامیات کراچی لاہور

پبلشرز — بک سیلرز — ایکسپورٹرز

موہن روڈ، چوک اُردو بازار، کراچی ــــــــــ فون: ۷۷۲۲۴۰۱

۱۹۰، انارکلی، لاہور، پاکستان ــــــــــ فون: ۷۲۴۳۹۹۱   ۷۳۵۳۲۵۵

دینا ناتھ مینشن، مال روڈ، لاہور ــــــــــ فون: ۷۳۲۴۴۱۲، فیکس: ۷۳۲۴۷۸۵ ۴۲ ۹۲

E mail:islamiat@lcci.org.pk ——— idara@brain.net.pk